زکوٰۃ کے جدید مسائل

اور اس کے شرعی احکام

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہ

اس کتاب میں جن اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:
زکوٰۃ کا مفہوم، نصاب زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، کمپنیز پر زکوٰۃ، اموال تجارت پر
زکوٰۃ، ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ، شیئرز پر زکوٰۃ، اُن قرضوں کی تفصیل جو
وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں، رفاہی اداروں کی املاک پر زکوٰۃ، مال حرام پر زکوٰۃ

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی
مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی
شیخ الاسلام حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

جلد اوّل

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ
گلشن اقبال کراچی فون 34965877

..........جملہ حقوق محفوظ ہیں..........

مجمع الفقہ الاسلامی (الھند) **Islamic Fiqh Academy (India)**

اجازت نامہ سلسلۂ مطبوعات اسلامی فقہ اکیڈمی

محترمی نعیم اشرف نور، فہیم اشرف نور سلمہم اللہ تعالیٰ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعائے عافیت دارین۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی دینی وعلمی خدمات کو قبول فرمائے اور دینی ودنیاوی ترقیات سے نوازیں، آمین۔
اسلامی فقہ اکیڈمی کی جملہ مطبوعات کی پاکستان میں اشاعت وطباعت وتقسیم کے لیے آپ کے ادارے ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ'' کو اجازت دی جاتی ہے، اور پاکستان میں یہ حق صرف آپ کے ادارے کو حاصل رہے گا۔ تمام پرسان احوال کو میرا سلام پہنچادیں۔

والسلام: مجاہد الاسلام قاسمی
صدر اسلامی فقہ اکیڈمی

باہتمام .... نعیم اشرف نور

ناشر .... ادارۃ القرآن گلشن اقبال

کراچی، فون: 021-34965877

اشاعت ۲۰۰۹ء

ڈسٹری بیوٹرز

☆مکتبۃ القرآن، بنوری ٹاؤن کراچی 021-34856701

مرکز القرآن اردو بازار کراچی 021-32624608

ملنے کے پتے

☆دارالاشاعت اردو بازار کراچی 021-32631861

☆بیت القرآن اردو بازار کراچی 021-32630744

☆ادارۃ المعارف دارالعلوم کورنگی 021-35032020

☆مکتبہ معارف القرآن دارالعلوم 021-35031565-6

☆ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور 042-37353255

☆بیت العلوم نابھہ روڈ پرانی انارکلی لاہور 042-37352483

☆مکتبہ رحمانیہ لاہور 042-37334228

☆مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ 2668657

☆ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، H-8/1 اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین مسائل زکوٰۃ

(۱)	ابتدائیہ	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی	۷ تا ۹
(۲)	سوال نامہ	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی	۱۰ تا ۱۸
(۳)	جوابات سوال نامہ بابت زکوٰۃ	مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی الجامعۃ العربیہ ہتورا، باندہ	۱۹ تا ۳۳
(۴)	سوال نامہ کا اجمالی جواب	مولانا برہان الدین سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۳۴ تا ۳۹
(۵)	سوال نامہ کا جواب	مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند	۴۰ تا ۴۸
(۶)	سوالات کے جوابات	مولانا نعمت اللہ قاسمی	۴۹ تا ۶۲
(۷)	زکوٰۃ کے شرعی احکام	مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی	۶۳ تا ۷۴
(۸)	زکوٰۃ کے چند اہم مسائل	محمد طیب الرحمٰن امیر شریعت شمال مشرقی ہند	۷۵ تا ۹۹
(۹)	زکوٰۃ کے مسائل	زبیر احمد قاسمی صدر المدرسین اشرف العلوم کنہواں	۱۰۰ تا ۱۱۰
(۱۰)	اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت	مفتی عزیز الرحمٰن مدنی دار الافتاء بجنور	۱۱۱ تا ۱۱۸
(۱۱)	سوالات کے جوابات	مفتی عبد الرحمٰن صاحب دہلی	۱۱۹ تا ۱۲۵
(۱۲)	سوالات کے جوابات	عبد الجلیل قاسمی مدرسہ اسلامیہ قرآنیہ سمرا، چمپارن	۱۲۶ تا ۱۴۰
(۱۳)	سوال نامہ کا جواب	حضرت مولانا عبد الرحمٰن قاسمی چھاپی، گجرات	۱۴۱ تا ۱۴۸
(۱۴)	سوال نامہ کا جواب	اشرف علی صاحب	۱۴۹ تا ۱۵۷
(۱۵)	اسلام کا نظام زکوٰۃ	مفتی نسیم احمد قاسمی رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی	۱۵۸ تا ۲۱۲
(۱۶)	مسائل زکوٰۃ	محمد جنید عالم ندوی قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ	۲۱۳ تا ۲۵۱

(۱۷) جوابات بابت سوالات	محمد رضوان القاسمی ناظم دار العلوم سبیل الاسلام حیدر آباد	۲۵۲تا۲۵۶
(۱۸) زکوۃ	اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپورہ، اعظم گڑھ	۲۵۷تا۲۷۹
(۱۹) اسلام میں زکوۃ کا مصرف	شبیر احمد قاسمی دار الافتاء مدرسہ شاہی مراد آباد	۲۸۰تا۳۰۴
(۲۰) زکوۃ	عبد اللہ قاسمی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس	۳۰۵تا۳۴۲
(۲۱) سوال نامہ کا جواب	محمد نعیم الدین جامعہ عربیہ اسلامیہ کریم گنج، آسام	۳۴۳تا۳۶۷
(۲۲) زکوۃ	مفتی محمد عبد الرحیم قاسمی جامعہ حسینیہ خیر العلوم نور محل روڈ بھوپال	۳۶۸تا۳۸۷
(۲۳) مسئلہ زکوۃ پر ایک نظر	مفتی حبیب اللہ قاسمی جامعہ عربیہ ریاض العلوم جونپور	۳/۰۸تا۴۰۳
(۲۴) سوال نامہ کا جواب	مولانا محمد سلیمان بلند شہری، ہریانہ	۴۰۴تا۴۱۱
(۲۵) زکوۃ کے متعلق سوالات کے جوابات	مولانا افضال الحق مہتمم دار العلوم گورکھپور	۴۱۲تا۴۱۵
(۲۶) زکوۃ	محمد محی الدین برودوی دار العلوم فلاح دارین ترکیسر	۴۱۶تا۴۳۲
(۲۷) مبیع قبل القبض کی زکوۃ	مولانا انور علی الاعظمی دار العلوم مئو، یو۔پی	۴۳۳تا۴۳۹
(۲۸) نصاب زکوۃ	مولانا ثناء الہدی قاسمی مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور، ویشالی	۴۴۰ ۴۴۴
(۲۹) نصاب زکوۃ	مولانا افضل حسین صاحب بستی۔ یو، پی	۴۴۵تا۴۴۸
(۳۰) زکوۃ	محمد افضال الحق مہتمم دار العلوم گورکھپور	۴۴۹تا۴۵۹
(۳۱) سوالات کے جوابات	حضرت مولانا علاء الدین ندوی فاضل دیوبند، کھگڑیا	۴۶۰تا۴۶۲
(۳۲) سوال نامہ کا جواب	عبد القیوم صاحب پالن پوری	۴۶۳تا۴۷۳

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں ...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں''۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی

''مجھے بے انتہا مسرت بھی ہے اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علماء کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے۔ اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظّم اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع نہیں کر سکے...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا''۔

چند تاثرات

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے۔ لیکن میں ان کو ایک فقیہ ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کرکے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کرکے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض ومقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ!

"اذا جاء نا امر لیس فیہ امر و لانہی فما ذا تامرنا فیہ"

یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں ایسے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ حضرت نبی کریم سرور عالم نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقہاء العابدین ولا تمضوا فیہ برای خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو محض انفرادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو، یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام تر نئے مسائل کا حل ہمارے لئے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین کو جمع کیا ہے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں۔ دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج ومذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لئے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنا لے، اس کے حکم بیان کر دے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے۔ بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ابتدائیہ

الحمدللہ اس وقت پانچویں فقہی سمینار منعقدہ اعظم گڑھ ۳۰ر اکتوبر تا ۲ر نومبر ۱۹۹۲ء کے مقالات ومباحث پر مشتمل مجموعہ کی دوسری جلد ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ پہلی جلد میں زکوۃ سے متعلق ایک اہم موضوع مصارف زکوۃ میں "فی سبیل اللہ" کے مفہوم کی تعیین سے متعلق جملہ مقالات شائع کئے جاچکے ہیں جو اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور بڑا علمی ذخیرہ ہے۔

اب دوسری جلد پیش خدمت ہے جس میں مسائل زکوۃ سے متعلق حاجت اصلیہ، دین کی زکوۃ، تجارت میں پیشگی دی ہوئی قیمت، اور کرایہ دکان ومکان میں دی گئی رقم پر زکوۃ، ہیرے جواہرات پر زکوۃ کا مسئلہ، پراویڈنٹ فنڈ کی زکوۃ، مدارس اسلامیہ میں طلبہ کو دیئے جانے والے وظائف، مدرسے کے اموال پر زکوۃ، مال حرام کی زکوۃ، سفراء ومحصلین ومہتمم مدرسہ کی حیثیت، جیسے اہم جدید مسائل پر تحقیقی مقالات شائع کئے جارہے ہیں۔

ہندوستان کے خاص پس منظر میں انشورنس کی گنجائش کے مسئلہ پر چوتھے فقہی سمینار منعقدہ حیدرآباد ۹ر تا ۱۲ر اگست ۱۹۹۱ء میں تفصیلی بحث ہوئی۔ اور پھر پندرہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کو تجویز مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ ان حضرات نے غور کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ فسادات کی صورت میں انشورنس کے ذریعہ رقم ملنے کی ضمانت ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت ضروری ہے، چنانچہ سترہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی سیمینار کے اجلاس عام میں تشکیل دی گئی، جنہیں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اور ماہرین سے پوری معلومات حاصل کرکے کوئی قطعی رائے قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس دوران انشورنش سے متعلق اصل توانین منگوائے گئے اور پھر یہ مسئلہ پانچویں فقہی سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں اس کمیٹی کی نشست میں پیش ہوا اور اس وضاحت کے بعد کہ انشورنس کی اسکیمیں بنیادی طور پر فسادات میں جلنے والے

حادثات کو کور کرتی ہیں۔ البتہ بعض اضافی مفادات اس صورت میں نہیں ملتے۔ کمیٹی نے باتفاق رائے ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں انشورنس کی اجازت دی، علماء میں سے حضرت مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی مفتی ریاض العلوم گرینی، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا زبیر احمد قاسمی اشرف العلوم کنہواں سیتامڑھی، مولانا انیس الرحمن قاسمی نائب قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا رفیق المنان قاسمی احیاء العلوم مبارکپور، مولانا سید مصطفیٰ رفاعی ندوی صدر الاصلاح بنگلور، مولانا معاذ الاسلام مرادآباد، مولانا عبداللہ اجراڑہ میرٹھ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد، مولانا سلطان احمد اصلاحی ادارہ تحقیق اسلامی علی گڑھ، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا صدر الحسن ندوی وغیرہ نے اس تجویز پر دستخط کئے۔

مولانا مفتی اشفاق احمد صاحب مہتمم جامعہ شرعیہ فیض العلوم سرائے میر نے اس تجویز کی تائید اس نوٹ کے ساتھ کی کہ:

"مبتلی بہ کی صوابدید پر اجازت کی گنجائش ہے"

گویا اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہ انشورنس کرایا جائے یا نہیں ہر شخص کو اپنی انفرادی حالات کے مطابق طے کرنے کا اختیار انھوں نے دیا، ان کی رائے اصل تجویز سے متصادم نہیں ہے۔ مولانا مفتی شبیر احمد مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد نے املاک کے بیمہ کی اجازت دیتے ہوئے زندگی کے بیمہ کی اجازت سے اختلاف کیا، انہی نوٹس کے ساتھ یہ تجویز شائع ہوئی۔

افسوس ہے کہ فقہ و فتاوی کے اس مسئلہ کو میدان سیاست کی گیند بنا دیا گیا، اور مفتی اشفاق احمد صاحب کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اشتہار کو ہزاروں کی تعداد میں شائع کرا کر ملک بھر میں تقسیم کیا گیا، حالاں کہ یہ کوئی نیا فیصلہ نہیں تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مورخہ ۱۵ر ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو مندرجہ ذیل فیصلہ کیا ہے:

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے "ربوا و قمار" (سود اور جوا) لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب

ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنش انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ: اوپر کی عبارت میں لفظ "ضرورت شدیدہ" سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل وعیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔ "ضرورت شدیدہ" موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جوابدہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔"

ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس پر دار العلوم دیوبند کے اکابر علماء نے انشورنش کی موجودہ حالت میں اجازت کا فتوی دیا تھا جسے ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے شائع کیا، اس فتوی کی نقل بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ان حالات میں یہ مسئلہ باب حاجت و ضرورت اور ہندوستان کے مخصوص حالات سے متعلق ہے۔ اور اس خالص فقہی مسئلہ کو کسی قیمت پر بھی سیاست کے میدان کی گیند نہیں بنایا جانا چاہئے۔

مجاہد الاسلام قاسمی
۲۹ جولائی ۱۹۹۴ء

سوالنامہ زکوٰۃ

(۱) محوراوّل

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے ؟
وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محل زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے۔

پہلی شرط ـــــ ملک تام

ملک تام سے کیا مراد ہے ؟ اس ذیل میں چند سوالات۔

سوال ۱: مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوسکی ہے، وہ قیمت جو ادا کی جاچکی اور وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں ؟

سوال ۲: کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجاتے یا مدت پوری ہوجانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے، اس نقد کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، کرایہ دار پر یا مالک مکان پر ؟

سوال ۳: جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں ؟

سوال ۴: وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟
اگر یہ اموال حرام حلال مال میں اس طرح مخلوط ہوگئے ہوں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو تو اس صورت میں ان مخلوط اموال میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال ۵ : دین کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک ہے لیکن قبضہ نہیں یا مدیون پر جس کے قبضہ و تصرف میں ہے لیکن اس کے ملک میں نہیں یا دین کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی کیا اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو، ایسی صورت میں اس مدیون پر زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے۔
وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی قسمیں اور وجوب زکوٰۃ کا حکم اور اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو کب اور وصولیابی کے بعد سابق کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی یا وصول ہونے کے بعد مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

سوال ۶ : سرکاری محکموں اور مختلف پرائیویٹ کمپنیز میں جو لوگ ملازم ہیں ان کی ماہانہ یافت میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار یا کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے بعض اوقات ہر دو قسم کی مذکورہ رقوم پر سرکار یا کمپنی انٹرسٹ کے نام سے بھی کچھ اضافہ جوڑ کر آخر میں وہ مجموعی رقم ملازمین کو ادا کرتی ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہلاتی ہے۔
پراویڈنٹ فنڈ کی مذکورہ بالا رقوم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے وقت واجب ہوگی تو سابق کی بھی واجب ہوگی یا آئندہ سال گذرنے پر؟

دوسری شرط نما ـــــ نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں۔
تیسری شرط ـــــ حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

(۱) کیا حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا؟
چوتھی شرط ـــــ دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

(۱) دین طویل الاجل، آج کے دور میں زراعتی قرض Agricultural loan تعمیر مکان کے لیے قرض Building Construction Loan اور اس طرح کے مختلف قرض سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کے لیے ۵ سال سے لے کر ۳۰، ۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسط وار قرض کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لیے پانچ کروڑ روپئے قرض لیے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپئے ادا کرنا ہے یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لیے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا جسے دس سال میں دس دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے، ان صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟
اسلام میں کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے، چند اور سوالات۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں، بعض ایسی صورتیں ہوسکتی ہیں جس میں کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت کروڑوں روپئے کو پہنچتا ہو جس میں نصاب وجوب زکوٰۃ موجود ہے، لیکن اس کے شرکاء اور حصہ داروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت کی تقسیم حصہ داروں پر کی جائے تو ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب

نہیں ہوتا یا کچھ لوگ صاحب نصاب نہیں ہوتے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا؟

ہیرے اور جواہرات

(۱) ہیرے اور جواہرات کی تجارت کی جاتی ہے، جو لوگ ہیرے اور جواہرات کی تجارت کرتے ہیں یہ ظاہر مال تجارت ہونے کی وجہ سے ان پر تو زکوٰۃ واجب ہوگی ہی لیکن دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپئے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہیرے جواہرات حوائج اصلیہ میں نہیں ہیں اور بڑی مالیت رکھتے ہیں، شرعًا ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

بعض اوقات خواتین محض تزئین و آرائش کے لیے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا ہے وجوب زکوٰۃ کے بارے میں ان کا کیا حکم ہوگا؟

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین کس نرخ سے کیا جائے، اپنی لاگت کے حساب سے کریں یا اس دن کی قوت خرید کا اعتبار کیا جائے، پھر یہ کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا پھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا؟

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی؟ اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب قوت خرید کے اعتبار سے ہوگا یا متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا؟

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

مختلف تجارتی کمپنیاں اپنے شیئرز فروخت کرتی ہیں یہ شرکت کی ایک صورت ہے، کمپنی

قائم کرتے وقت کچھ اکائیاں طے کرلی جاتی ہیں، ہر یونٹ (اکائی) ایک شیئر ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے، کمپنی جو کچھ منافع کمائے گی شیئرز ہولڈرس اس میں اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، شیئرز دراصل کسی تجارتی کمپنی کے ایک خاص حصہ کی ملکیت ہے، واضح رہے کہ بعد کو ان شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور کمپنی کے نفع و نقصان اور اس کے ساکھ کے پیش نظر ان شیئرز کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ان شیئرز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان شیئرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا یا بہ وقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا؟

بونڈس سے مراد یہ ہے کہ اکثر حکومتیں یا مختلف کمپنیز لوگوں سے قرضے مانگتی ہیں اور ان قرضوں کی واپسی کے لیے کچھ مدت (۵ سال، دس سال وغیرہ) مقرر کرتی ہیں اور کچھ شرح فیصد سود کا بھی اعلان کرتی ہیں اور بہ طور ثبوت قرض دہندہ کو سارٹیفکٹ ایشو کرتی ہیں وہی بونڈ ہے، سوال یہاں پر صرف اتنا ہے کہ جو کچھ سود کے نام پر دیا جاتا ہے اس کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں؟ قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس کی زکوٰۃ اسے ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ادا کرنی ہوگی تو سال بہ سال یا بونڈ کے کیش کرانے کے وقت، سبھی گذرے ہوئے برسوں کی یا صرف آئندہ کی؟

محور ثانی ـــــ نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کون سا نصاب اصل تسلیم کیا جائے؟ آج کے دور میں جب کہ سونے اور چاندی کی نرخ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لیے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) اور اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی یا سونے کے نصاب سے؟

محور ثالث ـــــ مصارف زکوٰۃ

(۱) کیا یہ صورت درست ہوگی کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ

ہے، ادارہ اس کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرتا ہے، اس کے طعام پر ماہانہ خرچ سو روپے آتا ہے، اس کی رہائش کے لیے جو مکان فراہم کیا گیا ہے (مکان کی تعمیر عام چندے سے کی گئی ہے) بازار نرخ کے حساب سے اس کا کرایہ ۲۵ روپے ماہانہ ہے، اساتذہ کے شہریہ (ماہانہ تنخواہ) وغیرہ پر جو خرچ آتا ہے اس کو اگر طلبہ کی خدمت یا متعلق انتظامی امور پر مامور ہے ان کا مجموعی شہریہ تقسیم کیے جانے پر فی طالب علم ۲۵ روپئے ماہوار پڑتا ہے، اس طرح ایک طالب علم پر کل اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو (۲۵۰) روپئے آتے ہیں، مدرسہ یہ نظام بناتا ہے کہ ہر طالب علم سے ڈھائی سو روپئے ماہانہ لیے جائیں، مستطیع طلبہ اپنے پاس سے یہ اخراجات ادا کریں اور غیر مستطیع طلبہ کی طرف سے یہ مقررہ فیس مدرسہ مدز کوٰۃ سے ادا کرے یا مدرسہ اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دیدے اور وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

ذیل میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے یا مستحقین زکوٰۃ کا؟

(۲) سوال یہ ہے کہ مدارس کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر کیے جاتے ہیں وہ ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ عملہ جو حساب کتاب کے لیے مقرر ہوتا ہے اسے بھی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے، یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ماہانہ تنخواہ پر مقرر کیے ہوئے سفراء و محصلین کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی ہے اور ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے، آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زائد آتا ہے، بعض مدارس میں متعین شرح فی صد کمیشن دیا جاتا ہے، اس صورت میں خرچ کے تناسب کے مقابلہ میں آمد کا تناسب بہتر رہتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہوگا اور اسے العاملین علیہا کے تحت داخل مانا جائے گا؟ اگر کمیشن کی صورت کو جائز قرار دیا جائے تو کیا شرح فی صد کے تعین کی کوئی خاص حد شرعاً ضروری ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے، کیا اس کی ماہانہ تنخواہ مدز کوٰۃ سے ادا کی جاسکتی ہے، جب کہ وہ لوگ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں؟

ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

سوال ۱: کیا زکوٰۃ شیئرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت پر ادا کی جائے یا اس سے ہوئی آمدنی پر؟ اگر زکوٰۃ آمدنی پر واجب الادا ہے تو یہ غیر صافی آمدنی پر واجب الادا ہے یا صافی آمدنی پر یعنی وہ خالص آمدنی جس میں سے اخراجات منہا کر دیے جائیں؟۔

(میں نے یہ پڑھا ہے کہ اگر شیئرز کو جنس تجارت (خرید و فروخت اور اس کی تجارت) کی طرح استعمال کیا جائے تو زکوٰۃ ان شیئرز کی بازاری قیمت اور ان کی آمدنی پر واجب الادا ہوتی ہے میں اس نکتہ کی وضاحت چاہتا ہوں، مزید یہ کہ ایسی صورت میں کہ شیئرز کو مسلسل خریدا اور بیچا جاتا رہے، نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی۔ اس لیے زکوٰۃ کس اساس پر ادا کی جائے؟)۔

شیئرز کو اگر زیادہ مدت تک پاس رکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ صرف آمدنی پر واجب الادا، ہے، اگر کسی وجہ سے مالک ان شیئرز کو بیچنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ کیا اس کو ان کی بازاری قیمت پر ادا کرنا ہوگا یا ان کے نفع پر یا ان سے حاصل ہوئی آمدنی پر؟۔

سوال ۲: ایک کاروباری ادارہ میں کیا زکوٰۃ کاروبار سے ہوئے نفع پر واجب الادا ہے یا کسی مقررہ خاص طور پر موجودہ اسٹاک پر؟

میں نے افزائش جانوروں کے کیس میں پڑھا ہے کہ اگر جانور کی خرید و فروخت ہوتی ہو تو زکوٰۃ مقررہ خاص تاریخ پر فارم میں موجود جانوروں کی بازاری قیمت (Market rate) پر واجب الادا، ہوگی۔ البتہ ایسی صورت میں کہ یہ جانوروں واشیاء کے فروخت کا ذریعہ ہوں جیسے دودھ، انڈا، تب زکوٰۃ دودھ/ انڈوں پر عائد ہوگی اور جانوروں پر نہیں۔

سوال ۳: سرمایہ اندوزی، تمسکات کی صورت میں زکوٰۃ خالص یا صافی آمدنی یعنی اخراجات کی

بعد پہنچنے والی آمدنی پر واجب الادا ہے۔ چوں کہ شخصی اخراجات، ہر فرد کے جدا اور ہر سماجی طبقہ کے الگ ہوتے ہیں اس لیے شخصی اخراجات کی تحدید کے لیے کیا کوئی معیار مقرر کیا جا سکتا ہے؟۔

انٹرسٹ اور یوزری اکثر ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

رنڈم ہاؤس ڈکشنری میں انٹرسٹ کی تعریف یہ کی گئی ہے ...... کسی جائداد کی ملکیت یا تجارت یا کاروبار کی ملکیت میں قانونی حصہ، حق یا سند ملکیت .... رقم جو ادا کی جائے یا عائد کی جائے۔ پیسے کے استعمال پر یا کسی پراجکٹ یا کاروبار شروع کرنے یا جاری رکھنے کے لیے لیے گئے قرض پر......

یوزری کی ڈکشنری میں اس طرح تعریف کی گئی ہے .... ایک حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شرح انٹرسٹ پر پیسے قرض دینا یا قرض دینے کی عادت۔

اسلام یوزری پر پابندی لگاتا ہے کیوں کہ مجبور افراد کے استحصال کا کھلا ہوا عمل ہے، آج کے معاشی نظام میں "انٹرسٹ" تمام کاروباری دین کے اندر موجود ہے، ایک شخص صرف اپنی بقا کی ضرورت کے لیے قرض نہیں لیتا بلکہ اس رقم کو بڑھانے کے لیے، دولت پیدا کرنے کے لیے اور قرض دار کے لیے اور معاشرے کے لیے عام طور پر مواقع پیدا کرنے کے لیے قرض لیتا ہے۔ قرض دار، قرض دینے والے فرد یا ادارے کو ایک مقررہ منافع کی طمانیت دیتا ہے، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جہاں ہم کو گزر بسر کرنا ہے ایک شخص مقررہ شرح انٹرسٹ سے کچھ لیے یا دیے بغیر رہ سکتا ہے۔

ہندوستان اسلامی ریاست نہیں ہے، ہر موڑ پر انٹرسٹ دینا پڑتا ہے یا لینا پڑتا ہے، چند مثالیں درج ہیں:

(۱) زمین داری کے خاتمہ کے بعد، ان املاک کے مالکوں کو معاوضہ میں ۲ فی صد انٹرسٹ کے زمین داری بانڈز دیے گئے۔

(۲) اگر کوئی شخص اپنے اثاثہ کو فروخت کرتا ہے تو اس کو کیپٹل دینے والا کیپٹل گینس Capitally ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے to pay، اس ٹیکس سے بچنے کے لیے وہ شخص مجبور ہے کہ اس رقم کو بعض مقررہ سیکورٹیز، تمسکات میں جیسے کیپٹل گینس یونٹ میں لگائے جن پر کم شرح سے مگر مقررہ

شرح سے انٹرسٹ دیا جاتا ہے۔

(۳) شخصی آمدنی پر ٹیکس کی شرح ساری دنیا کے مقابلہ میں ہندوستان میں سب سے زیادہ اونچی ہے۔ کئی صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ۵۰ فی صد سے زیادہ آمدنی ٹیکس والوں نے ہضم کرلی۔ اس ظالمانہ محصول کی زد سے بچنے کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے بعض اسٹاکس /بانڈز میں رقم لگائی جائے جن پر کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ملتا ہے۔

(۴) پراویڈنٹ فنڈ ہماری آمدنی سے کی جانے والی لازمی منہائیوں پر مشتمل ہوتا ہے جس پر کمپنی کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ادا کرتی ہے۔ تنخواہ یاب لوگوں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ ہی بڑھاپے میں بچت کا واحد راستہ ہوتا ہے۔

اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو اس کے تغیر پذیر آمدنی پیدا کرنے والے سرمایہ کاری کے مواقع ہیں۔ جائداد یا شیرز میں رقم لگانا سرمایہ کاری کے دو اہم ذرائع ہیں جن میں تغیر پذیر نفع حاصل ہوتا ہے۔

مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج شیرز مارکیٹ جوئے کا اڈا بن گئی ہے جہاں مارکیٹ پر کنٹرول کرنے والوں کی من مانی سے یا سیاسی تبدیلیوں سے افواہوں سے قیمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں، شیرز کی قیمتوں کا کوئی تعلق متعلقہ کمپنی کی مالی حالت سے نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک شخص جائداد خریدنے میں ایک مقررہ حد سے زیادہ کی جائداد نہیں لے سکتا ورنہ اس حد سے زیادہ کی جائداد سیلنگ (Ceiling) کے تحت حکومت لے لیتی ہے۔ ان حالات میں کیا حکومت کی سیکورٹیز/ بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسڈ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار دی جاسکتی ہے؟۔

جوابات سوالنامہ بابت زکوٰۃ

از ــــــــ مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی، الجامعۃ العربیۃ، ھتھورا باندہ۔

ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کسی مال پر ملکیت اس طور پر ثابت ہو کہ وہ اس مال مملوک میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہو، یعنی شریعت کی حدود میں جب چاہے جو چاہے تصرف کر سکتا ہو، ہمارے فقہاء کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقبۃً بھی اس کا مملوک ہو اور یداً بھی[1]، یعنی اس شئ کی ملکیت اور اس میں تصرف دونوں چیزیں جس آدمی کو حاصل ہوں اس کی ملک تام مانی جائے گی، اسی لیے ان اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے کہ جس میں ملکیت تو پائی جائے مگر تصرف سے آدمی عاجز ہو، مثلاً جو مال کھو گیا ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ چلتا ہو، اسی طرح جو سمندر میں گر گیا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت اور غیر موصول مال تجارت کی زکوٰۃ

۱ ــــــ خریدار نے اپنا جو مال کسی چیز کے خریدنے کے لیے فروخت کنندہ کے سپرد کر دیا وہ خریدار کی ملکیت سے نکل کر فروخت کنندہ کی ملک میں پہونچ گیا، لہٰذا اس کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی۔

۲ ــــــ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو جانے اور مشتری (خریدار) کی طرف سے قیمت کے ادا کر دینے کے بعد اگرچہ مال تجارت پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے مگر جب تک قبضہ نہ ہو یہ ملک تام یا مطلق

---

[1] بدائع ۲/۹، شامی ۲/۴

نہیں ہوتی، اس لیے کہ قبضہ کے بغیر خریدار اس میں کسی تصرف سے عاجز ہوتا ہے، لہٰذا اس کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہوگی[1]

البتہ چوں کہ مدار اس کا اس پر ہے کہ آدمی ملک کے بعد بھی تصرف سے عاجز ہو، اس لیے اگر بدون قبضہ بھی آدمی تصرف کر سکتا ہو، یعنی بن اموال یا بن بلاد میں کسی شخص کو محض خریدنے کے بعد پورے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہو جاتا ہو، ان میں چوں کہ اس شرط کا تحقق ہوگا، لہٰذا خریدار کو اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگرچہ مال ابھی اس کے شہر یا اس کے گودام میں نہ پہونچا ہو۔

کرایہ دار کی طرف سے پیشگی رقم یا ڈپازٹ کی زکوٰۃ

۱۔ کرایہ دار جو رقم بطور کرایہ پہلے سے ادا کر دیتا ہے وہ اس کی ملک سے نکل کر کرایہ کے سامان کے مالک کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے اور اس پیشگی کرایہ کی رقم پر اس کی ملک تام ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ موجر یعنی کرایہ پر سامان دینے والے پر ہوگی۔

۲۔ جو پیسہ کرایہ دار بطور ڈپازٹ یعنی زر ضمانت ادا کرتا ہے وہ کرایہ دار کی ہی ملک ہوتا ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہی ہوگی، فقہ حنفی کی کتابوں میں بیع وفاء کی جو صورت معروف ہے اس میں علامہ شامی نے مشتری یعنی پیسہ دینے والے پر وجوب کو ترجیح دی ہے[2]۔ اور بیع وفاء میں خریدار کی طرف سے دی گئی رقم کی حیثیت ڈپازٹ جیسی ہوتی ہے۔

البتہ اس زکوٰۃ کی ادائے گی معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے کرایہ دار پر لازم نہیں ہوگی اس لیے کہ اس سے پہلے پہلے اس کی حیثیت قرض کے مال کی ہے، جس میں زکوٰۃ اگرچہ گزشتہ سالوں کی ادا کرنی پڑتی ہے مگر قبضہ میں آنے کے بعد اس سے پہلے نہیں۔

مدارس و اداروں کی املاک میں زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرطوں سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب شخصی املاک میں ہوتا ہے خواہ یہ ملک

---

[1] شامی ۲/۴۔ [2] شامی ۲/۶۔

انفراداً ہو یا اجتماعاً، قومی و ملی املاک محل زکوٰۃ نہیں ہیں، اس لیے بیت المال میں جمع شدہ اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مال وقف میں زکوٰۃ نہیں ہے[۱]۔

جمع شدہ مال حرام پر زکوٰۃ

مال حرام پر اس شخص کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی جس کے قبضے میں وہ جمع ہو رہا ہے یا جو کسی طرح سے اس کو حاصل کر رہا ہے۔ جہاں تک سوال ہے خلط کا تو آج کل نوٹ ہی رشوت و سود میں آتے ہیں، ان کی جو حیثیت ہے اس میں خلط کو مؤثر نہ ہونا چاہیے، اور اگر مؤثر بھی ہو تو بھی زکوٰۃ تو پاکیزہ کمائی والے حصہ میں ہوگی نہ کہ حرام میں جیسا کہ فقہاء کی تصریحات و تفصیلات سے ظاہر ہے۔

دین کی زکوٰۃ کس پر ہوگی؟

۱۔۔۔۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہی ہوگی، اس لیے کہ دین کا مال اسی کی ملک ہوتا ہے۔ البتہ جب تک دائن کا قبضہ نہ ہو تب تک مطالبہ نہیں ہوگا اور قبضہ کے بعد مطالبہ میں تفصیل ہے اس لیے کہ دین کی مختلف صورتیں و اسباب ہوتے ہیں۔

۲۔۔۔۔ دین کی زکوٰۃ کسی بھی صورت میں مدیون سے لیے جانے کا سوال ہی نہیں ہے، اگرچہ مدیون اس سے کتنا ہی نفع اٹھائے۔ اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ایک بنیادی شرط ہے اور دائن کا مالک صرف دائن ہوتا ہے، مدیون اس پر قبضہ اور اس میں تصرف کے باوجود بھی اس کا بایں معنیٰ مالک نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس پر شرعی مطالبات عائد ہوں۔

۳۔۔۔۔ دین کی وصولیابی و ناامیدی کے مسائل کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ:

الف:۔۔۔۔ چوں کہ ملک کے ساتھ "تام و مطلق" کی قید لگی ہے، اس لیے اصولی طور پر اسی دین کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کی وصولیابی اور جس میں تصرف پر آدمی قادر ہو۔

ب:۔۔۔۔ نیز دین پر زکوٰۃ کی بابت یہ بھی ایک اصولی بات ہے کہ کسی بھی قسم کے دین کی وصولیابی سے پہلے

۱۔ بدائع ۲/ ۹، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۴۷/ ۷۴۲، ۸۰۶/ ۷۱۹۔

اس کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوتا. اگرچہ یہ وصولیابی جزئی ہو اور اسی جزئی وصولیابی پر اس وصول شدہ جزء کی زکوٰۃ لازم قرار دی جائے۔

ج:۔۔۔ اگر کسی دائن کے پاس اس کے دین کے علاوہ کوئی مال موجب زکوٰۃ موجود ہے جس پر سال گزر چکا ہے تو جو بھی دین آدمی کو وصول ہو موجود کے ساتھ ملا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، خواہ دین جس قسم کا ہو۔

د:۔۔۔ اور اگر قرض دائن کی رقم کے علاوہ کوئی مال نصاب و موجب زکوٰۃ دائن کے پاس موجود نہیں ہے تو۔

۱۔۔۔ جو قرض و دین اس کا تجارتی ہو یا نقد لیا دیا گیا ہو اگر وہ بقدر نصاب ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، پھر اس کے بعد اس کی وصولیابی ہو رہی ہے تو جو ملتا جائے اس کے حساب سے زکوٰۃ نکالتا جائے، اس کے لیے نہ وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی ضرورت ہے اور نہ بقدر نصاب وصولیابی کی، اور نہ ہی کسی مقدار خاص کی[۱]

۲۔۔۔ جو غیر تجارتی دین ہے مثلاً اپنی ضرورت کا کوئی سامان بیچ دیا تھا تو اگر بقدر نصاب اور سال گزرا ہوا ہے تو جب پورے نصاب کی وصولیابی ہوگی تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، البتہ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔

۳۔۔۔ اور بعض صورتوں میں وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی بھی شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہوا، عام طور سے جو لوگوں کا دوسروں پر قرض ہوتا ہے اور وہ تجارتی لین دین کا یا ضروریات کے لیے نقد کے لین دین کا ہوتا ہے، اس میں وصولیابی پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی ۔۔۔۔ البتہ دین کی تیسری قسم جس میں مہر کو بھی شمار کیا گیا ہے اس میں وصولیابی کے بعد سال کا گزرنا بھی ضروری ہے۔

پراوڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

اس فنڈ کی جو نوعیت ہے کہ وصولیابی سے پہلے آدمی کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہوتا، ہاں بطور قرض لے سکتا ہے، مگر پھر واپس کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کی حیثیت ایک قسم کے دین کی ہے۔

---

[۱] احسن الفتاویٰ ۴/۲۶۳۔

لہذا وصولیابی سے پہلے اس پر کسی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور وصول یابی کے بعد اگر آدمی کے پاس دوسرا نصاب موجود ہے تو اس کے ساتھ جوڑ کر بغیر حولان حول اور نصاب کی قید کے بغیر اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور اگر اس کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو جب بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تب زکوٰۃ ہوگی، اس لیے کہ فقہاء حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ فنڈ دین کی تیسری قسم میں شامل ہے پھر یہ کہ ملک کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور اجرت پر قبضہ کے بغیر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ـــــ تو یہ فنڈ آدمی کا حق تو ہے اس لیے کہ معاملہ میں طے کیا گیا ہے مگر جب تک قبضہ میں نہ آئے یعنی وصول نہ ہو اس کی ملک نہیں قرار پائے گا[۱]

شرط نما

وجوب زکوٰۃ کے لیے وہ مال جس میں زکوٰۃ واجب ہو رہی ہو اس کا نامی ہونا ایک بنیادی شرط ہے، الفقہ الاسلامی میں ہے:

"لان معنی الزکاۃ وھو النماء ـ لا یحصل الا بالمال النامی"[۲]

یہ شرط اس لیے ہے کہ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی "زیادتی" کا حصول ایسے ہی مال کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو کہ بڑھنے والا ہو۔

البتہ اس شرط کے اعتبار کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعۃً و عملاً بڑھ رہا ہو بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ بڑھنے کے حال میں ہو اس لیے کہ قدرت نے اس کو ایسا ہی بنایا ہے، جیسے کہ سونا و چاندی اور آج کل روپیہ وغیرہ جو کہ سونے و چاندی کی جیسی حیثیت رکھتا ہے یا یہ کہ آدمی کی غرض اس مال کو اپنے پاس رکھنے سے یہی ہے جیسے مال تجارت خواہ وہ سال بھر کے عرصہ میں فروخت ہوا ہو اور کچھ بڑھا ہو یا یہ کہ اب بھی دوکان میں موجود ہو یا اس میں آدمی کو گھاٹا ہوا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بڑھنے کا تعلق خود اس شئی سے ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، نہ کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے، یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ آج کل بعض حضرات نے

---

[۱] راجع لذالک احسن الفتاویٰ ۴/ ۲۶۰، وامداد الفتاویٰ ۲/ ۴۹/ ۵۰، جواھر الفقہ وغیرہ

[۲] الفقہ الاسلامی ۲/ ۷۴۰۔

کرایہ کا ذریعہ بنائی جانے والی املاک کو مال نامی میں شمار کیا ہے اور ان کی حیثیت دیگر اموال نامیہ کی قرار دی ہے حالانکہ عام طور سے فقہاء اس کی نفی کرتے رہے ہیں، یا کرتے ہیں، امام احمد نے اگر کرایہ کا ذریعہ بنائے جانے والے زیور پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے تو اس کے سونا اور چاندی ہونے کی وجہ سے اور ذاتی استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے، پھر یہ کہ فقہاء نے منصوص اشیاء کے علاوہ محض اموال تجارت میں زکوٰۃ کو ذکر کیا ہے اور اسباب نماء میں تجارت کے ساتھ توالد و تناسل کو ذکر کیا ہے، کرایہ کا تذکرہ تو بظاہر کہیں ملتا نہیں ہے[1]

تیسری شرط حاجت اصلیہ

یہ صحیح ہے کہ شرعاً اسراف و تنعّم پسندیدہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ کسی نص میں یہ بات نہیں آئی ہے اور نہ فقہاء کی تصریح میں کہ آدمی کے کھانے پینے کا اور پہننے و اوڑھنے کا ایک معیار متعین ہے وہی حاجت ہے اور ماسوا اس سے زائد ہے بلکہ تفصیلات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مال زکوٰۃ میں ایجاب زکوٰۃ کے لیے دوسری شرطوں کے ساتھ یہ مطلوب ہے کہ کھانے و پینے، پہننے و اوڑھنے، رہنے و سہنے کی ضروریات میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو، شروع سال میں بھی اور اخیر میں بھی، یا یہ کہ سال بھر کی ضروریات میں صرف کیے جانے والے مال سے الگ نصاب اس کے پاس موجود ہو۔

مثلاً ایک آدمی کے پاس یکم محرم کو بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے اور جب سال ختم ہوا تو سال بھر اسی مال کی آمدنی و نفع یا اصل کو خرچ کرنے کے بعد بقدر نصاب مال اس کے پاس موجود ہے یا یکم محرم کو اس کے پاس دو نصاب موجود ہیں، ایک اس نے رکھا ہے سال بھر کی ضروریات میں صرف کرنے کے لیے اور ایک زائد ہے تو دونوں صورتوں میں اس کے پاس ضرورت سے فاضل و فارغ

---

[1] فقہ الزکاۃ میں نماء کی شرط پر گفتگو کرتے ہوئے ج ۱، ص ۱۳۹ پر سطر ۱۹ میں نماء حقیقی کی تعریف میں شامی سے بحوالہ البحر نقل کیا ہے، العقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات ونحوھا۔ اس عبارت میں "ونحوھا" کا لفظ نہ شامی میں آیا ہے اور نہ بحر میں اور نہ بظاہر یہ لفظ احناف کی دوسری کتابوں میں آیا ہے، اللہ بہتر جانے کہ یہ کہاں سے آگیا؟

نصاب موجود ہے۔

نیز شریعت ایجاب زکوٰۃ کے لیے صرف یہ دیکھتی ہے کہ آدمی کے پاس شروع سال وا خیر میں بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے، اس نے اس درمیان کتنا کمایا اور کہاں کہاں؟ کیا؟ کیسے صرف کیا اس سے بحث نہیں ہوتی البتہ دوسری صورت جو ذکر کی گئی ہے اس میں ضروریات کے لیے محفوظ کیے جانے والے سرمایہ میں آدمی کا جو واقعی معیار ہوا سے اس کی رعایت کرنی ہوگی۔

اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے کھانے اور پینے کا معیار الگ الگ ہوتا ہے جب شریعت نے اس میں پابند نہیں بنایا ہے تو کسی زمانہ وماحول کی بھی پابندی نہیں ہوگی، کتب فقہ کی تصریحات سے ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

دین اور زکوٰۃ

اگر آدمی مالدار ہونے کے ساتھ مدیون ہو تو زکوٰۃ کا کیا حکم ہے تفصیل گزر چکی ہے۔ اور فقہاء کی تصریحات سے کوئی فرق اس اعتبار سے سمجھ میں نہیں آتا کہ قرض طویل المدت ہو تو سالانہ قسط کا شمار کر کے باقی پر زکوٰۃ ہو بلکہ دین کی پوری رقم سے زکوٰۃ ساقط ہوگی اگرچہ معاہدہ کے مطابق دسیوں سال بعد پورے قرض کی ادائے گی کی نوبت آئے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

ایجاب زکوٰۃ کے لیے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے وغیرہ جب تجارت کے لیے نہ ہوں تو بالاتفاق زکوٰۃ نہیں[۱] اس لیے کہ یہ سونے وچاندی کی طرح طبعاً اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، لہذا ان میں نما کے تحقق کے لیے ان کی تجارت ضروری ہے،

---

[۱] شامی ۲/ ۱۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۵۹۵۔

اس کے بغیر یہ نامی نہ ہوسکے گے اور مال کا نما ہونا وجوب زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

۱۔۔۔۔ اموال تجارت کی زکوٰۃ میں خرید و فروخت کے بجائے بازار کے بھاؤ و قیمت کا اعتبار ہوگا، اور جب زکوٰۃ ادا کرنے کی نوبت آئے اس دن جو قیمت ہو اس کا شمار کیا جائے گا[۱] اور تھوک و چھٹکر میں تاجر کے حال کا لحاظ کیا جائے گا، اس لیے کہ بازار میں دونوں کا شرح الگ الگ ہوتا ہے۔

۲۔۔۔۔ جب زمین کی تجارت کی جائے تو وہ بھی دیگر اموال تجارت کا حکم رکھے گی[۲] اور اس میں بھی اگر علاقے کا کوئی معیار ہو تو اسی معیار کے مطابق زمین کی قیمت جوڑی جائے گی یا پھر کم سے کم دام جو تاجر نے طے کرلیا ہے کہ اس سے کم نہیں کرنا ہے جیسے کہ عام اموال کی تجارت میں چھٹکر فروخت کرنے والوں کے حق میں اس کو معیار بنایا جاسکتا ہے[۳]۔

شیرز پر زکوٰۃ

شیرز پر بھی زکوٰۃ ہے اور بوقت ادائے گی زکوٰۃ جو قیمت ہو اس کا اعتبار ہوگا، ادا کردہ قیمت سے زائد ہونے والی رقم نفع ہے اور تجارتی سرمایہ و اموال میں اصل و نفع سب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

البتہ عام رجحان یہ ہے کہ شیرز کے صرف اس حصے پر زکوٰۃ ہوگی جو تجارتی کاروبار میں صرف کیا جارہا ہو اور اس کا جو حصہ کمپنی کی ضرورت کی عمارت و آلات میں صرف ہوا در لگایا گیا ہو اس حصے میں زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ اسی طرح انہیں کمپنیوں کے شیرز میں زکوٰۃ ہوگی جو کہ تجارت کرتی ہیں اور جو کمپنیاں شیرز سے املاک حاصل کرکے ان کے ذریعہ کاروبار کرتی ہیں کہ ان املاک کو کرایہ پر دیتی ہیں

---

[۱] اس پر اہل فتویٰ اور فقہاء کا اتفاق ہے، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۷۹۲ [۲] سواء کان مال التجارۃ عروضاً اومقاراً الخ، بدائع ۲/ ۲۰، [۳] متفرق خریدار جس قیمت سے لیتے ہیں وہ معتبر ہے اور اس میں اگر اختلاف ہو تو اکثر او راشہر کا اعتبار ہے اور وہ قریب قریب متعین ہوتی ہے یعنی وہ قیمت کہ اگر کوئی تخفیف کی درخواست نہ کرے تو اسی قیمت پر فروخت کیا جائے، امداد الفتاویٰ ۲/ ۴۸۔

ان کے شیرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

دوسرا رجحان بعض علماء عصر کا یہ ہے کہ شیرز پر زکوٰۃ بغیر کسی تفصیل کے ہے، اس لیے کہ اس وقت کے عرف میں "شیرز" خود ایک سامان تجارت کی حیثیت رکھتے ہیں[1]، اور اسی حیثیت سے ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، لوگ خرید و فروخت میں ان کی مجموعی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور تفصیلات کے درپے نہیں ہوتے ——— اور واقعہ یہی ہے کہ اس وقت عرف نے خود شیر کو ایک مال و سامان کی حیثیت عطا کر دی ہے، اس لیے اس رجحان کو قبول کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی میں سہولت بھی ہے اگرچہ تجارتی کمپنیاں کس قدر آلات و اسباب میں اور کس قدر سامانِ تجارت میں لگاتی ہیں، اس کے جاننے میں بھی اس لیے زحمت نہیں ہے کہ کمپنیاں پوری تفصیل شائع کرتی رہتی ہیں، اور شیرز کے مالکان کو پوری تفصیل سے باخبر رکھتی ہیں اس لیے آدمی آسانی کے ساتھ تفصیل سے واقف ہو کر شیرز کی زکوٰۃ دے سکتا ہے، لیکن زیادہ آسان یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیرز کی پوری رقم پر اجمالاً اور مجموعی طور پر زکوٰۃ نکالی جائے۔

باؤنڈس کی زکوٰۃ

باؤنڈ میں لگائی گئی رقم قرض ہوتی ہے اور فقہاء حنفیہ کی تفصیل کے مطابق یہ دین دینِ قوی ہوگا، اس لیے وصولیابی پر بشرط نصاب گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، لیکن اس میں لگائے گیے اصل سرمایہ کی اس پر جو مزید رقم آدمی کو ملتی ہے وہ سود ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی[2]

سونے و چاندی میں سے اصل نصاب[3]

زکوٰۃ سے متعلق نصوص اور عام فقہاء کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسے سونا و چاندی میں سے ہر ایک خلقۃً، طبعاً، اور استعمالاً ثمن ہے اسی طرح نصاب زکوٰۃ میں بھی دونوں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فقہ الزکوٰۃ ۱/۲۶/۳-۵۲۳ [2] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۷۴۔

میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، جیسے جانوروں کا نصاب مستقل ہے دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر متفرع نہیں ہے، دیت کی بابت بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل اونٹ تھا، لہذا اس کی قیمت کو معیار بناکر کمی وبیشی کی گئی[۱]۔ مگر سونے و چاندی کے نصاب کے متعلق احقر کا خیال ہے کہ کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے بلکہ صورت حال یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے متعلق نصوص زیادہ ہیں۔ اور وہ قوت میں بھی فائق ہیں، اسی لیے چاندی کا نصاب اتفاقی ہے اور سونے کے نصاب کی بابت کچھ اختلاف رہا ہے بلکہ مشہور تابعی حضرت عطاء کا بیان تو یہ ہے کہ اس عہد میں چاندی ہی زیادہ رائج تھی یعنی دراہم نہ کہ دینار[۲]۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک مستقل ہے لہذا جہاں جس کے نصاب میں فقراء کا فائدہ ہو یعنی آدمی صاحب نصاب قرار پائے وہیں اس نصاب کا اعتبار ہوگا، اگرچہ دونوں کے نصابوں کی قیمتوں میں تفاوت فاحش پایا جاتا ہو، جیساکہ آج کل عام طور سے ہے اور چوں کہ چاندی کے نصاب کی مالیت ہر عہد میں کم رہی ہے (ابتدائی عہود کو چھوڑ کر) اس لیے علماء کا عام رجحان چاندی کے نصاب اور اس کی قیمت کے اعتبار کا رہا ہے، اور ہے۔ اور اس باب میں "نفع للفقراء" کے اعتبار کا قاعدہ کتب فقہ میں اور فقہاء کے یہاں عام ہے[۳]۔

مصارف زکوٰۃ

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

س ا ـــــ سوال میں مذکور نظام کے مطابق طلبہ کو ماہانہ رقم بطور وظیفہ دینا اور پھر ان کے واجبی مصارف میں صرف کے لیے اس رقم کا مدرسہ میں ان سے جمع کرانا۔ بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ کی رقم کو صحیح طور پر صرف کرنے کی اس سے بہتر و بے داغ کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی، آج کل

---

[۱] ملاحظہ ہو: مشکاۃ، باب الدیات الفصل الثانی ۳۰۲/۳۰۲۲، متعدد روایات ہیں جو کہ صراحۃً یا دلالۃً اس مفہوم کو بتاتی ہیں [۲] فقہ الزکوٰۃ ۱/۲۴۶ تا ۲۵۱۔ [۳] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۶۱، شامی ۲/۳۱ تا ۳۲۔

دنیوی تعلیم میں رہائش وتعلیم کا خرچ عام ہے، دینی تعلیم میں بھی بہت سے لوگ ان امور پر خرچ کرتے ہیں یا اس کا مزاج رکھتے ہیں، اس لیے مستطیع طلباء سے رہائش وتعلیم کے مصارف لیئے جاسکتے ہیں نیز ان سے جو مصارف لیئے جاتے ہیں ان کی استطاعت کے مطابق ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ وہ صرف طعام کے مصارف تو اپنے پاس سے دیں اور باقی مصارف مدرسہ سے لے کر جمع کریں۔

اہل مدرسہ کس کے وکیل

س ۱۲ ــــ عملاً اور واقعتہً تو اہل مدارس کے لیے نہ زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے توکیل پائی جاتی ہے اور نہ مستحقین کی طرف سے، ہاں کبھی کبھی دینے والے ایسی باتیں مثلاً "ہم آپ کو دیر ہے ہیں مصرف میں صرف کے آپ ذمہ دار ہیں" کہہ دیا کرتے ہیں اس لیے یہ توکیل انتظاماً اور کام چلانے کے لیے ہے، بعض اکابر دیوبند کی تحریرات میں طلباء کی طرف سے توکیل کی بات ملتی ہے، مفتی شفیع صاحب نے بھی اخیر میں اس کی طرف رجوع کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی اہل مدرسہ کی طرف سے طلباء کے ہر قسم کے مصارف میں براہ راست زکوٰۃ کی رقم کا لگانا محل تامل ہے مثلاً رہائشی ضرورتوں میں جب کہ وہ رہ کر چلے جائیں گے اور یوں وہ مالک تو بنیں گے نہیں۔ بیت المال کے نظام میں بظاہر اس انداز کی کسی شکل میں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا، کم از کم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی تحریر کے مطابق دینے والوں کے بعد عدم واپسی اور جمع شدہ مال میں عدم وجوب زکوٰۃ کی حد تک تو یہ بات قبول کر ہی لینی چاہیے۔ اس طرح جب تک مال زکوٰۃ صرف نہ ہو تب تک عدم ادائے گی زکوٰۃ کی مالیت بھی یعنی یہ کہ ذمہ داران وکیل طلباء ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے قابض ہوئے، لہذا دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور نہ ان کا کوئی حق باقی رہا اور نہ ہی ذمہ داری ــــ باقی اس قبضہ کو مکمل طور پر طلباء کا قبضہ مان لینے اور پھر ہر قسم کے مصارف میں صرف کرنے میں ضرورت غور وتحقیق کی ہے، جن حضرات کی تحریرات سے سند پکڑی جاتی ہے، ان کی نیز دوسرے عام ارباب افتاء کی تصریحات تو یہی ہیں کہ اہل مدرسہ کو مال زکوٰۃ طلباء کے ہاتھ میں ہی ان کی ضروریات کی صورت میں دینا چاہیے، مثلاً کھانا وکپڑا وغیرہ اور ادارے کی دوسری ضروریات میں ان کے واسطے سے بطور تملیک رقم کو خرچ کرنا چاہیے۔

بہر حال یہ اہل مدارس کی ضروریات کے لیے غیر مفید ولغو حیلے کے بجائے ایک مفید ومناسب

توجیہ ہے، کچھ لوگ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، مگر ضرورت تنقیح و تحقیق کی ہے۔

عاملین زکوٰۃ اور ان کا معاوضہ

ح ۳:۔(الف)___ عاملین زکوٰۃ حکومت مُسلمہ کے کارندے ہوتے ہیں، اور اس واسطے سے وہ فقراء کے وکیل ہوتے ہیں، اہل مدارس کو بھی اگر فقراء کا وکیل مان لیا جائے تو سفراء و محصلین چندہ ان کے کارندے ہوں گے، اور ان کو ان کے عمل کے عوض زکوٰۃ کا دینا درست ہوگا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے متعدد فتاویٰ میں اور قوت کے ساتھ سفراء کو مال زکوٰۃ میں سے ان کے عمل کا معاوضہ دینے کو ذکر کیا ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک انہوں نے گنجائش دی ہے مزید صرف میں دیگر ارباب افتاء کی طرح انکار یا تملیک وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے[1]

(ب)___ یہ معاوضہ متعین مشاہرہ ہونا چاہیے، کمیشن درست نہیں ہے، حدیث قفیز طحان کی صحت و قوت کی وجہ سے اور ان عقلی وجوہ کی بنا پر جو فقہاء نے قفیز طحان کی حدیث کے سلسلہ میں کمیشن پر چندہ سے متعلق احقر کے مبسوط مقالے کا مطالعہ کیا جائے۔

(ج)___ مشاہرہ یا فیصد کی بنیاد پر معاوضہ (اگر اس کی کوئی جائز شکل بنتی ہو) اس کی شرعاً تحدید ہے وہ ہے کام کرانے والے کی ضرورت اور کفایت کی رعایت، اور اس بنیاد پر اس کو اس کے حال و معیار کے مطابق متوسط معاوضہ دیا جائے جس میں نہ تو انتہائی تنگی سے کام لیا جائے کہ معاملہ تقتیر کی حد میں داخل ہو جائے اور نہ اتنی سخاوت سے کہ معاوضہ تعذیر کی حدوں کو بھی تجاوز کرنے لگے۔ فقہاء و محققین نے عامل زکوٰۃ کے حق میں اس کی وضاحت کے ساتھ تصریح کی ہے[2] بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص متوسط معاوضہ لے کر کام کرنے پر تیار ہو اسی سے کام لیا جائے[3]

---

[1] کفایت المفتی ۴/ ۲۶۱/ ۲۶۹ [2] معارف القرآن ۴/ ۳۹۸ بحوالہ احکام القرآن للجصاص والقرطبی۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عمر وغیرہ سے اسی کو نقل کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔ تفسیر طبری ج ۱۴/ ۱۲-۱۱۱، الفقہ الاسلامی ج ۲/ ص ۸۷۱/ ۸۷۲۔ البتہ احناف کے یہاں یہ قید ہے کہ اگر عامل کی ضروریات نصف سے زائد کی متقاضی ہوں تو نصف سے زائد نہیں دیں گے۔ شامی ۲/ ۵۹/ ۶۰۔ [3] شامی ۲/ ۶۰۔

(د) ــــ جو لوگ سفراء کو عاملین زکوٰۃ کے تحت داخل مانتے ہیں ان کے قول پر زکوٰۃ کی آمدد خرچ کا حساب کرنے والوں کو صرف اس کام کا معاوضہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جا سکتا ہے، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کی روشنی میں، نیز اہل مدرسہ کو طلباء کا وکیل قرار دینے پر بھی درست ہے۔

(ہ) ــــ اور احتیاط اس میں ہے کہ جب چندہ کرنے والوں اور حساب لکھنے والوں کا کام زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدوں کی رقوم سے متعلق بھی ہوتا ہے اور یوں بھی عاملین زکوٰۃ میں واقعۃً جو بات پائی جاتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی ــــ زکوٰۃ کی رقم سے براہ راست ایسا کوئی کام کرنے والوں کو ان کے کام کا معاوضہ نہ دیا جائے۔

خلاصۂ زکوٰۃ

ملک تام سے کیا مراد ہے اپنے مملوکہ مال میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہونا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی، بلکہ فروخت کنندہ پر۔

غیر موصول مال تجارت

کی زکوٰۃ ملک تام نہ ہونے کی بناء پر خریدار پر نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ وہ قبضہ کے بغیر تصرف میں آزاد ہو۔

پیشگی کرایہ کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان و سامان پر ہوگی۔

ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی مگر رقم کے واپس ہونے کے بعد۔

مدارس وغیرہ کی املاک پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

مال حرام پر زکوٰۃ نہیں ہے ۔

دین کی زکوٰۃ

صرف دائن پر ہوگی اور دین کی واپسی کے بعد اگر اس کے علاوہ اس کے پاس نصاب ہے تو اس کے ساتھ ملا کر اور اگر دین ہی نصاب ہے تو عام قرض و تجارتی دین میں جو وصول ہو اس پر گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ہوگی ـــــــــ اور بعض صورتوں میں تفصیل ہے ۔

پراوڈنٹ فنڈ کا حکم زکوٰۃ میں قرض کا ہے اور اس قسم میں شامل ہے جس میں زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گذرنے پر ہوتی ہے ۔ اگر کوئی دوسرا مال موجب زکوٰۃ موجود نہ ہو ۔

شرط نما وجوب زکوٰۃ کے لیے نما یعنی مال کی بڑھوتری ایک بنیادی شرط ہے خواہ یہ بڑھوتری اس لیے مانی جائے کہ مالک نے مال کے ساتھ ایسی صورت و نیت اختیار کر رکھی ہے، مثلاً تجارت یا یہ کہ وہ طبعی طور پر ایسی ہو کہ تجارت و معاملات کی روح ہو، جیسے سونا و چاندی وغیرہ ۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ کا مطلب ہے آدمی کی سال بھر کی کھانے پینے و پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے کی واقعی ضروریات میں جو کچھ صرف ہو جائے یا اعتدال کے ساتھ جو کچھ صرف کرنے کے لیے طے کیا جائے اس میں اشخاص و ازمان کا اختلاف ہو سکتا ہے ۔

کمپنی پر زکوٰۃ

شرکاء پر ہوگی، جب کہ ہر ایک کی ملک بقدر نصاب ہو یا ان پر جن کی ملک بقدر نصاب ہو

ہیرے اور جواہرات اور ان جیسی چیزوں پر جب استعمال ہوں تو نما کی شرط کے

فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ جو بھی مال تجارت ہو خواہ زمین و مکان بشرط نصاب اس پر زکوٰۃ ۔ اور ادائے گی کے دن کی مالیت اور قیمت کے حساب سے ۔

شیرز پر زکوٰۃ شیرز کی مالیت پر زکوٰۃ ہے مگر اس حصہ پر جو تجارت میں معروف ہو اور آج کے عرف میں یہ خود مال تجارت ہیں اس لیے اجمالی و مجموعی رقم پر بھی زکوٰۃ ہو سکتی ہے ۔

باونڈس پر زکوٰۃ

اصل رقم پر ہو گی اور مال قرض پر زکوٰۃ کے ضابطہ کے تحت ، اس لیے کہ یہ رقم قرض ہوتی ہے

سونے و چاندی میں اصل نصاب سونے و چاندی میں سے ہر ایک نصاب کے باب میں مستقل ہے اور شارع نے دونوں کی استقلالاً تعیین کی ہے ایک کی دوسرے پر بنا کرتے ہوئے نہیں ۔

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

کی شکل میں زکوٰۃ ان کے جملہ مصارف کو جوڑ کر دی جا سکتی ہے ۔

اہل مدرسہ کی وکالت

یوں تو سرمایہ داروں کی طرف سے مانی جاتی ہے مگر اکابر کی ایک جماعت طلباء کا وکیل مانتی ہے۔

عاملین زکوٰۃ (سفراء و مدارس)

الف :۔ کو مفتی کفایت اللہ صاحب زکوٰۃ سے تنخواہ و معاوضہ دینا جائز کہتے ہیں اگر اہل مدارس کو فقراء و طلباء کا وکیل مان لیں تو دوسرے حضرات کے نزدیک درست ہے ۔ ب :۔ لیکن معاوضہ متعین شکل ہونا چاہیے ۔ ج :۔ معاوضہ کی تعیین میں کام کرنے والوں کی ضرورت کا اور محنت کا لحاظ کیا جائے (د) گنجائش دینے والوں کے قول پر زکوٰۃ کا حساب کرنے والوں کو بھی زکوٰۃ سے تنخواہ دی جا سکتی ہے ۔

سوالنامہ کا اجمالی جواب

از: مولانا برہان الدین سنبھلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱ــــ محور اول

جیسا کہ معروف ہے "اموال نامی" میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

ملک تام: جس پر آزاد بالغ مالک (غیر سفیہ اور غیر محجور) کو شرعاً تصرف کا پورا اختیار ہو اور اس میں وہ کسی دوسرے کی اجازت کا محتاج نہ ہو، اگر اس کے قبضہ میں مال بالفعل نہیں ہے مگر اس پر قبضہ ہو جانا مظنون ہو۔

ذیلی سوال ۱ کا جواب

جس مال (مبیع) کی قیمت ادا کر دی گئی اور وہ مال (مبیع) قبضہ میں نہیں آیا، اگر عقد تام ہونے کے بعد قیمت ادا کی گئی ہے تو اس مال (مبیع) کی چاہے ابھی قبضہ میں نہ آیا ہو، زکوٰۃ مشتری پر لازم ہوگی (اگر وہ مالِ تجارت ہے) ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ اب مشتری پر لازم نہ ہوگی، کیوں کہ وہ قیمت مشتری کی ملکیت سے نکل گئی، البتہ اس قیمت کی زکوٰۃ بائع پر، جو کہ اب اس قیمت کا مالک بن چکا ہے، لازم ہوگی۔ (اگر وہ صاحب نصاب ہے اور حولانِ حول ہو چکا ہے)۔

۲ــــ اگر کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان (یا دکان وغیرہ) کو دی گئی رقم بطور اجرت (کرایہ) دی گئی ہے تو اس رقم کی زکوٰۃ (اسباب و شرائطِ وجوب پائے جانے کی صورت میں) مالک مکان (یا دکان) پر لازم ہوگی، لیکن اگر یہ رقم (کرایہ دار نے) بطور ضمانت دی ہے تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہوگی (اسباب و شرائط وجوب کی موجودگی میں) کیوں کہ اس رقم کی حیثیت یا قرض کی ہے (اگر تصرف کا اختیار دیدیا

ہے) یا امانت کی، دونوں صورتوں میں اس کی زکوٰۃ رقم دینے والے پر لازم ہوگی۔

۳ــــــ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو کی مثال میں مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو پیش کرنا محل نظر ہے۔ علاوہ ازیں شریعت میں اس کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے (سوائے بیع بشرط الخیار کی شکل کے، وہ بھی مختلف فیہ ہے) کہ ایسا مال بھی ہوتا ہے جس کا کوئی مالک معین نہ ہو، لہٰذا یہ سوال ہی خود محل سوال ہے۔ (ہاں یہ ممکن ہے کہ مالک معلوم نہ ہو)۔ مدارس میں جمع کی جانے والی رقم پر مدارس کے ذمہ داروں کی ملکیت کا قائم ہوجانا (طلبۂ مستحق زکوٰۃ کی نیابت میں) اکابر علماء کا راجح قول ہے جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اختیار کیا ہے اور حضرت تھانویؒ کا بعد میں مختار ہونا بھی بتایا ہے، حضرت گنگوہی رہ و حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کا محقق قول ہونا تو معروف ہی ہے[1]۔ لہٰذا اس رقم کی ــــــ جو کہ مدارس کے ذمہ داروں کے قبضہ کے اندر طلبۂ مستحق زکوٰۃ کی ملکیت میں ہے ــــــ زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہ ہوگی۔

۴ــــــ مال حرام وحلال کے مخلوط ہوجانے کی شکل میں بھی ــــــ چوں کہ بقدر حرام کا تصدق واجب ہے اور اس کے بقدر گویا دین واجب فی الذمہ ہے ــــــ صرف حلال مال کی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کل حرام مال کے بقدر تصدق واجب ہوگا۔ (جیسا کہ شامی کی مصادرۃ السلطان وغیرہ والی بحث سے مستفاد ہوتا ہے)۔

۵ــــــ دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی (جیسا کہ ظاہر ہے) اگر مدیون ادائے گی میں وسعت کے باوجود ٹال مٹول کر رہا ہو تو گناہ گار ہوگا، مگر زکوٰۃ کی ادائے گی اس کے ذمہ نہ ہوگی۔ ہاں! اگر اس نے دین سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کیا تو نفع کے بقدر مال کی زکوٰۃ (اسباب وشرائط کے ساتھ) مدیون پر واجب ہوگا۔ (جیسا کہ مال مستفاد کی)۔

دائن دین کی وصولیابی کی امید کی صورت میں ہر سال کی زکوٰۃ چاہے ہر سال ادا کرے یا بہ وصول ہونے پر تمام گذشتہ سالوں کی اکٹھی، دونوں شکلیں جائز ہیں، لیکن اگر مال وصول ہونے کی امید بالکل نہ ہو اور مال ضمار کے مثل ہو، تو اس کا حکم مال ضمار جیسا ہوگا۔

---

(۱) دیکھیے: جواہر الفقہ ۴/۳۸۱، ۳۸۲، طبع دیوبند۔

۔۔۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کے وصول ہو جانے کی صورت میں ہی اس پر ملکیت آئے گی اس سے قبل نہیں، لہٰذا اس سے متعلق تمام مالی ذمہ داریاں ۔۔۔ وجوب زکوٰۃ وغیرہ ۔۔۔ بعد میں ہی متعلق ہوں گی، اس سے پہلے نہیں، اس لیے زکوٰۃ بھی وصولیابی کے بعد ہی واجب ہوگی، گذشتہ مدت کی واجب نہ ہوگی۔

دوسری شرط نما یعنی اضافہ کی صلاحیت

اس کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی و حکمی۔ حقیقی کی مثال مالِ تجارت، سوائم وغیرہ۔
حکمی کی مثال نقدین یا اس کے قائم مقام کرنسی (خواہ وہ کاغذ کی ہو یا دھات کی)۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت کا مفہوم تو معروف ہے اور تمام متعلق کتابوں میں موجود ہے۔ کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر ماحول کے اعتبار سے ان چیزوں کا تعین ہوگا، جن پر "حاجیات" کا اطلاق ہو سکتا ہے، اور کتب فقہ کی تفصیلات پیش نظر رکھنے سے حیثیت کے فرق سے بھی حاجیات کے مصداق میں فرق کا مفہوم ہوتا ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ اس کا جواب عام کتب فقہ میں ملتا ہی ہے، سوالنامہ میں کوئی نئی بات نہیں دریافت کی گئی ہے اس لیے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں معلوم ہوا ۔۔۔ دین کی معروف تین قسموں ۔۔۔ قوی، متوسط، ضعیف ۔۔۔ میں سے پہلی دو قسمیں متفقہ طور پر مانع زکوٰۃ ہیں۔

ہر دین قوی مانع زکوٰۃ ہے خواہ وہ طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد، خواہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر میں۔ اس لیے پورا قرض منہا کرنے کے بعد ۔۔۔ خواہ وہ لاکھوں میں ہو اور اس کی ادائے گی طویل مدت میں کیا جانا طے ہو ۔۔۔ اگر بقدر نصاب کا مالک رہتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

کمپنیز پر زکوٰۃ: کمپنی میں شریک ہر فرد کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، جس شریک کا حصہ (یا اس کی

ملکیت میں کل مال) نصاب زکوٰۃ کے بقدر رہوگا،اس پر زکوٰۃ ـ اپنے حصہ کے بقدر ـ واجب ہوگی،اور جس کا حصہ (اور ملکیت میں کل مال) نصاب سے کم ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ہیرے جواہرات

اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ ان کی مالیت کتنی ہی ہو، اور خواہ وہ انکم ٹکس (یا زکوٰۃ) سے بچنے کی غرض سے ہی خریدے گئے ہوں، البتہ ہیرے جواہرات حوائج اصلیہ میں سے نہ ہونے کی بنا پر ــــ ان کے مالکین پر ــــ صدقۂ فطر اور قربانی کا وجوب ہوگا (بشرطیکہ جواہرت کی قیمت بقدر نصاب ہو) اور ان کے مالکین صدقات واجبہ کا مصرف نہیں ہوں گے۔یہی حکم ان خواتین کے بارے میں بھی ہوگا جن کے پاس ہیرے جواہرات ہیں خواہ وہ تزیین کے لیے ہوں یا کسی اور غرض سے (بس تجارتی مقصد سے نہ ہوں)۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا ذکر تمام کتب فقہیہ حنفیہ میں ملتا ہے، مثلاً شامی میں ہے:

"لا زكاة فى اللآلى والجواهر إلا أن تكون للتجارة" (۱)

اموالِ تجارت پر زکوٰۃ

صاحبِ نصاب تاجر حولانِ حول کے وقت جتنے مال کا مالک ہے اور اس وقت اس کی ملکیت میں موجود مالِ تجارت کی جو قیمت ہے (یعنی اس مال کی جو قیمت اسے ملے گی) اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تاجر اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کے بقدر، اگر خوردہ فروش ہے تو خوردہ قیمت کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وہ تجارتی مال خواہ منقول ہو یا غیر منقول (اراضی وغیرہ) سب کا حکم یکساں ہوگا۔یعنی وہی جو اوپر مذکور ہوا، کہ حولانِ حول کے وقت تاجر کو جو قیمت ملے گی اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

---

(۱) رد المحتار ۲/۱۴!

شیرز اور انڈس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ وہ شیرز دراصل علامت (یا سند) ہوتے ہیں اس مال کی، جو کمپنی کی ملکیت ہیں — مالِ تجارت — ہے۔

شیرز کے مالک کے پاس حولانِ حول کے وقت موجود، جو قیمت شیرز کی ہوگی اسی کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس شخص نے جو قرضہ کسی کو — خواہ حکومت کو — دیا ہے اصل قرضہ پر — نہ کہ سود پر — زکوٰۃ واجب ہوگی، قرض دینے والے پر ان تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی جو قرض کی ادائے گی میں لگیں گے، اب چاہے ہر سال زکوٰۃ ادا کرتا رہے یا تمام سالوں کی — وصولی قرضہ کے بعد — اکٹھا کردے۔

محور ثانی:

چاندی سونے میں سے جو نصاب بھی انفع للفقراء ہو، وہی اصل تسلیم کیا جائے گا۔

محور ثالث:

مصارفِ زکوٰۃ

۱ — طالب علم پر آنے والے کل اخراجات (بشمول رہائش وتعلیمی فیس) کے بقدر اگر مدِ زکوٰۃ سے مدرسہ کے ذمہ دار، مستحقِ زکوٰۃ طالب علم کو رقم پہلے دے دیں اور پھر وہ ان سے وصول کرلیں تو یہ شکل جائز ہے۔ چیک سے ادائے گی کی شکل میں ادائے گی اس وقت سمجھی جائے گی جب کہ چیک کی رقم طالب علم کو وصول ہوجائے، اگر اس کا بینک میں کھاتہ ہے تو اس کے کھاتہ میں اندراج ہوجائے اس کے بغیر نہ ہوگی۔

(بحوالہ) اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت گنگوہی رح، حضرت سہارن پوری رح، حضرت تھانوی رح اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ کا آخری نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران (مہتمم وغیرہ) طلبہ کے وکیل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا قبضہ طلبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہے۔

۲ — زکوٰۃ وصول کرنے پر — مدارس کے سفراء وغیرہ کو — کمیشن دینا شرعاً درست نہیں، انھیں العاملین علیہا کے تحت داخل کرنا بھی مشکل ہے، کیوں کہ "العاملین" کی تعریف یہ کی گئی ہے:

" ھو الذی یبعثہ الإمام لأخذ الصدقات " (احکام القرآن للجصاص ۳/۱۲۳)

جصاص رازی نے جبری وصولی کا حق بھی امام کے لیے اسی سے ثابت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدارس کے ذمہ دار نہ امام ہیں اور نہ انھیں جبری وصولی کا حق ہے۔ مدارس کے منشی وغیرہ جو زکوٰۃ کی آمد و صرف کے حساب کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دینا ــــ شرعاً ــــ درست نہیں۔

فی سبیل اللہ کا مصداق صرف وہ ہے جسے خیر القرون میں مصرف قرار دیا گیا یعنی اصطلاحی جہاد میں مشغول افراد، بقیہ اقوال ضعیف اور بعض ــــ مثلاً سوالنامہ میں مذکور دوسرا و تیسرا ــــ تو نہایت ضعیف ہیں۔ ایسے کمزور دلائل جیسے کہ ان اقوال کے قائلین نے دیے ہیں ان ــــ کی بنیاد پر تو ہر غلط کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے، اس طرح پوری شریعت ہی کو مسخ کیا جاسکتا ہے ــــ یوں بھی جمہور کے قول ہی میں سلامتی ہے اور بغیر شدید مجبوری کے اس سے عدول جائز نہیں سمجھا گیا۔ قرون اولیٰ میں اگر کسی آیت کی تشریح میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو تیسرے قول کا اختیار کرنا درست نہیں، کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا خرق اجماع ہے (جسے اصولیین نے " لاقائل بالفصل " جیسی تعبیرات میں بیان کیا ہے) اور پھر اس طریقہ سے تو ہر غلط بات کو صحیح قرار دینے بلکہ ہر خواہش ـ کے لیے سند دریافت کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔

الف ــــ فی سبیل اللہ کا مصداق اصلاً تو غازی ہے، زیادہ سے زیادہ منقطع الحاج کو امام محمد رحمہ کے قول کی رو سے بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس کی شمولیت پر احادیث صحیحہ دال ہیں (جن کا ذکر سوال نامہ میں بھی ہے)۔

ب ــــ احناف کے نقطۂ نظر سے ہر مصرف کے لیے (سوائے "العاملین علیہا" کے) فقر شرط ہے۔

ہ ــــ مصارف زکوٰۃ بھی ــــ رکعات صلوٰۃ کی طرح ــــ قیاس کا محل نہیں۔ ظاہر ہے کہ فکری و قلمی جہاد نئی تعبیریں ہیں، بنابریں جہاد قلمی و فکری فی سبیل اللہ کا مصداق نہیں بن سکتے اور ان میں مشغول لوگ (اگر وہ محتاج نہیں ہیں) مستحق زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہی میں منحصر ہیں اور یہ حصر اضافی نہیں حقیقی ہے۔ کسی بڑے سے عالم ــــ حتیٰ کہ صحابہ کے ــــ تفردات اور شاذ اقوال پر مدار رکھنا سلف کے طریقہ کے خلاف ہونے کے ساتھ نہایت خطرناک اقدام ہے، جس سے بہت سی بے راہ رویوں ــــ بلکہ گمراہیوں ــــ کے لیے راستہ کھل سکتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ کا یہ قول " من أخذ بنوادر الإسلام خرج عن الإسلام " قابل توجہ ہے۔

سوالنامہ کا جواب

از:۔۔۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، دارالعلوم دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق

زکوٰۃ مال نامی میں واجب ہوتی ہے، خواہ نامی بالذات ہو یا نامی بالغرض، اپنے قیود و شروط سے اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم ہے۔

پہلی شرط مملوک بہ ملک تام ہونا ہے، اور ملک تام سے وہ ملک مراد ہے جو مملوک پر یداً اور قبضۃً دونوں طرح سے حاصل ہو، اور ملک رقبۃً سے مراد خرید و فروخت کا مالک ہونا ہے۔ اور ملک یداً سے مراد اپنے قبضہ و تصرف میں ہونا ہے۔

جواب (۱) ان مذکورہ دونوں صورتوں میں ادا۔ ئے گی زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ ان صورتوں میں شئی مشتراۃ پر ابھی ملک نہ تو رقبۃً حاصل ہے اور نہ یداً حاصل ہے، بہت سے بہت وعدۂ تملیک ہے اور محض اس میں وجوب زکوٰۃ متحقق نہیں ہوتا۔

(۲) صرف کرایہ دار پر واجب ہوئی۔

(۳) ان اداروں و مدارس سے مراد اگر دینی تعلیم کے ادارے و مدارس ہیں تو ان میں دینی تعلیم کے لیے آئی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس مسئلہ کی تفصیل و مدلل بحث منتخبات نظام الفتاویٰ میں بہ زیر عنوان (مدارس میں آئی ہوئی رقوم کا شرعی حکم) آچکی ہے، وہاں

دیکھی جاسکتی ہے۔

(۴) جب کوئی حرام مال اپنی ملک میں آجائے تو چوں کہ یہ مال مملوکہ بہ ملک خبیث ہوگا اس لیے اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو حسب ضابطۂ شرع مالک تک پہونچادے یعنی رد الی رب المال کر دیا جائے۔ جیسا کہ مذہبی کتب کی ان عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

(الف) اذا علم المالك بعينه فلاشك فى حرمته و وجوب رده عليه (أى على رب المال)۔ (۱)

(ب) واما اذا كان عند رجل مال خبيث (حرام) فامّا اذا ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا يمكنه ان يرده إلى مالكه ويريد ان يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا ان يدفعه إلى الفقراء لانه لو انفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام (إلى قوله) ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه يدل مسائل اللقطة۔ (۲)

(ج) ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك وفى البزازية غصب دراهم انسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علمه برئ وكذا (برئ) لو سلمه إليه بجهة أخرى كهبة او ايداع (ولم يرده) او شراء وكذا لو أطعمه فاكله۔ (۳) وتحته قول رد المحتار الشامى۔ وفيه جاء بما غصبه فلم يقبله مالكه فحمله الغاصب إلى بيته برئ ولم يضمن۔ (۴)

پھر جو بچ جائے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو تملیکاً دے کر جلد سے جلد اپنی ملک سے نکال دیا جائے ہاں اس کو اگر رد الی رب المال کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ حائل ہو، مثلاً آج کل ہندوستان کے حکومتی یا نیشنل بینکوں سے سود میں ملنے والی رقوم کو اگر بینکوں ہی میں چھوڑدیں تاکہ رد الی رب المال ہو جائے تو اگر اصحاب بینک اس کو اپنے دھرم کھاتے میں ڈال دیں تو وہ عموماً

---

(۱) ۱۳۰/۴ نعمانی ۱۱۲/۵ (۲) بذل المجہور ۳۷/۱ (۳) درمختار علی ہامش الشامی ۱۱۶/۵ (۴) شامی من کتاب الغصب ۱۱۶/۵

ایسے کاموں میں استعمال ہوں گی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے اس لیے حکم شرعی یہ دیا جاتا ہے کہ وہاں نہ چھوڑ دے بلکہ وہاں سے نکال کر خود کسی مناسب سبیل سے رد الی رب المال کر دے کما اشرت الیہ بقولی۔ یا کوئی اور واقعاتی پریشانی حائل ہو مثلاً کوئی جانی یا مالی پریشانی یا عزت نفس کی پامالی کا قوی اندیشہ وغیرہ ہو تو اس طرح رد الی رب المال کر دے کہ مالک کو معلوم بھی نہ ہو اور وہ مال اس کی ملک میں پہونچ جائے اس کے نظائر کتب فقہ میں بکثرت ملتے ہیں۔ کما تری انا ایضا۔ نیز اس کی تفصیل اور اس کا حکم شرعی ہندوستان کے ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کا رد الی رب المال کے سلسلہ میں منتخبات نظام الفتاویٰ ۔۔ ،رربہ ممن احکام حوادث الفتادیٰ ملتا ہے کہ ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر خود پہلے حکومت کے غیر شرعی مطالبات میں جو واجب الادا ہے دے دے۔ مثلاً روڈ ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، کورٹ فیس وغیرہ۔ پانی یا بجلی کے مطالبہ میں نہ دے کیوں کہ وہ عقود مبادلہ کا ایک بدل ہے جو شرعاً بھی درست ہے۔

ایک شبہ

بعض حضرات شبہ یہ کرتے ہیں کہ بینک سے ملنے والی سودی رقوم کا مالک حکومت کب ہوتی ہے کہ اس کو رد کیا جائے بلکہ ان رقوم کا مالک تو بینک میں رقم جمع کرنے والے ہوتے ہیں، پس اگر رد کرنا ہی ہے تو ان کی طرف رد کیا جائے۔

شبہ کا ازالہ

جواب یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے وہ یا تو کسی قانونی مجبوری سے یا محض بغرض حفاظت داخل کی جاتی ہے، کسی عوض لینے کی نیت سے جمع کرنا درست ہی نہیں ہے، اسی لیے فکس ڈپازٹ میں جمع کرنا ممنوع و ناجائز ہوتا ہے۔

اور جو رقم محض حفاظت کے لیے جمع کی جائے گی وہ بینک میں بعینہٖ امانت ہوگی اور اس پر بینک کا کوئی تصرف کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا اور جب ان داخل شدہ رقوم کو بینک خلط ملط کر دے یا اس کو اپنے کام میں صرف کر دے تو وہ امانت شرعاً قرض بن جاتی ہے اور امانت کا معاملہ مبدل بہ معاملہ قرض ہو کر مستقرض مالک

ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ اس پر ضمان (واجب الادا ہوجاتا) ہے۔ پس شرعی ضابطہ کے مطابق شرعاً بنک مقروض ہوکر اپنے ان تصرفات کی وجہ سے ان رقوم کا خود مالک ہوگیا۔ اور بینک حکومتی یا نیشنل ہوجانے کی وجہ سے حقیقۃً حکومت ان رقوم کی مالک ہوگئی اور یہ عملہ بینک حکومت کے محض نمائندہ اور وکیل ہوں گے، لہٰذا ان رقوم کا رد کرنا حکومت کی جانب لازم ہوگا نہ کہ رد کرنا جمع کرنے والوں کی طرف۔ کما لایخفی علی من لہ خبرۃ بالفقہ والاصول۔

رہ گئی یہ بات کہ اگر حرام مال حلال مال میں اس طرح مخلوط ہوجائے کہ اس میں تمیز و امتیاز مشکل و متعذر ہوجائے تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟

اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ کاغذات و اندراجات کے حساب و کتاب کے ذریعہ یا پھر اپنی یادداشت سے خوب غور و خوض سے جتنی مقدار حلال مال کی متعین ہو اس کی تو زکوٰۃ حسب ضابطۂ شرع ادا کردے اور اس سے زائد کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کے کل مال حرام بقسط واحد اگر قدرت میں ہو، ورنہ باقساط متعددہ حسب استطاعت جہاں تک جلد ہوسکے بطور تصدق فقراء و مساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔ فقط۔

سوال (۵) کا شرعی حکم: دین کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب ہے جس کی ملک وہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگرچہ دین کی تین قسمیں ہیں، دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف اور ہر ایک کے احکام الگ الگ ہیں، مگر تسہیلاً للعمل اور انفع للفقراء ہونے کے پیش نظر راجح قول میں جتنی مقدار جس وقت وصول ہوتی جائے اسی وقت اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا چاہیے اور اگرچہ دین قوی و غیر قوی کے اعتبار سے نفس وجوب میں کچھ تفصیل و اختلاف ہے مگر اس طریقۂ عمل سے عمل کرنے میں کسی کے نزدیک وجہ اختلاف نہ رہے گی۔

سوال (۶) کا شرعی حکم: یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جو جزو تنخواہ ملازم کے قبضہ میں جانے سے قبل محکمہ وضع کرتا ہے اور بعد ختم ملازمت وضع کی ہوئی رقم میں اضافہ کرکے رہتا ہے خواہ سود کے نام سے دے، مگر وہ زیادتی شرعاً سود نہیں ہوتی خواہ دوران ملازمت میں ملازم اپنے ہی جمع کردہ روپیہ سے کچھ روپیہ لے اور محکمہ اس کو قرض کے نام سے دے اور اس پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول کرکے اس ملازم کے فنڈ میں جمع کرے اس پر بھی شرعاً سود کی تعریف صادق نہ آنے سے سود کا حکم نہ ہوگا بلکہ اس کو محکمہ کا انعام قرار دیا جاتا ہے۔ کما حققہ العلامۃ التھانوی فی فتاواہ۔

کیوں کہ اپنے مملوکہ مال میں جب عقدِ معاوضہ کا معاملہ کرے تو فضل ربوا اور سود ہوتا ہے اور یہاں جو جزء تنخواہ کا کٹ گئی ہے ابھی اس میں اجیر (ملازم) کا صرف استحقاق ملک ثابت ہوتا ہے اور استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے۔ اور تحقق ملک تو قبضہ کرنے کے بعد صادق آئے گی اور تحقق ملک سے قبل مملوک ہونا صحیح نہیں لہٰذا اس تحقق ملک سے قبل جتنا بھی دیں گے وہ بجائے سود ہونے کے شرعاً صرف انعام قرار پائے گا اور ملازم کا اس پر اپنے مملوک کی طرح تصرف کرنا درست رہے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ تو اپنے مملوک مال میں واجب ہوتی ہے لہٰذا قبضہ میں آنے سے قبل قبل اس پر اسی صاحب فنڈ پر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب بھی نہ ہوگا، کیوں کہ شرعاً یہ اصول مسلم ہے کہ سبب وجوب کے تحقق سے پہلے نفس وجوب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ زکوٰۃ کے وجوب کا سبب مقدار نصاب کا مالک ہونا ہے اور جب تک مقدار نصاب کا مالک نہیں ہوتا اس وقت تک نفس وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی نہیں ہوتا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وصول ہونے کے بعد سابق زمانہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہ ہوگی، جیسا کہ مالک نصاب ہونا جو نفس وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے۔ اس نفس وجوب سے قبل قبل کوئی ادا کرے تو زکوٰۃ کی ادائے گی صحیح شمار نہ ہوگی، جس طرح کسی معین وقت کی فرض نماز کے نفس وجوب کا سبب اس فرض کے وقت کا تحقق ہوتا ہے اور اس سبب (وقت نماز) کے تحقق سے قبل قبل فرض ادا کر دے تو فرض ادا نہ ہوگا، ہاں نفس وجوب کے متحقق ہو جانے کے بعد جب بھی ادا کرے تو ادائے گی صحیح ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی ایسا ہی ہوگا کہ نفس وجوب زکوٰۃ جب تک اس رقم کے پانے والے پر یعنی مقدار نصاب ملک ثابت ہونے پر ادائے گی زکوٰۃ بھی درست ہوگی ورنہ صحیح نہ ہوگی۔ پھر نفس وجوب کے تحقق کے بعد اگر چاہے تو پیشگی ادائے گی بھی صحیح ہو سکے گی۔ فقط

رہ گئی یہ بات کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے شرط ہے کہ نصاب زکوٰۃ کی مقدار ایسے مال نامی کا مالک ہو جو اس کی حاجت اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہو۔ لہٰذا ان تینوں (مال نامی کی اور حاجت اصلیہ کی اور دین سے فارغ ہونے کی) مختصر تشریح کر دی جاتی ہے۔

مال نامی: مال نامی چند قسم پر ہوتے ہیں۔

(الف) خلقۃً مال نامی ہونا جس کو اللہ نے پیدا ہی فرمایا نمو کے لیے جیسے سونا چاندی اور اس سے بنی ہوئی ہر وہ چیز خواہ زیور ہو یا اس کے علاوہ کوئی چیز ہو۔ اور چاندی یا سونے کا سکہ جیسے دینار درہم

اشرفی یا چاندی کا روپیہ، اور اصطلاح میں اس کو سکہ نافقہ خلقیہ کہتے ہیں۔

(ب)، وہ چیزیں جن کو اللہ نے نمو کے لیے نہیں پیدا فرمایا ہے بلکہ لوگوں نے اس کو مال نامی کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور سونے چاندی کے علاوہ جاری سکہ قرار دے دیا ہے جیسے غیر چاندی کا پیسہ روپیہ اور کاغذی نوٹ، پونڈ، ڈالر، ریال وغیرہ۔ اس کو اصطلاح میں سکہ نافقہ غیر خلقیہ کہتے ہیں۔

(ج)، وہ مال جس کی تجارت کرتے ہیں۔

یہ تینوں قسمیں مال نامی کی ہیں، اول نامی خلقۃ، دوسری نامی حکماً وعرفاً، تیسری نامی عملاً۔

جب یہ تینوں باتوں میں سے کوئی ایک نصاب کی مقدار کے برابر ملک میں آجائے اور حاجت اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہوجائے تو نفس زکوٰۃ کا وجوب ہوجائے گا اور حاجت اصلیہ سے وہ حاجات مراد ہیں جو اپنے اور اپنے ذمہ میں داخل شدہ اہل وعیال کی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو کر سال بھر فاضل رہ جائیں۔ اسی طرح دین سے فارغ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت سے جو دین لیا جائے اس سے فارغ ہو۔ اتنے مال کا نفس مالک ہو جانے سے زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا۔ اور جب اتنی مقدار پورے سال بھر مذکورہ ضروریات سے فارغ رہ جائے تو اس کے زکوٰۃ کی ادائے گی بھی واجب ہو جائے گی۔ البتہ بے ضرورت واقعی قرض لینا ممنوع ہے، کیوں کہ اصل یہ ہے کہ ہر انسان ہر ذمہ سے بری رہے اور جب ضرورت واقعی ہو تو قرض لینا درست رہے گا۔ اگر غیر سودی قرض نہ ملے تو حاجت شدیدہ میں سودی قرض لینا یا سودی معاملہ کرلینا بھی جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ،

"ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر)"

کے جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی مزید تشریح آئندہ آجائے گی۔

ہاں اس ضمن میں ایک یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ صاحب خود تو مقروض یا دین میں دبا ہوا نہیں ہیں بلکہ اپنی ملکیت اور سامان تجارت کے بعد قرض و دین دوسروں کو دے دیا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ کیا ادائے گی زکوٰۃ میں یہ دینا توحائل تو نہ ہوگا اگر ہوگا تو اس میں کیا تفصیل ہے۔ اس کو بقدر ضرورت ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں اور وہ عمل کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے اب اس پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔

هذا ما تيسر لي الآن والباقي سيأتي على حسب الاستطاعة

فقط واللہ اعلم

سوالات مطبوعہ کے صفحہ ۲ کے پچھلے حصہ میں طویل الاجل دین کی گفتگو ہے۔ اس دین کا حاصل تجارتی دین ہے۔ اس دین کو انسان خواہ قانونی مجبوری یا محض اپنے خالص اختیار سے کاروبار کرنے یا چلانے کے لیے حاصل کرتا ہے، حاجتِ اصلیہ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی کما مرّ آنفا من تعریف الحاجۃ الاصلیۃ۔ لہٰذا یہ قرض وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہونے میں مانع نہ ہوگا، بلکہ وہ حاجت اصلیہ کی شرعی سابق تعریف میں قرض کی جتنی مقدار حائل ہوگی اس کے وضع کرنے کے بعد باقی سب پر وجوب زکوٰۃ ہی کا حکم عائد ہوگا۔

کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ پہلے معلوم ہونی چاہیے پھر حکم شرعی لگانا چاہیے۔ کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ اوّلاً شرکت عنان کی ہوتی ہے اور شیئرز خریدنے والے سب شرکا کمپنی اور شرعاً مالک ہوتے ہیں اور عملۂ کمپنی یعنی کمپنی میں کام کرنے والے وکیل وہ مسئول ہوتے ہیں، مگر یہ لوگ بعد دقانون وقت خود مالک بن جاتے ہیں، اور اس میں جمع شدہ حصص میں کچھ مقدار اپنا یا کمپنی کی بضاعت (پونجی) قرار دیتے ہیں اور کچھ کو فرنیچر و آلات مشین وغیرہ میں شمار کرتے ہیں اور کچھ کو کاروبار میں لگاتے ہیں، ان سب واقعاتی امور میں بھی وہ شرعاً غصب ہی شمار ہوگا اور اس پر غصب ہی کے احکام جاری ہوں گے۔ اور یہ مسلم ہے کہ شئی مغصوب پر جب تک مغصوب بعینہٖ یا اس کا بدل وصول نہ ہوجائے تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب یا رد کے احکام شرعاً درست نہیں ہوتے۔ اس لیے کمپنیوں کے ان حصوں کو جب تک بیچ کر نقد نہ کرلیا جائے اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم متوجہ نہ ہوگا۔

ہیرے جواہرات کی خرید و فروخت کا جب کاروبار کریں تو اموال تجارت میں ان کا شمار ہوکر سال پورا ہونے پر اس کا عام کاروبار کرنے والوں کے یہاں اس کی جو قیمت ہوگی اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ہوگا، اور اگر کاروبار نہیں کرتا ہے تو واجب نہ ہوگی۔ البتہ اگر زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے تو سخت خطرناک جرم ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وبال میں غیر شعوری طور پر سب ہلاک ہوجائے کہ یہ عمل ایک قسم کی نافرمانی کا اور شائبہ گستاخی کا درجہ ہوسکتا ہے۔

" واشار إليه قولہ تعالیٰ: لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا لہ بالقول کجهر بعضکم لبعض ان تحبط أعمالکم وانتم لا تشعرون۔

ہاں اگر وجوب زکوٰۃ کو ساقط کرنے کی نیت نہ ہو بلکہ محض تزئین و آرائش کے لیے ہو جیسا کہ عورتیں رکھتی ہیں یا کسی حادثہ یا اچانک ضرورت پر کام آجانے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہوں تو اس کی گنجائش

ہوگی، بالکل یہی حکم اراضی کے خرید و فروخت وکاروبار کرنے کا ہوگا۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

اس میں یہ حکم ہے کہ تھوک یا پھٹکر جس طرح بیچیں اس کی عام قیمت فروخت کے وقت جو ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔ شیرز و بونڈس کے فروخت کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اس سوال کے بقیہ اجزا کا جواب اوپر گزر چکا۔

محور ثانی کا حکم

اگر کسی کے پاس محض سونا ہے اور مال تجارت وغیرہ کچھ نہیں تو معیار وجوب زکوٰۃ محض سونے کے نصاب کا ہوگا۔ اور اگر محض چاندی ہے اور کوئی اور مال زکوٰۃ کی قسم کا نہیں ہے تو معیار وجوب زکوٰۃ محض چاندی کے نصاب کی قیمت کا ہوگا۔ اور اگر سونا چاندی دونوں ہیں تو جس طرح ان میں سے کسی کے ساتھ اموال تجارت ملنے سے جس نصاب کی قیمت پہلے آکر وجوب زکوٰۃ متوجہ ہوجاتا ہے اسی طرح یہاں بھی حکم ہے۔ اور سونے چاندی کی قیمت میں اگرچہ زمین آسمان کا فرق ہوجائے یہ حکم نہ بدلے گا، کیوں کہ یہ حکم خالق آسمان وزمین ہی کا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

(۱)۔الف، محض مسلم غربا، ومساکین ہیں اور ان میں طالبان علوم دینیہ کو جو مصرف زکوٰۃ ہیں عموماً ترجیح وتقدیم ہوتی ہے اس لیے کہ ان کو دینے میں دو چند ثواب ہوجاتا ہے اور مہتمم مدرسہ جس طرح زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہوتا ہے اسی طرح مستحقین زکوٰۃ کا بھی وکیل ہوتا ہے۔ اور مالک کسی جانب کا نہیں ہوتا اس لیے اس کا کوئی عمل ضابطہ شرع کے خلاف درست نہیں ہوگا۔

(۱۔ب) بانڈز وغیرہ کی زکوٰۃ کا حکم پہلے گزر چکا ہے۔ البتہ حکومتیں یا کمپنیاں جو لوگوں سے قرض لیتی ہیں اگر ان سے زبردستی لیتی ہے تو اس کی حقیقت قرض کی نہیں ہوگی کہ اس پر ملنے والی زیادتی سود ہوگی، بلکہ زیادتی کا حکم پراویڈنٹ فنڈ کے یا انعام وغیرہ کا ہوگا، جس کا لینا اپنے جائز مال کی طرح

خرچ کرنا جائز ہے، ہاں اگر زبردستی نہ لیں بلکہ لوگوں کی مرضی وخوشی سے لیں تو یہ لینا اور اس کے عوض میں زیادہ دینا سود شمار ہوگا اور اس کو ان کے وہاں چھوڑنا جائز نہ رہے گا بلکہ ان سے لے کر غرباء ومساکین میں صدقہ کردینا چاہیے۔
محور ثانی کا حکم شرع یہاں گزر چکا۔

محور ثالث

الف: یہ معاملہ شرعاً ادائے گی زکوٰۃ سے بری ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اور محور ثالث (۲-ب) اس کی ساری گفتگو ناتجربہ کاری اور شرعی اصول سے ناواقفیت سے ناشی ہوگی۔ اس کی جائز اور مذکورہ خطرات سے محفوظ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سفراء کو بالمقطع تنخواہ مقرر کیا جائے، پھر ان کو جس علاقہ میں بغرض وصول چندہ بھیجا جائے اور اس علاقہ کی عام چندہ کا اندازہ کر کے اس طرح کہا جائے کہ آپ تمام وصول کردہ رقم مدرسہ کے خزانہ میں بھیجتے جائیں اور جب آپ سفر پورا کر کے واپس آئیں گے تو آپ کی تمام وصولی اس مذکورہ رقم سے جتنی زائد ہوگی اس کا اتنا فی صد آپ کو بطور انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح مدرسہ کے لیے بیش از بیش رقم وصول کرنے کا شوق پیدا ہو کر خرچ کے اوسط کا زیادہ ہونا اور آمد کے کم ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ رہ گیا دیگر ملازمین کی تنخواہ تو اولاً اس کو عطیہ کی رقم سے دیا جائے گا اور اگر کم پڑے تو تملیک مستحق کے حیلہ سے دیا جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور ملازمت ضرورت سے زائد شعبوں کی قائم نہ کیا جائے کہ بلاوجہ مدرسہ پر بار اور ان ملازمین وغیرہ کو عاملین علیہا کے تحت کرنے کی حاجت بھی نہ رہے گی۔

زکوٰۃ وفی سبیل اللہ

اس میں شک نہیں کہ جناب نے اس سلسلہ میں بے انتہا محنت فرمائی ہے کہ تقریباً ہر مکتب فکر کی رائیں مع ان کے دلائل بھی بیان فرمادیا ہے۔ آپ کی چھان بین ذاتی کاوش ہے۔ فجزاکم اللہ۔

سوالات کے جوابات

از:۔۔۔۔ مولانا نعمت اللّٰہ قاسمی، دارالعلوم، دیوبند

ملک تام

(۱) ملک تام سے مراد جو رقبۃً ویدًا مملوک ہو۔

ھوما اجتمع فیہ الملک والید اما اذا وجد الملک دون الید کالصداق قبل القبض او وجد الید دون الملک کملک المکاتب والمدیون لاتجب فیہ الزکوٰۃ کذا فی السراج الوھاج۔ (۱)

لان المراد بالتام المملوک رقبۃ ویدًا (۲)۔۔۔۔ فلازکوٰۃ علی مکاتب لعدم الملک التام ای لعدم الید فی حق السید وعدم ملک الرقبۃ فی حق المکاتب۔ (۳)

(۲) جس مال تجارت کی قیمت ادا کر دی گئی ہے، مگر اب تک قبضہ نہیں ہوا، قبل القبض زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ۔

---

(۱) عالمگیری: ص ۱۷۲ (۲) شامی ۲/۴ (۳) شامی ۲/۴

اور قبضہ کرنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے۔ (۱)

واما المبیع قبل القبض فقیل لا یکون نصابا والصحیح ان یکون نصابا کذا فی المحیط للسرخسی۔

اور صاحب بحر نے بھی لکھا ہے کہ سنین ماضیہ کی بعد القبض زکوٰۃ ادا کرے گا۔

ذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصابا لان الملک فیہ ناقص با فتقاد الید والصحیح انہ نصاباً لانہ عوض مال و قد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعًا فعلی ھذا قولھم لاتجب الزکوٰۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ فتجب الزکوٰۃ فی ما مضی کالدین القوی۔ (۲)

مگر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قاضی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

اما بعدہ فیزکیہ عما مضی کما فہمہ فی البحر عن عبارۃ المحیط فراجعہ لکن فی الخانیۃ رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسیامۃ ولم یقبضھا حتی حال الحول ثم قبضھا لا زکوٰۃ علی المشتری فیما مضی لانھا کانت مضمونۃ علی البائع بالثمن ومقتضی التعلیل عدم الفرق بین ما اشتراھا للسیامۃ او للتجارۃ فتامل۔ (۳)

(۳) اور بائع نے ثمن پر قبضہ کیا ہے وہ مالک ہو گیا لہذا اس کی زکوٰۃ بائع پر ہے نہ کہ مشتری پر۔

وفی الخانیۃ: اشتری عبدًا للتجارۃ یساوی مأتی درھم و نقد الثمن ولم یقبض العبد حتی حال الحول فمات العبد عند البائع کان علی بائع العبد زکوٰۃ المأتین فلانہ ملک الثمن ولا زکوٰۃ علی المشتری لان الثمن

---

(۱) عالمگیری: ص ۱۸۲ (۲) بحر: ص ۲۰۱ (۳) شامی ۲/۶

زال عن ملكه إلى البائع۔ (۱)

(۴) کرایہ پر دی گئی پیشگی رقم، اس رقم کا مالک، مالک مکان ہوگیا لہذا اس کے ذمہ ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ "اذا عجل الاجرۃ لایملك الاسترداد۔" (۲)

اور علامہ شامی نے آگے تفصیل سے ذکر کیا ہے:

" وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری ان الزکوٰۃ فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفها اهل بخاری ان الزکوٰۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الاجر لانه ملکه قبل الفسخ وإن کان یلحقه دین بعد الحول بالفسخ۔

ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ

اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی اس لیے کہ وہ بطور قرض کے دیے ہوتے ہے۔

" الدین القوی کقرض قلت الظاهر ان منه مال المرصد المشهور فی دیارنا لانه اذا انفق المستاجر لدار الوقف علی عمارتها الضروریۃ بامر القاضی للضرورۃ الداعیۃ الیه یکون بمنزلۃ استقراض المتولی من المستاجر" (۳)

(۵) مدارس میں جمع رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے:

" وسبب افتراضها ملك نصاب فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملك۔"

(۶) مال مخلوط میں مال حرام کی مقدار نکالنے پر بہ قدر نصاب بچتا ہے تو اس باقی مقدار میں زکوٰۃ ہے:

" ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملکه فتجب الزکوٰۃ فیه هذا اذا کان له مال غیر ما استهلکه بالخلط وفی الفصل العاشر

---

(۱) بحر: ص ۳۰۲ (۲) ۵/۴ (۳) شامی ۳۵/۲

من التتارخانیہ عن فتاوی الحجۃ من ملك اموالا غیر طیبۃ او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامناً وان لم یکن لہ سواها نصاب فلا زکوٰۃ فیہ علیها لانہ مدیون ومال المدیون لاینعقد سببًا لوجوب الزکوٰۃ عندنا فأفاد بقولہ وان لم یکن لہ سواها نصاب ان وجوب الزکوٰۃ مقید لما اذا کان لہ نصاب سواها" (۱)

دین کی زکوٰۃ کس پر

دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، مدیون پر کسی حال میں بھی نہ ہوگی۔

وصول یابی اور عدم وصول یابی کے اعتبار سے دین کے اقسام۔

(۱) جس کا مدیون اقرار کرتا ہو۔

(۲) جس کا مدیون انکار کرتا ہو مگر دائن کے پاس شہادت موجود ہے۔

(۳) مدیون انکار کرتا ہے اور دائن کے پاس شہادت موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں میں مدیون کے اندر دین کی ادائےگی کی استطاعت ہے یا استطاعت نہیں ہے اور معسر ہے، ابتداءً علماء احناف صرف اس دین کو جس کا مدیون انکار کرتا ہے اور کوئی شہادت بھی دائن کے پاس نہیں ہے اس کو مال ضمار کے حکم میں کہتے تھے، مگر حالات کی تبدیلی سے اس کو بھی مال ضمار کے حکم میں کہنے لگے جس پر شہادت موجود ہو، اس لیے کہ عدالت کے ذریعہ قرضہ وصول کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے اس کے بعد حالات میں اور زیادہ تبدیلی آئی کہ آدمی اقرار بھی کرتا ہے اور دین کی ادائےگی پر قادر بھی ہے پھر بھی ٹال مٹول کرتا ہے اور ادا نہیں کرتا ہے اور دائن کے لیے وصول کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے جس کی بنا پر بعض فقہا، احناف نے دین کی قسم دو قسمیں قرار دیں۔

(۱) جس دین کی وصول یابی کی بالکل امید نہیں یا امید ضعیف ہے۔

---

(۱) شامی ۲/ ۳۵

(۲) جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے

جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے اگر وہ دین قوی ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر دین متوسط ہے یا ضعیف ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جس کے ملنے کی امید بھی نہیں یا ضعیف امید تھی اگر وہ مل جائے تو وہ مال مستفاد کے حکم میں ہوگا۔

"قلت قدمنا اول الزکوٰۃ اختلاف التصحیح فیہ ومال الرحمی إلیٰ ھذ وقال بل فی زماننا یقرّ المدیون بالدین و بملاکۃ ولا یقدر الدائن علیٰ تخلیصہ فھو بمنزلۃ العدم۔" (۱)

پراویڈنٹ پر زکوٰۃ

ملازمت کی وجہ سے اجرت کا استحقاق ہے مگر جب تک قبضہ نہ کرے ملک تام حاصل نہیں ہے بلکہ عندالاحناف یہ دین متوسط ہے، لہٰذا دین متوسط میں اصح روایت کی بنا پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہے۔

نامی کی حقیقت

نمو، بمعنی بڑھوتری، نمو حقیقی تو الد و تناسل یا تجارت کی شکل میں نمو تقدیری نمو اور اضافہ کرنے پر قدرت کا ہونا بایں طور کہ وہ مال خود اس کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔

وفی الشرع ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات، والتقدیری تمکنہ من الزیادۃ بکون المال فی یدہ او ید نائبہ۔ (۲)

حقیقۃً نمو و اضافہ مراد نہیں ہے:

لانعنی بہ حقیقۃ النما لان ذلك غیر معتبر انما نعنی بہ کون

---

(۱) شامی ۲/۳۵ (۲) شامی ۲/۷

المال معدًّا للاستنماء للتجارة اوبالاسامة۔ (۱)

حوائج اصلیہ کی تعریف

جس کے بغیر زندگی بسر کرنا دشوار ہو:

قال ابن الملك هي مايدفع الهلاك عن الانسان كالنفقة ودار السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد اوتقديرًا كالدين فان المديون محتاج إلى قضاءه لما في يده من النصاب دفعًا عن نفسه الحبس۔ (۲)

انسان کی بہت سی ضرورتیں ہیں اور موجودہ دور میں بہت سی غیر ضروری چیزوں کو لوگوں نے اپنے طور پر ضروری کرلیا ہے مگر زکوٰۃ کے سلسلہ میں حوائج اصلیہ سے مراد وہی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو، حوائج اصلیہ میں حالات کے اعتبار سے اور اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے والے کی حیثیت کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

ہر اس دین سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ آدمی کی طرف سے ہو وہ دین حقوق اللہ کے قبیل سے ہو جیسے زکوٰۃ، یا حقوق العباد کے قبیل سے ہو، پھر دین معجل ہو یا دین مؤجل ہو، چوں کہ دین کی ادائے گی حوائج اصلیہ میں داخل ہے۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائج اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے، اس لیے مدیون ہوتے ہوئے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔

فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزكوٰة وخراج اوللعبد ولوكفالة أوموجلا ولوصداق زوجته المؤجل للفراق

---

(۱) بدائع ۲/۱۱ (۲) شامی ۲/۶

ونفقة لزمته لقضاء او رضاء۔

یہی قول امام مالکؒ اور احمدؒ کا بھی ہے، مگر امام شافعیؒ کے یہاں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے دین سے محفوظ ہونا شرط نہیں ہے۔

طویل الاجل قرضوں کا حکم

موجودہ دور میں زراعتی یا کارخانہ قائم کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں حکومت سے لی جاتی ہیں اور اس سے خوب نفع بھی کمایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہر طرح کے دیون کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس بہ قدر نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

مگر جب اس طرح کے قرضوں کا عام رواج ہو جائے اور ان دیون کو مانع زکوٰۃ قرار دیا جائے تو زکوٰۃ کی وصول یابی بہت زیادہ متاثر ہوگی، شرعاً یہ بات مشروعیت زکوٰۃ کی حکمت کے منافی ہے اس لیے تجارتی دین کو حوائج اصلیہ میں شمار کرنا مشکل ہے، اگر امام شافعیؒ کا قول لیا جائے تو اس سے مالک کا ضرور نقصان ہے، اس لیے اگر درمیانی شکل نکالی جائے، جیسے بعض فقہاء نے دین مہر میں معجل اور مؤجل کی تفریق کی ہے تو مناسب ہوگا، لیکن اس میں اجتماعی فیصلہ معتبر ہوگا، انفرادی رائے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا بلکہ ایسی صورت میں یا تو ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے یا پھر امام شافعیؒ کے قول پر حالات کی بنا پر فتویٰ دیا جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

اقتصادی تجارتی ترقی کے ساتھ شرکت کی ایک قسم وجود میں آئی ہے، جس میں خود کمپنی کو ایک شخص حکمی قرار دیا جاتا ہے اور کمپنی کے لیے ذمہ ثابت کیا جاتا ہے اور کمپنی کا یہ ذمہ شرکاء کے ذمہ سے الگ ہوتا ہے، فقہاء نے اگرچہ اس لفظ کو استعمال نہیں کیا ہے مگر بہت سے ایسے احکامات بیان کیے ہیں جو شخص حکمی کے نظریہ پر منطبق ہیں۔

مثلاً مسجد اور اسی طرح دیگر اداروں کے لیے وصیت کرنا راجح قول کے مطابق بلا تفصیل صحیح ہے۔ شامی میں ہے:

ینبغی ان یفتی لصحة الوصیة للازھر ویصرف لطلبتہ کما یقضی بہ العرف۔

اوقاف کے لیے حقوق ثابت ہوتے ہیں اس طرح اوقاف پر دوسروں کے حقوق ثابت ہوتے ہیں اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے اور وقف کی ضروریات کے لیے متولی سامان خریدتا ہے اور وقف سے اس کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور ضرورت کے وقت وقف کا متولی قاضی کی اجازت سے وقف کے لیے قرض لیتا ہے تو خود وقف مقروض ہوتا ہے اس طرح خود حکومت کو شخص حکمی قرار دے کر اس پر احکامات متفرع کیے جاتے ہیں۔

چوں کہ اموال زکوٰۃ میں احناف کے یہاں خلطۃ الشیوع اور خلطۃ الجوار کسی کا اعتبار نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا، دیگر ائمہ مویشی کی زکوٰۃ میں خلطۃ الشیوع جس کو وہ حضرات خلطۃ الاعیان سے اور خلطۃ الجوار جس کو وہ حضرات خلطۃ الاوصاف سے تعبیر کرتے ہیں، دونوں طرح کی خلطۃ کا کچھ شرائط کے ساتھ اعتبار کرتے ہوئے اس کو شخص حکمی قرار دیتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ کو واجب کہتے ہیں۔ مویشی کی زکوٰۃ کے علاوہ اموال تجارت وغیرہ میں خلطۃ الشیوع یا خلطۃ الجوار کا اعتبار کرنے میں اختلاف ہے:

"وان اختلطوا فی غیر ھذا اخذ من کل واحد منھم علی انفرادہ اذا کان ما یخصہ تجب الزکوٰۃ ومعناہ اذا اختلطوا فی غیر السائمة کالذھب والفضة وعروض التجارة والزروع والثمار لم تؤثر خلطتھم شیئاً وکان حکمھم حکم المنفردین وھذا قول اکثر اھل العلم.......

وعن احمد فی روایة اخری ان شرکة الاعیان تؤثر فی غیر الماشیة اذا کان بینھم نصاب یشترکون فیہ فعلیھم زکوٰۃ .... اما خلطة الاوصاف فلامدخل لھا فی غیر الماشیة وھی الثمار والزروع والنقدان بحال۔" (۱)

---

(۱) مغنی ابن قدامہ ۲/۶۱۹

اور حضرت امام شافعیؒ کے یہاں صحیح قول کے مطابق مویشی کے علاوہ دیگر اموال میں خلطہ کا اعتبار ہے۔

قال اصحابنا تؤثر الخلطة فی غیر الماشیة وھی الثمار والزروع و النقدان وعروض التجارة اما خلطة الاوصاف ففیھا قولان القدیم لایثبت والجدید الصحیح یثبت اما خلطة الجوار ففیھا طرق۔ والاصح ثبوتھما جمیعا فی الجمیع ۔(۱)

مگر خلطہ کے تحقق کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سب شرکا مسلمان ہوں۔

ویشترط ان یکون الخلیطان من اھل الزکوٰة فان کان احدھما ذمیا اومکاتبا لم یعتد بخلطته۔ (۲)

فقال اصحابنا نوعا الخلطة یشترکان فی اشتراط امور تختص خلطة الجوار بشروط فمن المشترك کون المختلط نصابا......

ومنھا کون المخالطین ممن یجب علیه الزکوٰة فلو کان احدھما کافرا اومکاتبا فلا اثر للخلطة ۔(۳)

اس بنا پر اگر کمپنی کے تمام شرکا مسلما ہوں تو شوافع کے قاعدہ کے مطابق کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ بعض شرکا کا حصہ انفرادی طور پر مقدار نصاب نہ ہو اور جب کمپنی زکوٰۃ ادا کردے تو اس کے شرکا کو الگ سے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالنی ہوگی، اگر کمپنی کے تمام شرکا مسلمان ہوں تو سہولت کے پیش نظر امام شافعیؒ کے قول کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر تمام شرکا مسلمان نہیں ہیں بلکہ کچھ غیر مسلم ہیں تو سب ائمہ کے نزدیک ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی الگ الگ زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات کو زینت کے لیے اور کسی غیر تجارتی مقصد کے لیے خرید رکھا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی ہونا شرط ہے چاہے حقیقۃً نامی ہو یا تقدیرًا، اور

---

(۱) شرح المہذب ۳۵/۵ (۲) مغنی ۶۰۹/۲ (۳) شرح المہذب ۴۳۴/۵

یہ مال نامی نہیں ہیں اور حوائج اصلیہ میں بھی داخل نہیں ہیں، مگر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائج اصلیہ سے زائد کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا نامی ہونا بھی شرط ہے۔ حوائج اصلیہ سے زائد ہونے کا اثر زکوٰۃ لینے پر پڑے گا۔

وکذا الکتب وان لم تکن لاھلھا اذا لم ینوللتجارۃ غیران الاھل لہ اخذ الزکوٰۃ وان ساوت نصابًا۔ (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ ـــ نرخ کا تعین

سامان تجارت میں نرخ کے تعین میں اپنی لاگت کا اعتبار نہیں بلکہ بازار بھاؤ کا اعتبار ہوگا، اس لیے اگر نرخ کم ہوگیا اور لاگت اعتبار کیا جائے تو مالک کا ضرور نقصان ہے اور اگر نرخ بڑھ گیا تو لاگت کا اعتبار کرنے میں لازم آتا ہے کہ صرف راس المال کی زکوٰۃ ادا کرے جب کہ راس المال اور نفع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے تو کس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

امام صاحبؒ کے بیان کے مطابق حولان حول کے وقت کا اور صاحبینؒ کے بیان کے مطابق جس دن زکوٰۃ ادا کرے گا اس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء بالاجماع۔ (۲)

نرخ میں تھوک کا اعتبار ہوگا یا پھٹکر کا؟

انفع للفقراء کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ نصاب کے سلسلے میں فقہاء نے اعتبار کیا ہے یا جس طرح کی تجارت کرتا ہے، اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کا اعتبار کرے اور اگر پھٹکر فروش ہے تو پھٹکر کا اعتبار کرے مگر نقد قیمت کا اعتبار ہوگا ادھار قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۲) بونڈز دین قوی کے قبیل سے ہے اس لیے سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیرز کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ تجارتی کمپنیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، بعض میں پورا سرمایہ

---

(۱) شامی ۲/ (۲) شامی ۲/۲۲

نامی ہوتا ہے بعض میں کچھ مال غیر نامی کی شکل میں ہوتا ہے اور کچھ نامی شکل میں جو نامی ہے اسی پر زکوٰۃ ہے، اور غیر نامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، حصص بنفسہ نامی نہیں ہیں، ہاں اگر حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدتا ہے تو خود حصص مال تجارت ہوں گے، ورنہ مال تجارت کے قبیل سے نہیں ہوں گے۔

پورے حصص یا حصص کے کچھ حصہ پر زکوٰۃ

حنفیہ کے اصول کے مطابق اس کے حصہ میں جتنا حصہ کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں صرف ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جتنا حصہ نقد رقم یا مال تجارت کی شکل میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس نے حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدا ہے تو کل حصہ مال تجارت ہو گیا ایسی صورت میں کل حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

نصاب زکوٰۃ

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ مقدار نصاب کا مالک ہونا بھی ہے تاکہ زکوٰۃ نکالنے پر مالک کو کسی طرح کا ضرر و نقصان نہ ہو جو قابل اعتبار ہو، سونے چاندی دونوں کو جب شریعت نے معیار قرار دیا ہے تو خواہ مخواہ کسی ایک کو قرار دینا بے دلیل ہوگا۔ تفاوت کی صورت میں اموال زکوٰۃ کی قیمت میں چاندی کے نرخ کا اعتبار کیا جائے یا سونے کا یہ مسئلہ روح شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بہت پہلے طے کر دیا ہے۔

تقوم السلع اذا حال الحول باللاحظ من عين او ورق ولا يعتبر ما اشتريت به يعنى اذا حال الحول على العروض وقيمتها بالفضة دون النصاب وبالذهب يبلغ نصابا قومنا بالذهب لتجب الزكوٰة فيها ولهذا قال ابوحنيفة (مغنى ۲۳/۳)

ولوبلغ احدهما نصابًا دون الاخر تعين مايبلغ به ولوبلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعين مايبلغ به ولوبلغ احدهما نصابا خمسا و بالآخر اقل قومه بالانفع للفقير۔ سراج شامی ۳۱/۱۔

مہتمم مدرسہ کی حیثیت

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا بھی وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ کا بھی جس کی وجہ سے زکوٰۃ دینے والوں نے سفرا کو زکوٰۃ دی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، جیسے حکومت اسلامی کے مصدق و ساعی کو زکوٰۃ دیتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اس لیے کہ امیرالمومنین اور اس کے واسطے سے عاملین مستحقین زکوٰۃ کے وکیل ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ نے حضرت مولانا تھانویؒ کو اسی طرح کا جواب لکھا تھا جس پر وہ بھی مطمئن ہو گئے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی اس طرح لکھا ہے کہ مہتمم مدرسہ قیم و نائب جملہ طلبہ ہوتے ہیں جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئی مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ طلبہ کا قبضہ ہے اسی کے قبضہ سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کی ہو گئی، اگرچہ وہ مجہول الکمیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے۔

طلبہ پر فیس مقرر کرنا اور اس کو مدزکوٰۃ سے ادا کرنا

طلبہ پر کمرہ کا کرایہ، تعلیمی فیس، بجلی کی اجرت اور طعام کی قیمت مقرر کر کے ان کے ذمہ اس کو لازم کرنا درست ہے اور جب طلبہ مدیون ہو جائیں تو ان کے دین کو مدزکوٰۃ سے ادا کرنا بایں طور کہ ان کو مدزکوٰۃ سے مقررہ روپیہ دیا جائے اور وہ مدرسہ میں داخل کریں، صحیح اور درست ہے اور بہت سے مدارس میں اس طرح کا نظم پایا جاتا ہے، البتہ مہتمم مدرسہ اور خود بدون طلبہ کے وکیل بنائے ہوئے ادا کرے گا تو وہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ طلبہ باقاعدہ مہتمم مدرسہ کو وکیل بنائیں کہ آپ ہماری طرف سے ہمارا مقررہ وظیفہ وصول کر کے ہمارے دین میں محسوب کرلیں تو صحیح ہوگا۔

نوٹ: ابتداء میں مہتمم مدرسہ کو مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کیا گیا ہے، مگر اس میں کسی طالب علم کا تعین نہیں ہے اس لیے اس وکالت کی بنا پر طلبہ پر مدرسہ کا کوئی متعین حق ثابت نہیں ہوتا ہے ہاں جب مدرسہ باقاعدہ طلبہ کا وظیفہ مقرر کرے اس وقت لڑکوں کو استحقاق حاصل ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے طلبہ باقاعدہ وکیل بنائیں اس لیے اس وکالت کی بنیاد پر طلبہ کا وظیفہ بہ مدزکوٰۃ مقرر کرے تو اس وقت میں زکوٰۃ کا استحقاق ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے باقاعدہ وکیل بنانا ضروری ہوگا۔

سفراء مدارس کو مدِ زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

جب مہتمم مدرسہ کو مثل امیر مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کرلیا گیا تو محصلین و سفراء عاملین میں داخل ہوں گے اور ان کو ان کی کارکردگی کے مطابق مدِ زکوٰۃ سے بطور عمالہ دیا جاسکتا ہے، مگر ان کی وصول کردہ زکوٰۃ میں سے نصف سے زائد دینا جائز نہ ہوگا اور جب یہ بطور اجارہ نہیں ہے بطور عمالہ ہے تو کمیشن بھی صحیح ہوگا۔

فیعطی بقدر عملہ ما یکفیہ و اعوانہ بالوسط لکن لایزاد علی نصف ما یقبضہ۔ (۱)

حساب لکھنے والوں کو ان کی کارکردگی کے بہ قدر مدِ زکوٰۃ سے دیا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ بھی عاملین کے حکم میں ہیں۔

فی سبیل اللہ سے مراد

لغت کے اعتبار سے فی سبیل اللہ کا ہر نیک کام پر ہوتا ہے مگر عرف شرع میں عام طور پر جہاد پر اطلاق ہوتا ہے۔ ابن اثیرؒ نے ذکر کیا ہے:

السبیل فی الاصل الطریق وسبیل اللہ عام علیٰ کل عمل خالص سلك به طریق التقرب إلی اللہ عزوجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات و اذا اطلق فهو علی الغالب واقع علی الجهاد حتی صار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیه۔

اور ائمہ اربعہ نے مصارفِ زکوٰۃ میں جہاد ہی مراد لیا ہے اور حدیث لاتحل الصدقة لغنی إلا لخمسة لغاز فی سبیل اللہ میں بھی غازی کے ساتھ مقید کردیا گیا ہے۔

غازی میں عندالاحناف فقر کی شرط ہے مگر صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ مالدار مجاہد جب مقیم ہے اس وقت اس کو سواری، سامان سفر، و آلات جنگ کی ضرورت نہیں ہے مگر جب جہاد کا ارادہ کرے گا

---

(۱) شامی /٥٩

تواس کو ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی، اس کی ضرورت کو مد زکوٰۃ سے پورا کیا جائے گا۔

اما استثناء الغازی فمحمول علی حال حدوث الحاجة وسماه غنیا علیٰ اعتبار ماکان قبل حدوث الحاجة وھو ان یکون غنیا ثم تحدث لہ الحاجة فان کان لہ دار یسکنہا ومتاع یمتہنہ وثیاب یلبسہا ولہ مع ذلک فضل مأتی درھم حتی لاتحل لہ الصدقة ثم یعزم علی الخروج فی سفر غزو فیحتاج إلیٰ آلات سفرہ وسلاح یستعملہ فی غزوہ ومرکب یغزو علیہ مایستعین بہ فی حاجتہ التی تحدث لہ فی سفرہ وھو فی مقامہ غنی الخ۔ (۱)

دیگر ائمہ بھی یہی کہتے ہیں، اگر فرق ہے تو اس بات میں کہ اس کے عیال کا نفقہ بھی مد زکوٰۃ سے ادا کیا جائے یا نہیں:

قال النووی فی الروضة ھل یعطی جمیع المؤنة ام مازاد بسبب السفر وجہان قال النووی فی بعض شروح المفتاح انہ یعطی الغازی نفقتہ ونفقة عیالہ وسکت الجمہور عن نفقة العیال لکن اخذھا لیس ببعید۔

انما الصدقات کا حصر

اس میں حصر حقیقی ہے، یہاں پر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیم صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جن ضرورتوں کا سوال نامے میں ذکر کیا گیا ہے زمانۂ رسالت سے ائمہ کے دور تک اس طرح کی ضرورتیں پائی جاتی تھیں اس کے باوجود کہیں سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان ضرورتوں میں زکوٰۃ کی رقم کو خرچ کیا جائے، اسلام نے اس طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات کی ترغیب دی ہے ہم کو بھی اسی پر زور دینا چاہیے۔ ٭

---

(۱) بدائع ۴۶/۲

زکوٰۃ کے شرعی احکام

از:۔۔۔ مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی دارالعلوم دیوبند

زکوٰۃ کے احکام سے متعلق سولہ سوالات پر مشتمل سوال نامہ کے جوابات اختصاص کے ساتھ بالترتیب ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱)

شریعت اسلام میں ملک تام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مالک کا قبضہ بھی ہو، لہٰذا اموال زکوٰۃ میں اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو اور مال اب تک مشتری کے قبضہ میں نہ آیا ہو تو چوں کہ قیمت کی ادائے گی کے بعد بائع اس قیمت کا مالک بن گیا اور اس پر قابض بھی ہوگیا، اس لیے بائع کے ذمہ اس قیمت پر (نصاب وحولان حول کے بعد) زکوٰۃ واجب ہوگی اور مال چوں کہ مشتری کے قبضہ میں نہیں آیا، گو مشتری اس کا مالک ہے مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"وسببه أی سبب افتراضها ملك نصاب حولی تام صفة ملك خرج مال المكاتب أی خرج والتقييد به لأن المراد بالتام المملوك رقبةً ويدًا .... خرج به ايضاً كما فی البحر، المشتری للتجارة قبل القبض والأبق المعد للتجارة" (شامی ۲/۲۶)

واطلق الملك فانصرف إلى الكامل وهو المملوك رقبةً ويداً فلايجب على المشترى فيما اشتراه للتجارة قبل القبض" (۱) وفى الدرالمختار فرغ عن سببه بقوله فلازكوٰة على مكاتب لعدم الملك التام ولافى كسب ماذون ولافى مرهون بعد قبضه ولا فيما اشتراه للتجارة قبل قبضه" (۲)

(۲)

کرایہ کی جو رقم پیشگی دی جاتی ہے اور فسخ یا مدت پوری ہونے کے بعد واپس کی جاتی ہے وہ رقم بہ طور وثیقہ کے رکھی جاتی ہے جس طرح پر شئی مرہون بہ طور وثیقہ رکھی جاتی ہے اور چوں کہ اس رقم پر ملک تام کسی کی نہیں ہے، کرایہ پر لینے والا اس رقم کا مالک تو ہے مگر اس کا اس پر قبضہ نہیں ہے اور کرایہ پر دینے والا اس رقم کا مالک نہیں، البتہ قبضہ ضرور ہے اس لیے اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"قوله (ولافى مرهون) أى لاعلى المرتهن لعدم ملك الرقبة ولاعلى الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لايزكى عن السنين الماضية وهومعنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن ولوكان الرهن أزيد من الدين" (۳)

(۳)

مدارس اور اداروں میں جو رقم آتی ہے ارباب مدارس مثل عُمّال بیت المال کے مُعطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وُکلا ہیں، مالک نہیں ہیں، لہٰذا مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم میں ملکیت نہ پائے جانے کی وجہ سے ان رقوم میں زکوٰۃ واجب نہیں نہ معطین کی طرف سے نہ آخذین کی طرف سے۔

"وسبب افتراضها ملك نصاب حولى تام" (۴)

---

(۱) بحرالرائق ۲/۲۰۳ (۲) درمختار ۲/۲۶۳ (۳) شامی ۲/۲۶۳ (۴) درمختار مع الشامی ۲/۲۶۱

(۴)

خالص مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ اس کا مالک معلوم ہونے کی صورت میں وہ مال الرد إلی صاحب المال کے اصول کے پیش نظر واجب الرد ہے، اور اگر مالک معلوم نہیں تو کل مال واجب التصدق ہے، اور مال حرام جب مال حلال کے ساتھ خلط ہوجاتا ہے تو وہ مستہلک ہوجاتا ہے اور استہلاک سے مستہلک کے ذمہ دَین ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ دیکھا جائے گا اگر مال مخلوط میں سے بہ قدر مال حرام نکال کر نصاب تک پہونچتا ہے تو باقی مال پر یعنی نصاب تک پہنچنے والے اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بہ قدر نصاب نہیں بچتا ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

"ولوخلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوٰة فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك إذا لم يكن تمييزه عند أبي حنيفة وقوله أرفق اذ قلما يخلوا مال عن غصب وهذا إذا كان له مال غيرما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكوٰة كما لو كان الكل خبيثاً كما في النهر وفي فصل العاشر من التاتارخانيه عن فتاوى الحجة من ملك اموالاً غير طيبة أو غصب أموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامناً و إن لم يكن له سواها نصاب فلازكوٰة عليه فيها وان بلغت نصاباً لأنه مديون ومال المديون لاينعقد سبباً للوجوب لوجوب الزكوٰة عندنا فأفاد بقوله وإن لم يكن له سواها نصاب الخ أن وجوب الزكوٰة مقيد بما إذا كان له نصاب سواها" (۱)

(۵)

دَین کی وصولیابی کی امید نہ ہو تو اس دَین پر زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر دَین کی وصول یابی کی امید ہو تو پھر دَین کے تین درجے ہوں گے۔ (۱) دَین قوی (۲) دَین متوسط (۳) دَین ضعیف

---

(۱) شامی ۲/۲۹۱

دَین قوی وہ ہے کہلاتا ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے بدلہ میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلہ میں واجب ہوا ہو مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو بلکہ ان کے علاوہ کوئی اور سامان ہو۔ اور دَینِ ضعیف وہ دَین کہلاتا ہے جو کسی مال کے بدلہ میں مدیون کے ذمہ واجب نہ ہوا ہو، جیسے دَین مہر، بدل خلع، میراث، وصیت وغیرہ۔

ان تینوں دیون کا حکم یہ ہے کہ دَین قوی اگر بہ قدر نصاب ہے اور چالیس درہم پر دائن کا قبضہ ہو جائے تو اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اور دین ضعیف پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ ہونے کے بعد حسب ضابطہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ رہا دین متوسط کا حکم تو حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک دَینِ متوسط میں اصح روایت کے مطابق ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ وصول ہونے کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بہ شرطیکہ وہ بہ قدر نصاب ہو۔

اگر مدیون کے ذمہ ایسا دین ہے جس کا طالب بندہ ہے جیسے قرض، زکوٰۃ، مال خراج، دَین مہر وغیرہ تو مدیون کے اتنے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں، جتنا مال اس کے ذمہ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر اس سے زائد مال بہ قدر نصاب موجود ہو تو اس پر حسب ضابطہ شرعیہ زکوٰۃ واجب ہوگی، مدیون قرض کی ادائے گی پر قدرت کے باوجود اگر قرض ادا نہ کرے تو وہ مال مدیون کے ذمہ دَین ہی میں مشغول سمجھا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر اس مشغول فی اداء الدین مال کو تجارت میں لگائے اور اتنا نفع ہو کہ دین کی ادائیگی کے بعد بہ قدر نصاب مال، مدیون کے پاس بچتا ہو تو اس پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"واعلم أن الديون عند الامام ثلثة: قوى و متوسط و ضعيف فتجب زكوتها إذا تمّ نصابا وحال الحول لكن لا فورًا بل عند قبض أربعين درهما يلزم درهم وعند قبض مأتين منه لغيرها أى من بدل لغير تجارة و هو المتوسط وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده أى بعد القبض من دين ضعيف -(١)

فلو كان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لا زكوة عليه فى الحول الثانى (٢)

(١) شامى، نعمانيه ٢/٣٥، ٣٦ (٢) شامى، مطبوعه پاكستان ٢/٢٦٠

پراویڈنٹ فنڈ جو حکومت کے ذمہ واجب الادا ہے، ملازم اس رقم کا صرف استحقاق رکھتا ہے، اس رقم پر مالک وقابض نہیں ہوا ہے، اس رقم کو نہ تو دین قوی بنایا جا سکتا ہے، نہ دین متوسط بلکہ یہ دَین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ میں آنے کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہٰذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا بھی یہی حکم ہوگا۔

"ویشترط أن یتمکن من الاستنماء بکون المال فی یده أو ید نائبه فإن لم یتمکن من الاستنماء فلا زکوٰۃ علیه وذلك مثل مال الضمار وهو کل ما بقی أصله فی ملکه ولکن زال عن یده زوالاً یُرجیٰ عوده فی الغالب ومن مال الضمار الدین المجحود والمغصوب اذا لم یکن علیها بینة" (١)

وجملة الأحکام فی الدیون أنها علیٰ ثلث مراتب فی قول أبی حنیفة دین قوی ودین ضعیف ودین متوسط کذا قال عامة المشائخ اما القوی فهو الذی وجب بدلاً عن مال التجارة کثمن عرض التجارة من ثیاب التجارة وعبید التجارة ولاخلاف فی وجوب الزکوٰۃ فیه إلا أنه لایخاطب بإداء شئ من زکوٰۃ مامضی مالم یقبض اربعین درهمًا وأما الدین الضعیف فهوالذی وجب بدلاً عن شئ سواء وجب له بغیر صنعه کالمیراث أو بصنعه کما بوصیة أو وجب بدلاً عما لیس بمال کالمهر وبدل الخلع. والصلح من قصاص وبدل الکتابة ولا زکوٰۃ فیه مالم یقبض کله ویحول علیها الحول بعد القبض. وأما الدین الوسط فما وجب له بدلاً عن مال لیس للتجارة کثمن عبد الخدمة وثمن ثیاب

---

(١) عالمگیری ١٧٤/١

البذلة والمنة وفيه روايتان عنه ذكر في الاصل أنه تجب فيه الزكوٰة قبل القبض لكن لايخاطب با لاداء مالم يقبض مأتى درهم فاذا قبض مأتى درهم زكىٰ لما مضى و روىٰ ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة أنه لازكوٰة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين عنه۔[1]

فارغ عن دين لهٗ مطالب من جملة العباد سواء كان للّٰه كزكوٰة وخراج ولوكفالةً أومؤجلاً ولوصداق زوجة المؤجل للفراق الخ۔[2]

وفي الشامي قوله كزكوٰة فلوكان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لازكوٰة عليه في الحول الثاني۔[3]

(۷)

حقیقتِ نما اور اس کی قسمیں

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مال ایسی حیثیت میں ہو کہ اس میں بڑھوتری اور زیادتی ہوسکے خواہ وہ حقیقی ہو، جیسے توالد وتناسل وتجارت۔ یا تقدیری ہو، جیسے مالک کو اس مال کے بڑھانے کی قدرت ہو خواہ وہ مالک کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نائب کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نمو خلقی ہو، جیسے سونا چاندی، اس میں چاہے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نمو فعلی ہو یعنی سونا چاندی کے علاوہ دیگر سامان، اگر اس میں تجارت واسامت اور عملاً ان چیزوں میں تجارت کی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ ان چیزوں میں تجارت کی نیت صراحۃً یا دلالۃً ہو۔

"ومنها كون النصاب ناميًا حقيقةً بالتوالد والتناسل والتجارة أو تقديرًا بأن يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده

---

(۱) بدائع ۱۰/۲ (۲) درمختار (۳) شامی ۲۶/۲

أو فى يد نائبه وينقسم كل واحد منهما إلى قسمين خلقى و فعلى فالخلقى الذهب والفضة لأنهما لا يصلحان للانتفاع بأعيانهما فى دفع الحوائج الاصلية فتجب الزكوٰة فيهما نوى التجارة أولم ينو أصلاً أو نوى النفقة والفعلى ماسواهما ويكون الاستنماء فيه بنية التجارة والاسامة ونية التجارة والاسامة لاتعتبر مالم تتصل بفعل التجارة أو الاسامة بقرينة أن يكون المملوك للتجارة سواء كان ذلك العقد شراءً وإجارة وسواء كان ذلك الثمن من النقود والعروض وأما الدلالة أن يشترى عيناً من الاعيان بعروض التجارة أو يواجر التى للتجارة بعرض من العروض فتصير للتجارة وان لم ينو التجارة صريحاً۔ (۱)

(۸)

حاجتِ اصلیہ حاجتِ اصلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنی جان کو ہلاکت اور بے عزتی سے محفوظ رکھ سکے، نان ونفقہ، رہائش کے لیے مکان، جنگ کے سامان، سردی، گرمی سے حفاظت کے لیے کپڑے، یہ حاجتِ اصلیہ حقیقی ہے، اس کے علاوہ دین حاجتِ تقدیری میں داخل ہے، کیوں کہ مدیون اپنی جان دائن کے ہاتھ سے بچانے کے لیے اس کی ادائے گی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح آلاتِ حرفت، متاعِ بیت، سواری کا جانور، علماء کے لیے کتابیں یہ چیزیں بھی حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں، لہٰذا اگر صاحبِ مال کے پاس اپنی حاجتِ اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد اتنا مال بچتا ہو جو بہ قدرِ نصاب ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

" وفارغ عن حاجته الاصلية لأن المشغول بها كالمعدوم وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقاً كثيابه أو تقديراً كدينه الخ۔(۲)

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۰۴ (۲) درمختار

قولہ وهو ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة والدور للسكنى وآلات الحرب وثياب المحتاج اليها لدفع الحرّ والبرد أو تقديرًا كالدين فان المديون محتاج الى قضاءه بما فى يده من النصاب دفعًا عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك فاذا كان له دراهم مستحقة يصرفها الى قلب الحوائج صارت كالمعدومة ‎؁ (١)

جب حاجت اصلیہ میں یہ بات اصل قرار پائی کہ انسان جس سے بآسانی اپنی جان اور عزت وآبرو کی حفاظت کر سکے تو ہر دَور اور ہر ماحول میں اپنی جان وعزت کی حفاظت کے لیے جتنی مالیت کی حاجت ہو وہ حاجت اصلیہ میں داخل ہوگی۔

(۹)

حکومت کی طرف سے جو قرض ملتا ہے جس کی ادائے گی کے لیے کئی سال کی لمبی مہلت ملتی ہے، اور سالانہ ایک متعین مقدار قرض کی ادائے گی اس کے ذمہ رہتی ہے تو ان صورتوں میں اس کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مدیون کے ذمہ پورا قرض منہا کرنے کے بعد اگر بہ قدر نصاب مال بچتا ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، سالانہ واجب الادا، قسط وضع کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ فقہی عبارات سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

"وسببه أى وسبب افتراضها ملك نصاب حولى تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد ‎؁ (٢)

(۱۰)

اگر کمپنی کی مجموعی مالیت بہ قدر نصاب ہو جائے اور شرکا، کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے بعد کسی شریک کے حصہ میں بہ قدر نصاب مال نہ ہو تو اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ اگر تقسیم کے

---

(١) شامی ٢/٢٦٢ (٢) شامی ٢/٢٦٠

کے بعد ہر شریک کے حصہ میں یا بعض شریک کے حصہ میں اتنا مال آتا ہو جو بہ قدر نصاب ہو تو ان شرکا، کے ذمہ اپنے اپنے حصوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، غرض کہ زکوٰۃ کے وجوب میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر شریک کے انفرادی حصے کا اعتبار ہوگا۔

" ولا تجب الزكوٰة عندنا فی نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة ۔ (۱)

قوله (فی نصاب مشترك) المراد ان يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم احد المالين إلى الآخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما بانفراده نصابا وقوله وان تعدد النصاب الخ أی بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحد بانفراده نصابا فانه يجب حينئذ على كل منهما زكوٰة نصابه ۔" (۲)

(۱۱)

جو حضرات سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کرتے ہیں اگر خریدتے وقت دل میں یہ نیت ہو کہ آئندہ کبھی اس کو بیچ کر روپے حاصل کریں گے تو وہ مال تجارت میں شمار ہو کر اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ بنانے کی نیت سے ہیرے جواہرات جو شخص خریدتا ہے لازمی نیت اس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ فروخت کرے گا، صرف ہیرے جواہرات جمع کرنے کی نیت سے نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر کوئی محض جمع کرنے کی نیت سے خریدے، آئندہ انھیں فروخت کرنے کی کہیں دور تک بھی نیت نہ ہو یا یہ نیت ہو کہ آئندہ اگر کوئی مصلحت یا نفع سمجھوں تو فروخت کردوں گا ورنہ اسے گھر میں جمع رکھیں گے، خواہ وہ کتنی بھی مالیت کے ہوں، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اور خواتین تزئین کے لیے جو ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں اس میں نہ حقیقۃً نمو ہے نہ دلالۃً اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

" ولا زكوٰة فی الجواهر واللآلی إلا ان يتملكها بنية التجارة كسائر

---

(۱) درمختار (۲) شامی ۲/۳۴ نعمانیہ

العروض (مراقی)، قوله ولا زكوٰة فی الجواهر الخ قال فی الدر الاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكی بنية التجارة عند العقد فلو نوی التجارة بعد العقد/ واشتری شيئا للقنية ناويا انه ان وجد ربحا باعه لازكوٰة عليه ۔ (۱)

(۱۲)

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے سالانہ زکوٰۃ نکالتے وقت اس کی مالیت کا تعین اس رخ سے ہوگا جو زکوٰۃ کی ادائے گی کے وقت بازار میں ہوگا، یعنی جس قدر نفع یا نقصان کے ساتھ بازار میں وہ سامان بکتا ہو اسی نفع یا نقصان کے ساتھ نرخ کا تعین کیا جائے گا۔ بازار کا بھاؤ خرید کی قیمت سے زیادہ ہو یا کم۔

" وعنده تعتبر قيمته يوم الوجوب قالا يوم الأدا، الخ ويقوم فی البلد الذی المال فيه ۔(۲)

وفی المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الأصح ۔ (۳)

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں چوں کہ خریدتے وقت ان کی نیت تجارت ہوتی ہے اس لیے وہ اراضی بھی اموال تجارت میں داخل ہوں گی اور ان کا حکم بھی یہی ہوگا، یعنی ان اراضی پر بازاری قیمت کا اعتبار کرتے ہوئے ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۴)

(۱۳)

اگر شیئرز کی قیمت نصاب کے بہ قدر یعنی ۵۲ ½ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہونچ جائے، یا شیئرز کے علاوہ دیگر نقد روپے یا مال تجارت مل کر شیئر ہولڈر نصاب کا مالک بن جائے تو اس کے ذمہ شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے، جس طرح اس کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ شیئرز کی قیمت میں چوں کہ کمپنیوں کی مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ کی لاگت بھی شامل ہوتی ہے (اور در حقیقت ان چیزوں میں زکوٰۃ واجب

---

(۱) طحطاوی علی مراقی الفلاح : ص ۳۹۱ (۲) درمختار

(۳) شامی ۳۰/۲، نعمانیہ (۴) حوالۂ مذکورہ ایضاً۔

نہیں) اس لیے شیرز کی زکوٰۃ نکالتے وقت کمپنی سے دریافت کرلیا جائے، جس قدر رقم شیرز کی مشینری، مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے، شیر ہولڈر اتنی قیمت شیرز کی کم کرکے زکوٰۃ نکالے، زکوٰۃ دیتے وقت شیرز کی جو قیمت ہوگی وہی نکالی جائے گی۔

"کالدراھم والدنانیر لعینھما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزکوٰة کیف ما امسکھما" (۱)

(۱۴)

فقہاء کرام نے چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، لہٰذا ۵۲½ تولے چاندی کی قیمت کے برابر کسی کے پاس مال ہو تو اس کو غنی قرار دیا جائے گا، اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہ ہوگا اور اس مال پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہاء کی تصریح کے پیشِ نظر اگر سونے چاندی کا نرخ برابر ہو تو کسی ایک کے نرخ کو اصل قرار دیا جائے گا، اگر دونوں میں سے کسی ایک کے نرخ سے مال نصاب تک پہونچ جاتا ہے تو اسی کا اعتبار ہوگا، غرض جس میں فقراء کا نفع ہو اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

"فی عروض التجارة قیمته نصاب من ذھب أو ورق أی فضة مضروبة فأفاد أن التقویم انما یکون بالمسکوك عملا بالعرف مقوما بأحدھما ان استویا فلو أحدھما أروج تعین التقویم به ولو بلغ بأحدھما نصابًا دون الأخر تعین ما بلغ به ولو بلغ بأحدھما نصابا وخمسًا بالأخر أقل قومه بالأنفع للفقیر" (۲)

(۱۵)

اگر مدرسہ والے ہر طالب علم کو ماہانہ جو خرچہ بیٹھتا ہے مثلاً ۲۵۰ روپے، وہ مدِ زکوٰۃ سے مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو دے دیں اور ان کو یہ سمجھادیں کہ تم پر ماہانہ ۲۵۰ روپے خرچ بیٹھتا ہے، تم کو نقدی شکل میں دیا جاتا ہے تم اس رقم کے مالک ہو، تم اپنے اختیار سے مدرسہ کے مطبخ میں جاکر اپنے کھانے کا وظیفہ جمع کردو یا کسی اور دفتر میں جمع کردو، طلبہ اس رقم کے مالک بننے کے بعد مدرسہ میں جاکر وہ رقم جمع کردیں تو یہ صورت

---

(۱) شامی ۲/۱۳ (۲) شامی ۲/۲۹۹

جائز رہے گی۔ زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور اس رقم کو تنخواہ وتعمیرات میں لگانا بھی درست ہوگا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ محض ہیرا پھیری نہ ہو، بلکہ واقعی تملیک ہو جانی چاہیے۔

(۱۶)

مدارس کے جو چندہ کی رقوم مدرسہ میں جمع کرتے ہیں، ان رقوم میں سے فی صد کے حساب سے سفراء کو کمیشن دینا جائز نہیں کیوں کہ یہ اجرت مجہول ہے، ماہانہ یا روزانہ، کوئی مقدار اجرت کی مقرر ومتعین نہیں، سفراء کو العاملین علیہا میں داخل کرنا درست نہیں، کیوں کہ عاملین وہ لوگ کہلاتے ہیں جو اسلامی ملک میں اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات وغیرہ کے وصول کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے شرط یہ ہے کہ بلا کسی عوض فقراء کو اس کا مالک بنا دیا جائے اور تنخواہ ایک عوض ہے، عاملین کے علاوہ کسی اور کو تنخواہوں کا بہ مد زکوٰۃ ادا کرنا صحیح نہیں، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

" ولا تصح (ای الاجارة) حتی تکون المنافع معلومة والاجرة معلومة۔[۱]

وفی الدر المختار وشرطها کون الاجرة والمنفعة معلومتين وفی رد المحتار اما الاول فکقوله بکذا درهم أودنانير" [۲]

---

(۱) هدایه ۲۴۳/۲ و ۲۷۰/۲ (۲) شامی ۵/۲

زکوٰۃ کے چند اہم مسائل

از: مولانا محمد طیب الرحمٰن صاحب امیر شریعت شمال مشرق ھند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

دوسری ہجری میں فرضیت رمضان کے قبل زکوٰۃ فرض کیا گیا۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ۳۲ جگہ میں نماز کے ساتھ ملاکر زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ نے بے شمار احادیث میں زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہیں جس سے زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت ثابت ہورہی ہے اس لیے زکوٰۃ کے مسائل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی شدید ضرورت ہے، خاص طور پر جن دقیق مسائل کے بارے میں سوال نامہ تیار کرتے ہوئے فقیہ عصر قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے ارسال کیا ہے ان کی تحقیق کرنا نہایت ہی ضروری ہے کیوں کر دور حاضر میں یہ مسائل کثیر الوقوع ہیں زمانہ کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوال نامہ تیار کرنے کی وجہ سے مفکر زماں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔

محور اول

زکوٰۃ تین قسم کے اموال میں واجب ہوتی ہے،

(۱) نقود (۲) سوائم (۳) اموال تجارت

" اعلم ان الزکوٰۃ لاتجب الا فی نصاب نام -اھ (شرح الوقایۃ ۲۱۸/۱)

وفی عمدة الرعایة، حاصله ان الزکوٰة لاتجب فی مال وان بلغ مقدار النصاب وحال علیه الحول ایضاً الا اذا وجد ثلثة اشیاء احدها الثمنیة اھ وثانیها السوم اھ وثالثها التجارة. اھ فما عداها إذا کانت بنیة التجارة تجب فیه الزکوٰة والا لا۔ (۱)

وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق اموال سے ہے ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد مملوک بہ اعتبار ملک اور قبض ہے۔ لما فی الجوہرۃ النیرۃ :

" لان الملك التام ما اجتمع فیه الملك والید۔ (۲)

وفی ردالمحتار: "لان المراد بالتام المملوك رقبة ویداً۔ (۳)

وفی بدائع الصنائع ، ومنها الملك المطلق وهو ان یکون مملوکاله رقبة ویداً وهذا قول اصحابنا الثلاثة الخ۔ (۴)

(۱) کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام یعنی ملک اور قبض شرط ہے، بناء علیہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوسکی ہے تو وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جاچکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس پر مشتری کا ملک بھی نہیں ہے اور قبض بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ مال جو مشتری کے ملک میں آچکا ہے لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بہ سبب ملک ناقص کے اور صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہوگی البتہ وجوب ادا قبض کے بعد ہوگا دین قوی کی طرح۔ وصول کے بعد ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

لما فی فتاویٰ عالمگیریؒ:[۵] "واما المبیع قبل القبض فقیل لایکون نصاباً والصحیح انه یکون نصاباً کذا فی محیط السرخسی۔

---

(۱) عمدة الرعایة ۱/۲۱۸ (۲) الجوهرة النیرة ۱/۱۱۲ (۳) ردالمحتار ۲/۵

(۴) بدائع الصنائع ۲/ ۹ (۵) فتاویٰ عالمگیری ۱/۸۸

نی البحر[1]: وقد منا ان المبیع قبل القبض لاتجب زکوٰته علی
المشتری وذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض
قیل لایکون نصابا لان الملك فیه ناقص بانتقاد الید والصحیح انه
یکون نصابا لانه عوض عن مال کانت یده ثابتة علیه وقد
امکنه احتواء الید علی العوض فتعتبر یده باقیة علی النصاب
باعتبار التمکن شرعا اه فعلیٰ هذا قولهم لاتجب الزکوٰة معناه
قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زکوٰته فیما مضی کالدین القوی
وفی شرح النقایة:[2] (مالک ملکا تاما) ای رقبة ویدا فلاتجب
علی المشتری فی مال اشتراه قبل القبض للتجارة الخ "

(۲) کرایہ دار مالک مکان کو کرایہ کی مد میں جو پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دیتا ہے جس کو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کرنا پڑتا ہے ایسی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دینا ضرورت کی طرف نظر کرتے ہوئے بیع بالوفا، پر قیاس کرکے جائز قرار دیا گیا ہے اور بیع بالوفاء میں مشتری بائع کو جو قیمت ادا کرتا ہے اس قیمت میں بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا مشتری پر اس میں ائمہ احناف کا اختلاف ہے۔ قول راجح یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی نہ کہ بائع پر اور مسئلہ مسئول عنہا میں کرایہ دار بہ منزلہ مشتری ہے اور مالک مکان بہ منزلہ بائع، بناء علیہ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ کی زکوٰۃ بھی قول راجح کی بنا پر کرایہ دار پر واجب ہوگی نہ کہ مالک مکان پر۔ لما فی رد المحتار: (۳)

"نعم یفتی به فیما دعت الیه الحاجة وجرت به فی المدة
المدیدة العادة وتعارفه الاعیان بلا نکیر کالخلو المتعارف
کالحوانیت وهو ان یجعل الواقف او المتولی او المالك فی الحانوت
قدرا معینا یؤخذ من الساکن الذی یثبت له الخلو ولا اجارتها

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۲۵ (۲) شرح النقایة ۱/۱۳۶ (۳) رد المحتار ۵/۲۲

لغيره مالم يدفع اليه المبلغ المرقوم فيفتى بجواز ذلك قياسا على بيع الوفاء الذي تعارفه المتأخرون احتيالا عن الربا حتى قال في مجموع النوازل اتفق مشائخنا في هذا الزمان على صحته بيعا لاضطرار الناس إلى ذلك ومن القواعد الكلية اذا ضاق الامر اتسع حكمه فيندرج تحتها امثال ذلك مما دعت اليه الضرورة

وفي رد المحتار[1]: قلت ينبغي لزومها على المشتري فقط على القول الذي عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزل منزلة الرهن وعليه فيكون الثمن دينا على البائع تأمل. الخ

(۳) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقوم جس کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام شرط ہے اور مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم اموال موقوفہ کی طرح ہے اس کا کوئی مالک معین نہیں ہے اور اموال موقوفہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لما في الفقه على المذاهب الاربعة[2]: "ولا زكوٰة في المال الموقوف"

(۴) مالِ حرام اگر مالِ حلال کے ساتھ مخلوط نہ ہوا ہے بلکہ وہ خالص مالِ حرام ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ اس پر اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ مال حرام کا مالک اگر معلوم ہے تو سارا مال مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ مالِ حرام اگر مالِ حلال کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو مال مخلوط سے مال حرام کی مقدار نکال کر اگر بہ قدر نصاب بچتا ہے تو باقی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بہ قدر نصاب نہیں بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ حرام خلط سے مستہلک ہو جاتا ہے اور مقدار مال حرام مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ لما في رد المحتار[3]:

(تحت قوله كما لو كان الكل خبيثا كما في القنية لو كان الخبيث نصابا

---

(۱) رد المحتار ۲/۷ (۲) الفقه على المذاهب الاربعة: ص۵۹۳ (۳) رد المحتار ۴/۳۴

لا یلزمه الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیه اھ وفی الدر المختار[1] وفی القهستانی ولا زکوٰۃ فی المغصوب والمملوك شراء فاسدا الخ والمراد مالم یخلطه بغیره لعدم الملك اھ وفی فتح القدیر[2]: ولهذا قالوا لو ان سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملکا له حتی وجبت علیه الزکوٰۃ و ورث عنه الخ وفی منحة الخالق علی البحر الرائق۔[3] ومن ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا و ان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیه فی تلك الاموال و ان بلغت نصابا لانه مدیون ومال المدیون لا ینعقد سببا لوجوب الزکوٰۃ عندنا و فی رد المحتار[4] و فی الفصل العاشر من التتارخانیة عن فتاوی الحجة من ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیه فیها وان بلغت نصابا لانه مدیون ومال المدیون لا ینعقد سببا لوجوب الزکوٰۃ عندنا اھ۔

(۵) دین کی زکوٰۃ فی الحال ادا کرنا دائن یا مدیون دونوں میں سے کسی پر واجب نہیں ہوتی۔ دائن پر اس لیے واجب نہیں ہوتی کہ اس کی ملک ہونے کے باوجود قبض نہیں ہے لہٰذا قبض کے قبل دائن کی ملک تام نہیں ہے اور مدیون پر اس لیے واجب نہیں ہوتی کہ مال اس کے قبض اور تصرف میں ہونے کے باوجود بھی اس پر اس کی ملک نہیں ہے، اگر مدیون کی ادائیگی کی قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرے اور اس کو تجارت میں لگا کر استفادہ کرتے رہے تو بھی مدیون پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس پر مدیون کی ملک نہیں ہے اور زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام یعنی ملک اور قبض دونوں شرط ہے۔

وصولیابی کے اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں۔

---

(۱) الدر المختار ۲/۶ (۲) فتح القدیر ۱/۴۸۲ (۳) بحر الرائق ۲/۲۲۱

(۴) رد المحتار ۲/۲۶

(۱) قوی (۲) متوسط (۳) ضعیف

(۱) دین قوی وہ دین ہے جو قرض یا مال تجارت کے بدلے بہ ذمہ مدیون عائد ہوا ہو۔

(۲) دین متوسط وہ دین ہے جو نقد یا مال تجارت کے علاوہ دوسری کسی قسم کے مال کے بدلے بہ ذمہ مدیون عائد ہوا ہو۔ جیسے لباس بذلہ خدمت کے عبد، رہنے کے گھر وغیرہ کی قیمت۔

(۳) دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی قسم کے مال کے بدلے میں بہ ذمہ مدیون عائد نہیں ہوا ہو۔ جیسے دین مہر، وصیت وغیرہ۔

دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے لیکن وجوبِ ادا اسی وقت ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کے مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس کے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا، لیکن وصول کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین متوسط کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کے دو قول ہیں، ایک قول کے مطابق دین متوسط کا حکم دین قوی کی طرح ہے مگر وجوب ادا چالیس درہم کی وصول یابی پر نہیں بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم کے وصول ہونے پر ہوگا اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دوسرے قول کے مطابق دین متوسط دین ضعیف کے حکم میں ہے یعنی وصول یابی کے بعد جب سال بھر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دونوں قول کی جانب تصحیح بھی موجود ہے۔ البتہ صاحب بدائع الصنائع نے دین متوسط کو دین ضعیف کے حکم میں اعتبار کرتے ہوئے اسی کو اصح قرار دیا ہے:

" نقول قسم ابوحنيفة الدين ثلاثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة - ومتوسط وهو بدل ماليس للتجارة كثمن البذلة وعبد الخدمة ودار السكنى وضعيف وهو بدل ماليس بمال كالمهر والوصية وغيره ففى القوى تجب الزكوٰة اذا حال الحول ويتراخى الاداء إلى ان يقبض اربعين درهما ففيها درهم وكذلما زاد فبحسابه وفى المتوسط لاتجب مالم يقبض نصابا وتعتبر

الماضى من الحول فى صحيح الرواية وفى الضعيف لاتجب مالم يقبض نصابا ويحول الحول بعد القبض عليه.(١)

وفى الفقه على المذاهب الاربعة(٢): ويعتبر حولان الحول فى الدين القوى من وقت ملك النصاب لامن وقت القبض فيجب اداء الزكوٰة بمجرد القبض بلاخلاف اما الدين المتوسط فانه لاتجب الزكوٰة الا اذا قبض منه نصابا فان كان الدين خمس مأة درهم مثلا و قبض مأتين وجب عليه ان يخرج خمسة درهم ولا يجب عليه فيما دون ذلك كما تقدم والدين المتوسط مثل الدين القوى فى حولان الحول عليه فيعتبر حوله بحسب الاصل لامن وقت القبض فى الاصح واما الدين الضعيف فانه يجب اداء الزكوٰة فيه بقبض نصاب منه بشرط ان يحول عليه الحول من وقت القبض

وفى بدائع(٣) الصنائع: واما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه إلى قوله وروى ابن سماعة عن ابى يوسف عن ابى حنيفة رحمهم اللّٰه تعالىٰ انه لازكوٰة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه.

وفى المبسوط(٤): وروى ابن سماعة عن ابى يوسف عن ابى حنيفة رحمهم اللّٰه تعالىٰ ان الدين نوعان وجعل الوسط كالضعيف وهو اختيار الكرخى على ماذكره فى المختصر.

---

(١) فتح القدير ١/٤٩١ (٢) الفقه على المذاهب الاربعة ١/٦٠٣
(٣) بدائع الصنائع ٢/١٠ (٤) المبسوط ١/١٩٥

(۶) پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کی جو رقوم جمع کی جاتی ہیں خواہ وہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم ہو یا سرکار یا کمپنی کی طرف سے اضافہ کی ہوئی رقم ہو یا رقم انٹرسٹ ہو وہ بذمہ سرکار یا کمپنی قرض ہے، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں، اس کے بارے میں حکم لگانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دین کے اقسام ثلٰثہ میں سے کس قسم کا دین ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے، اب دیکھنا چاہیے کہ خدمت کا معاوضہ یعنی اجرت مال ہے یا نہیں، پھر اگر مال ہو تو وہ مال تجارت کی منزل میں ہے یا مال غیر تجارت کی منزل میں امام ابوحنیفہ رحمہ سے اجرت کے بارے میں تین روایات مذکور ہیں، ایک روایت میں اجرت کو مہر کے مانند قرار دیا گیا کیوں کہ وہ حقیقۃً مال کا بدل نہیں ہے بلکہ وہ منفعت کا بدل ہے اور منفعت حقیقۃً مال نہیں ہے۔ اس روایت کی بنا پر وہ دین ضعیف ہوگا، دوسری روایت میں منافع کو من وجہ مال اعتبار کرتے ہوئے اجرت کو ثمن ثیاب بذلہ کے مانند قرار دیا، اس روایت کی بنا پر وہ دین متوسط ہوگا، تیسری روایت میں بدل منفعت کو بدل عین کی منزل میں اعتبار کرتے ہوئے اجرت ہو عبد تجارت کو ثمن متاع تجارت کی منزل میں اعتبار کیا گیا اس روایت کی بنا پر اجرت عبد تجارت دین قوی کے قبیل سے ہوگا۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اجرت عبد تجارت نہیں ہے بلکہ وہ اجرت حر ہے لہٰذا یہ دین دین قوی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ دین ضعیف ہوگا یا دین وسط ہوگا۔ دین متوسط ہونے کی تقدیر پر منافع کو مال کے قبیل سے شمار کرنا پڑتا ہے لہٰذا اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ کتاب البیوع میں ائمہ احناف کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافع مال کے قبیل شمار کیا جائے تو ائمہ احناف کے قول میں باہم تعارض پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کو دین ضعیف قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے، علاوہ بریں اصح روایت کی بنا پر دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے جس کے متعلق ماقبل میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ دین قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوتی ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بناء علیہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔ لما فی المبسوط، (۱۹۶/۱)

وفی الاجرۃ ثلاث روایات عن ابی حنیفۃ فی روایۃ جعلہا کالمھر لانھا لیست ببدل عن المال حقیقۃ لانہا بدل عن المنفعۃ وفی روایۃ

تناسل اور تجارت کے ذریعہ جو زیادت حاصل ہوتی ہے اسے نما، حقیقی کہتے ہیں، اور نما، تقدیری مال کا مالک یا اس کے نائب کے ہاتھ میں ہونے کو کہتے ہیں جس سے تجارت وغیرہ کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

لما فی رد المحتار[1]: النماء فی اللغة الزیادة الزکوٰة الخ وفی الشرع هونوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارة والتقدیری تمکنه من الزیادة بکون المال فی یده اویید نائبه ،،بحر،،

تیسری شرط حاجت اصلیہ

حاجتِ اصلیہ ایسی حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی ہلاکت کو دفع کرتا ہے، تحقیقاً ہو، جیسے کپڑا وغیرہ یا تقدیراً ہو، جیسے قرض وغیرہ اور حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا۔ لما فی الفقہ علی المذاہب الاربعۃ[2]:

"ویعتبر فی الراحلة ما یلیق بالشخص عادة وعرفا ویختلف ذلك باختلاف احوال الناس" الخ

چوتھی شرط دَین سے محفوظ ہونا

کون سا دَین مانع زکوٰۃ ہے؟ —— دین کی قسمیں اور ان کے احکام:

مانع وجوبِ زکوٰۃ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ دَین جو خالص بندہ کے لیے ہے اور بندوں کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا موجود ہے، جیسے قرض، ثمن، بیع وغیرہ۔

(۲) وہ دَین جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے لیکن بندہ کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا ہے، جیسے زکوٰۃ، خراج وغیرہ۔ اس کے لیے بندہ کی طرف سے طلب کرنے والا امام یا نائب امام ہے

---

(۱) ردالمحتار ۸/۲ (۲) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۶۲۳/۱

بمعنى حول ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس بمحل لوجوب الزكوٰة فيه والاصح ان اجرة دار التجارة اوعبد لتارة بمنزلة ثمن متاع التجارة كلما قبض منها اربعين تلزمه الزكوٰة اعتبار البدل المنفعة ببدل العين۔ (۱)

وفی البحر الرائق[۲]: ولو اجر عبده او داره بنصاب ان لم يكونا للتجارة لاتجب مالم يحل الحول بعد القبض فی قوله وان كان للتجارة كان حكمه كالقوی لان اجرة مال التجارة كثمن مال التجارة فی صحيح الرواية اھ۔

وفی منحة الخالق[۳]: وفی اجرة مال التجارة اوعبد التجارة روايتان فی رواية لازكوٰة فيها حتى يقبض ويحول عليها الحول لان المنفعة ليست بمال حقيقة فصار كالمهر، وفی ظاهر الرواية تجب الزكوٰة فيها ويجب الاداء اذا قبض منها مأتی درهم لانها بدل عن مال ليس بمحل لوجوب الزكوٰة فيه لان المنافع مال حقيقة لكنها ليس بمحل لوجوب الزكوٰة لانها لا تصلح لانها لاتبقی سنة اھ قلت وهذا صريح فی انه علی الرواية الاولی من الدين الضعيف و علی ظاهر الرواية من المتوسط لامن القوی لان المنافع ليست مال زكوٰة وان كانت مالا حقيقة تأمل ثم رأيت فی الولوالجية التصريح بان فيه ثلاث روايات۔

دوسری شرط نما

نما، کے لغوی معنیٰ زیادت ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، نما، حقیقی اور نما، تقدیری۔ توالد و

---

(۱) المبسوط ۱/۱۹۲ (۲) البحر الرائق ۲/۲۲۴ (۳) منحة الخالق ۲/۲۲۴

اور وہ اس طرح ہے کہ شروع اسلام سے حضرت عثمان غنی کے وقت تک زکوٰۃ امام المسلمین وصول کرتے تھے ان کے بعد کے دور سے ارباب اموال، اموال باطنہ کی طرف سے وکلاء کے طور پر ہیں۔

(۳) وہ دین جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کا طلب کرنے والا بندہ کی طرف سے کوئی نہیں ہے اگرچہ قیامت میں ان کا مطالبہ ہوگا، جیسے نذور، کفارات، حج وغیرہ۔ پہلے دو قسم کے دین مانع وجوب زکوٰۃ ہیں اور تیسری قسم دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔

اکثر ائمہ احناف کے نزدیک دین خالص للعباد معجل ہو یا مؤجل دونوں صورتوں میں مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ بعض کے نزدیک دین خالص للعباد اگر مؤجل ہو جائے تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ عورت کا مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عادۃً اس کے لیے بندہ کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے اور بعض نے یہ بھی بتایا کہ زوج کے ہاتھ میں جو نقد موجود ہے اسے اگر دین مہر ادا کرنا مقصود ہو تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا، ورنہ نہیں۔ صاحب ردالمحتار نے صاحب معراج سے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور قہستانی نے جواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ دین خالص للعباد کے بارے میں تین اقوال ہیں۔

(۱) معجل اور مؤجل دونوں مانع زکوٰۃ ہے۔

(۲) معجل مانع ہے مؤجل مانع نہیں ہے۔

(۳) اگر عزم ادا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

اور قہستانی نے جواہر سے ثانی قول کی ترجیح و تصحیح نقل کیا ہے نیز وجوب زکوٰۃ میں جو صورت انفع للفقراء ہے اس کی رعایت کرنے کے لیے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے اس لیے قول ثانی کو ترجیح دینا ہی ارجح ہے۔

سرکار اپنے شہریوں کو موجودہ دور میں طویل الاجل جو دین بہ صورت زراعتی قرض، صناعتی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض وغیرہ قرض دیتی ہے اور قسط وار ان کو ادا کرنا پڑتا ہے، وہ بھی دین خالص للعباد ہے اور اس میں کبھی مطالبہ صرف سالانہ واجب الادا قسط کا ہے اور مدیون کے ہاتھ میں جو نقد ہے اس سے سالانہ واجب الادا قسط کے علاوہ باقی رقم ادا کرنے کا عزم بھی نہیں ہوتا، بناء علیہ ایسے طویل الاجل قرضوں میں

اموال زکوٰۃ سے سالانہ واجب الادا، قسط وضع کرکے باقی اموال مقدار نصاب ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لما فی الفقہ علی المذاہب الاربعۃ[1]:

الحنفیۃ قالوا ینقسم الدین بالنسبۃ لذلک الی ثلثۃ اقسام الاول ان یکون دینا خالصاً للعباد۔ الثانی ان یکون دیناً للّٰہ تعالیٰ ولکن لہ مطالب من جہۃ العباد کدین الزکوٰۃ والطالب ھو الامام فی الاموال الظاھرۃ وھی السوائم وما یخرج من الارض اونائب الامام فی الاموال الباطنۃ وھی الاموال التجارۃ کالذھب والفضۃ ونائب الامام ھم الملاک لان الامام کان یأخذھا الی زمان عثمان رضی اللّٰہ عنہ ففوضھا عثمانؓ الی اربابھا فی الاموال الباطنۃ الثالث: ان یکون دینا خالصا للّٰہ تعالیٰ لیس لہ مطالب من جہۃ العباد کدیون اللّٰہ تعالیٰ الخالصۃ من نذور وکفارات وصدقۃ فطر ونفقۃ حج فالدین الذی یمنع وجوب الزکوٰۃ ھو دین القسمین الاولین الخ واما الثالث فانہ لا یمنع وجوب الزکوٰۃ۔

وفی بدائع الصنائع[2]: وعلی ھذا یخرج مہر المرأۃ فانہ یمنع وجوب الزکوٰۃ عندنا معجلا کان أو مؤجلا لانہا اذا طالبتہ یؤخذ بہ وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا یمنع لانہ غیر مطالب بہ عادۃ فیمنع وقال بعضہم ان کان الزوج علی عزم من قضائہ یمنع وان لم یکن علی عزم القضاء لا یمنع لانہ لا یعدہ دینا وانما یؤخذ المرء بما عندہ من الاحکام۔

وفی الدرالمختار[3]: فارغ عن دین لہ مطالب من جہۃ العباد سواء کان للّٰہ کزکوٰۃ وخراج اوللعبد ولو کفالۃ اومؤجلا ولو صداق زوجتہ

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱/۵۹۴ (۲) بدائع الصنائع ۲/۶ (۳) درمختار ۲/۴

المؤجل للفراق -

وفی الدر المختار[1]: تحت قوله أو مؤجلا عزاه فی المعراج إلی شرح الطحاوی وقال وعن ابی حنیفة لایمنع وقال الصدر الشهید لارواية فيه والكل من المنع وعدمه وجه زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیرمانع -

وفی فتح القدیر[2]: وهل یمنع الدین المؤجل کما یمنع المعجل فی طریقة الشهید لارواية فيه ان قلنا لا فله وجه وان قلنا نعم فله وجه ولوکان علیه مهرلامرأته وهو لایرید اداءه لا یجعل مانعا من الزکوٰة ذکره فی التحفة عن بعضهم ان کان موجلا لایمنع لانه غیر مطالب به عادة. انتهی وهذا یفید ان المراد المؤجل عرفا لا شرطا مصرحًا به والا لم یصح قوله لانها متی طلبت اخذته ولا بانه غیر مطالب به عادة لان هذا فی المعجل لا المؤجل شرطا فلامعنی لتقیید عدم المطالبة فیه بالعادة "

کمپنیز پر زکوٰۃ

کوئی بھی کمپنی متعدد شرکاء سے سرمایہ حاصل کرتے ہوئے جو کاروبار کرتے ہیں اس کاروبار کو چلانے کے لیے کمپنی عام طور پر سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت چلانے کے لیے ضروری اسباب مثلاً تعمیر مکان، آلات حرفت، بیع اراضی وغیرہ مختلف ایسی چیزوں کو خریدنے میں لگاتی ہیں جن کی عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت میں لگاکر نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ شرکاء اپنے اپنے حصہ کے مطابق تجارت کے اموال آمدنی آلات حرفت وغیرہ کے مالک ہوتے ہیں

---

(۱) الدر المختار ۲/۷ (۲) فتح القدیر ۱/۸۸

ایسی صورت میں نصاب وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ مجموعی مالیت پر کسی ایک کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس پر شرکاء بیں، سے ہر کوئی شریک ہے اور ہر فرد کی ملکیت اپنے انفرادی حصہ پر ہے لہٰذا کمپنی اپنے سرمایہ سے کسی حصہ کو آلات حرفت، تعمیر مکان وغیرہ اسباب جن کی عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے اسباب خریدنے میں اگر صرف کریں تو سرمایہ کے اسی حصہ کو علیحدہ کرتے ہوئے باقی سرمایہ میں شرکاء سے جس فرد کا جو حصہ رہے گا وہ اگر مقدار نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، کیوں کہ حالت انفراد میں جس شئی کا اعتبار کیا جاتا ہے حالت شرکت میں بھی اسی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ لما فی رد المحتار[1]؛

وکذلك آلات المحترفین ای سواء کانت مما لاتستهلك عینه فی الانتفاع کالقدوم والمبرد اوتستهلك لکن هذا منه ما لا یبقی اثر عینه کصابون وحوض لغسال ومنه ما یبقی کعصفر وزعفران لصباغ ودهن وعفص للدباغ فلا زکوٰة فی الاولین لان ما یأخذه من الاجرة بمقابلة العمل وفی الاخیرة الزکوٰة اذا حال علیه الحول لان المأخوذ بمقابلة العین کما فی الفتح۔

وفی البدائع[2]: ویعتبر فی حال الشرکة ما یعتبر فی حال الانفراد وهذا عندنا۔

ولما فی الدر المختار[3]؛ ولا تجب الزکوٰة فی نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فیه (الی ان قال) وان تعدد النصاب تجب اجماعًا ویتراجعان بالحصص وبیانه فی الحاوی فان بلغ نصیب احدهما نصابًا زکاه دون الاخر الخ۔[4] المراد ان یکون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم احد المالین الی الأخر بحیث لا یبلغ مال کل منهما بانفراده نصابا۔

---

(۱) رد المحتار ۲/۱۱ (۲) البدائع ۲/۱۶ (۳) الدر المختار ۲/۲۶ (۴) ایضاً ۲/۲۶

وایضا فی رد المحتار[1]: (وان تعدد النصاب) ای بحیث یبلغ قبل الضم مال کل واحد بانفراده نصابا فانه یجب حینئذ علی کل منہما زکوٰۃ نصابہ۔

وفی العالمگیریۃ[2]: فان کان نصاب کل واحد منہما یبلغ نصابًا وجبت الزکوٰۃ والا فلا سواء کانت شرکتہما عنانا اومفاوضۃ اوشرکۃ ملک بالارث وغیرہ من اسباب الملک۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی نیت سے کسی کی ملکیت میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لہٰذا کوئی اگر اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کی غرض سے ہیرے اور جواہرات خرید کر کے بدون نیت تجارت کے محفوظ رکھے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ لما فی مراقی الفلاح[3]:

ولا زکوٰۃ فی الجواہر واللآلی الا ان یتملکہا بنیۃ التجارۃ کسائر العروض۔

وفی الطحاوی[4]: قال فی الدر الاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ عند العقد فلو نوی التجارۃ بعد العقد او اشتری شیئا للقنیۃ ناویا انہ ان وجد ربحا باعہ لازکوٰۃ علیہ۔

وفی الجوہرۃ[5]: واما الیواقیت واللآلی والجواہر فلا زکوٰۃ فیہا وان کانت حلیا الا ان تکون للتجارۃ۔

وفی الدر المختار[6]: لازکوٰۃ فی اللآلی والجواہر وان ساوت الفا اتفاقا

---

(۱) رد المحتار ۲/۳۰۲ (۲) العالمگیریۃ ۱/۱۸۱ (۳) مراقی الفلاح ۱/۳۹۰

(۴) الطحاوی ۱/۳۹۱ (۵) الجوہرۃ ۱/۱۱۲ (۶) درمختار ۱/۱۸

الا ان تكون للتجارة والاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة إلى ان قال ولو نوى التجارة بعد العقد او اشترى شيئًا للتنمية ناويا انه ان وجد ربحا باعه لازكوٰة عليه۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے تاجر اگر اس مال کی زکوٰۃ نقد روپیہ سے ادا کرنا چاہے تو اس کی قیمت متعین کرنے کے وقت اگر تاجر کی لاگت کے حساب سے یا تھوک کے بھاؤ سے متعین کیا جاوے تو اس میں فقرا، کی رعایت نہ ہوگی، حالیکہ عندالشرع وہ مطلوب ہے لہٰذا اس کی وہ قیمت معتبر ہوگی جو دجوب کے دن عام طور رائج ومعروف ہو اور اس میں بھنکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا، نیز اموال اگر سائمہ میں سے ہو تو یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ لما فی الجوهرة النيرة[1]:

"ثم المعتبر فى القيمة عند ابى حنيفة يوم الوجوب ولايلتفت بعد ذالك إلى زيادة القيمة ونقصانها وعندهما يوم الاداء إلى الفقراء۔

وفى جامع الرموز[2]: لكن للمالك ولاية نقل قيمته يوم الاداء عندهما ويوم الوجوب عنده على ماقال بعضهم وقال آخرون فى السائمة العين ويجوز قيمته يوم الاداء وفى غيرها العين او قيمته يوم الوجوب۔

وفى الدر المختار[3]: وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفى السوائم يوم الاداء اجماعًا وهو الاصح ويقوم فى البلد الذى المال فيه۔

وفى رد المحتار[4]: وهو تصحيح للقول الثانى الموافق لقولهما و

---

(۱) الجوهرة النيرة ۱۲۳/۱ (۲) جامع الرموز/ ۱۳۹ (۳) درمختار ۳۰/۲ (۴) ردالمحتار ۳۰/۲

عليه فاعتبار يوم الا اء يكون متفقا عليه عنده وعندهما۔

کوئی اراضی کی خرید و فروخت کو اگر تجارتی کاروبار کے طور پر کرے تو بھی وہ اراضی اموال زکوٰۃ میں شمار نہیں کی جائے گی، کیونکہ اراضی پر عشر یا خراج واجب ہوتا ہے اس لیے اگر اراضی پر زکوٰۃ بھی واجب ہوجائے تو ایک ہی سبب پر دو حق لازم کرنا پڑتا ہے حالانکہ وہ عندالشرع جائز نہیں ہے۔

لما فی قاضی خان[1]: ولو اشتری ارض عشر او خراج للتجارة لايجب فيها الزكوٰة۔

وفی الكفاية حاشية على الهداية[2]: واما اذا اشترى شيئا لم يصلح فيه نية التجارة لا يصير للتجارة بان اشترى ارضا خراجية أو عشرية بنية التجارة فانه لا يجب فيها زكوٰة التجارة لانه لا يصلح فيه نية التجارة لانها لو صحت يلزم فيها حقان بسبب واحد وهو الارض۔

وفی الدر المختار[3]: والاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المودى الى الثنى۔ الخ۔

وفی رد المحتار[4]: (تنبيه) ماذكره الشارح من عدم وجوب الزكوٰة فى الارض العشرية للتجارة وانما فيها العشر او الخراج للمانع المذكور قال فى البدائع هو الرواية المشهورة عن اصحابنا (الى قوله) ووجه ظاهر الرواية ان سبب الوجوب فى كل واحد لانه يضاف اليها فيقال انه عشر الارض وخراجها وزكاتها والكل حق الله تعالىٰ وهو حقوقه تعالىٰ المتعلقة بالاموال النامية لايجب فيها حقان منها بسبب مال واحد كزكوٰة السائمة مع التجارة اھ فافهم۔

---

(۱) قاضی خان: ص ۱۱۸ (۲) الكفايه حاشية على الهداية: ۲۶/۲

(۳) الدر المختار ۱۸/۲ (۴) رد المحتار ۱۸/۲

شیئرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی کے شیئر خرید کرنے کے معنیٰ اس کمپنی کی تجارۃ میں شریک ہونا ہے۔ اگر شیئر ہولڈر کو معلوم ہو کہ شیئر کی رقم کس صورت میں ہے تو ما قبل میں کمپنی پر زکوٰۃ کے زیر بحث وجوب زکوٰۃ کے بارے میں جو حکم بتایا گیا ہے شیئر کے بارے میں بھی وہی حکم ہوگا شیئر کی رقم کے بارے میں اگر یہ معلوم نہ ہو کر دہ کس صورت میں ہے تو اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نفع معلوم ہو تو اصل اور نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض دینے والا جو سرمایہ بونڈز پر لگاتا ہے وہ بذمہ حکومت یا کمپنی قرض ہے اور وہ دین قوی کے قبیل سے ہے ابنا، علیہ بونڈز کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہے گی، لیکن سال بہ سال ادا کرنا واجب نہ ہوگا بلکہ وصولی کے بعد ادا کرنا ہوگا، اس لیے بونڈز کے کیش کرانے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ ما قبل میں دین کی قسمیں اور دین کی زکوٰۃ کے حکم کے تحت دلائل ذکر کیا جا چکا ہے۔

محور ثانی نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کسی ایک کے نصاب کو اصل اور دوسرے کو فرع اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر ایک اپنے اپنے نصاب کے اعتبار سے مستقل ہے، لہذا سونے اور چاندی دونوں اگر علی الانفراد بقدر نصاب ہونے تو دونوں کو ایک ساتھ نہ ملایا جائے گا، بلکہ چاندی اور سونا ہر ایک کی زکوٰۃ علاحدہ علاحدہ ادا کریں۔ اگر چاندی اور سونا دونوں میں سے کوئی قدر نصاب نہ ہو یا دونوں میں سے ایک قدر نصاب ہو اور دوسرا قدر نصاب نہ ہو تو ضم لازم ہے یعنی ایک کے اصل کے ساتھ دوسرے کی قیمت کو ملایا جائے گا، سونا اور چاندی دونوں میں سے جس کی قیمت دوسرے کے ساتھ ملانے میں فقراء کے لیے انفع ہے ضم کے وقت اس کی رعایت کرنا واجب ہے نیز دونوں میں سے اگر ایک کو دوسرے کی قیمت کے ساتھ ملانے سے مقدار نصاب نہ ہو اور اس کے عکس پر مقدار نصاب ہو تو جس کی قیمت کو دوسرے کے ساتھ ملانے سے نصاب پورا ہوتا ہے اس کی رعایت کرنا بھی واجب ہے۔

لما فی رد المحتار: وفی البدائع ایضا ان ماذکر من وجوب الضم اذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان اقل فلو کان کل منهما نصابا

تاماً بدون زیادة لایجب الضم بل ینبغی ان یؤدی من کل واحد زکوته فلوضم حتی یودی کلہ من الذهب او الفضة فلاباس به عندنا ولکن یجب ان یکون التقویم بما هو انفع للفقراء رواجا والا یودی من کل منهما ربع عشره ـ (۱)

وفی بدائع الصنائع (۲): واذاکان تقدیرا لنصاب من اموال التجارة بقیمتها من الذهب والفضة وان تبلغ قیمتها مقدار نصاب من الذهب والفضة فلابد من التقویم حتی یعرف مقدار النصاب ثم بماذا تقوم ذکر القدوری فی شرحه مختصر الکرخی انه یقوم بادنی القیمتین من الدراهم والدنانیر حتی انها اذا بلغت بالتقویم بالدراهم نصابا ولم تبلغ بالدنانیر قومت بما تبلغ به النصاب وکذا روی عن ابی حنیفة فی الامالی انه یقومها بانفع النقدین للفقراء ـ

وفی بدائع الصنائع (۳): فاما اذاکان الصنفان جمیعا فان لم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان له عشرة مثاقیل ومأة درهم فانه یضم احدهما الی الآخر فی حق تکمیل النصاب عندنا ـ

وفی بدائع الصنائع (۴): وهذا الذی ذکرنا کله من وجوب الضم اذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان اقل من النصاب فاما اذاکان کل واحد منهما نصابا تاما ولم یکن زائدا علیه لایجب الضم بل ینبغی ان یودی من کل واحد منهما زکوته ولوضم احدهما الی الآخر حتی یؤدی کله من الفضة او من الذهب فلاباس به عندنا ولکن یجب ان یکون التقدیم بما هو انفع للفقراء رواجا الخ ـ

---

(۱) ردالمحتار ۲/۳۵ (۲) بدائع الصنائع ۲/۲۱ (۳) ایضاً ۲/۱۹ (۴) بدائع الصنائع ۲/۲۰

(۳) مصارف زکوٰۃ

(۱) مدرسہ اگر طالب علم کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرے اور یہ نظام مقرر کرے کہ فی کس طالب علم پر ان سہولتوں کی فراہمی میں جو خرچ عائد ہوتا ہے طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پاس سے اس رقم کو ادا کرے، مدرسہ فی کس طالب علم پر خرچ کا جو حصہ آتا ہے اگر حساب کرتے ہوئے اس کو بہ طور ماہواری فیس مقرر کرلے تو ایسی صورت میں جو طالب علم مصرف زکوٰۃ ہے اس کی طرف سے مقررہ فیس ادا کرنے کے لیے مدرسہ اگر مذکوۃ سے اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دے دے اور طالب علم وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردے تو یہ صورت جائز ہوگی۔ طالب علم نہ دے کر مدرسہ اگر یہ مقررہ فیس مذکوۃ سے ادا کرے تو یہ جائز نہ ہوگا کیوں کہ مہتمم مدرسہ کے پاس زکوٰۃ کی جو رقم ہے وہ عین ہے اور دین عین نہیں ہے اور عین کی زکوٰۃ غیر عین سے ادا نہیں ہوتی نیز عین کی تملیک ہر کسی کو کی جا سکتی ہے لیکن دین کی تملیک من علیہ الدین کے علاوہ دوسرے کسی کو نہیں کی جا سکتی۔

مہتمم مدرسہ یا ان کے نائبین کے پاس جو لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں وہ معلوم اور معین ہیں اور وہ لوگ اس نیت سے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دیتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کو مستحقین کے پاس پہونچا دیں گے، لہٰذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ مستحقین زکوٰۃ اگر کسی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ان کی طرف سے وکیل مقرر کریں تو وہ ان کا وکیل ہو سکتا ہے لیکن مستحقین کے عدم تقرر کی حالت میں کوئی شخص ان کا وکیل نہیں ہو سکتا، مدرسہ کے مستحقین طلبہ عادۃً مہتمم مدرسہ کو اپنی طرف سے وکیل نہیں بناتے نیز طلباء بھی ایک آتے ہیں تو دوسرے جاتے ہیں ایسی صورت میں مہتمم مدرسہ مستحقین طلبہ کی طرف سے وکیل نہیں ہو سکتا۔

فی بدائع الصنائع[1]: وان کان مال الزکوٰۃ دینا فجملۃ الکلام فیہ ان اداء العین عن العین جائز بان کان لہ ما ئتا درھم عین فحال علیھا الحول فادی خمسۃ منھا لانہ اداء الکامل عن الکامل فقد ادی

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۴۲

ما وجب عليه فيخرج عن الواجب وكذا اذا ادى العين عن الدين بان كان له مائتا درهم دين فحال عليها الحول و وجبت منها الزكوٰة فادى خمسة عينا عن الدين لانه اداء الكامل عن الناقص لان العين مال بنفسه وماليته لاعتبار تعينه فى العاقبة وكذا العين قابل للتمليك من جميع الناس والدين لا يقبل التمليك لغير من عليه الدين واداء الدين عن العين لا يجوز بان كان له على فقير خمسة دراهم وله مائتا درهم عين حال عليها الحول فتصدق بالخمسة على الفقير ناويا عن زكوٰة المائتين لانه اداء الناقص عن الكامل فلا يخرج عما عليه والحيلة فى الجواز ان يتصدق عليه بخمسة دراهم عين ينوى عن زكوٰة المائتين ثم يأخذها منه قضاء عن دينه فيجوز ويحل له ذلك ـ

وفى الطحطاوى[1]: واعلم ان اداء الدين عن المال الذى عنه لا يصح والحيلة ان يعطى المديون زكوٰته ثم يأخذها عن دينه الخ

وفى العالمگيرية[2]: ولو قضى دين الفقير بزكوٰة ماله ان كان بامره يجوز وسقط الدين ـ

وفى قاضى خان[3]: ولو دفع قوم زكوٰة اموالهم الى من يأخذ الزكوٰة لفقير فاجتمع عند الاخذ اكثر من مأتى درهم فقالوا كل من اعطى زكوٰته قبل ان يبلغ ما فى يد الاخذ مأتى درهم جازت زكوٰته ومن اعطى بعد ما اجتمع عند الاخذ مأتى درهم لا يجوز الا ان يكون الفقير مديونا هذا كان الاخذ اخذ الاموال بامر الفقير فان اخذ بغير امره جازت الكل لان الأخذ اذا لم يكن بامر

---

(١) الطحطاوى: ص ٤٢ (٢) العالمگيرية ١/٩٤ (٣) قاضى خان ١/١٢٥

الفقير كان الاخذ وكيلا عن الدافعين فما اجتمع عند الاخذ يكون مال الدافعين فجازت زكوٰة الكل الخ -

و ايضاً فى قاضى خان[1]: الوكيل كيد المؤكل و دفعه كدفع المؤكل فاذا نوى الزكوٰة كان عما نوى-

وفى فتح القدير[2]: من فروعها قوم دفعوا الزكوٰة إلى من يجمعها لفقير فاجتمع عند الاخذ اكثر من مأتين فان جمعه له بامره قالوا كل من دفع قبل ان يبلغ ما فى يد الجابى مأتين جازت زكوٰته ومن دفع بعده لايجوز الا ان يكون الفقير مديونا فيعتبر هذ التفصيل فى مأتين تفضل بعد دينه فان كان بغير امره جاز الكل مطلقا لان فى الاول هو وكيل عن الفقير فما اجتمع عنده يملكه وفى الثانى وكيل الدافعين فما اجتمع عنده ملكهم.

وفى العناية[3]: وانما قيد بدين الميت لانه لوقضى دين حى بامره وقع عن الزكوٰة كانه تصدق على الغريم فيكون القابض كالوكيل له فى قبض الصدقة -

وفى فتح القدير[4]: ومحمد هذا ان يكون بغير اذن الحى اما اذا كان باذنه وهو فقير فيجوز عن الزكوٰة على انه تمليك منه والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضا لنفسه

وفى بدائع الصنائع[5]: ولايجوز قبض الاجنبى للفقير البالغ العاقل الابتوكيله لانه لاولاية له عليه فلابد من امره كما فى قبض الهبة -

---

(۱) قاضى خان ۱/۱۲۲ (۲) فتح القدير ۲/۲۶ (۳) العنايه ۲/۲۰
(۴) فتح القدير ۲/۲۰ (۵) بدائع الصنائع ۲/۳۹

(۲) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کے تحت والعاملین علیہا کو بھی ذکر کیا ہے حسب تصریح فقہاء ومفسرین والعاملین علیہا میں وہی لوگ مراد ہیں جن کو امام المسلمین زکوٰۃ وعشر وصول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں، ائمہ احناف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ عاملین کو ان کے عمل سے قدر کفایت نفقہ دیا جائے گا، لیکن ان کے عمل کے نصف سے زائد دینا جائز نہیں ہے اور یہ اجرت کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور عملہ ہے۔ مدرسہ کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر ہوتے ہیں ان کا تقرر چونکہ امام کی طرف سے نہیں بلکہ مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے وہ والعاملین علیہا کے تحت داخل نہیں ہوں گے لہٰذا ان کو ان کے عمل کے عوض میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ بطریق اجرت ہے اور عامل کے عمل کی اجرت معلوم ہونا ضروری ہے کیونکہ اجرت اگر مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے اسی وجہ سے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ عامل کی اجرت اگر اس کے عمل کے ایک جزء کو مقرر کیا جائے تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بناء علیہ مدارس کی طرف سے محصلین زکوٰۃ وغیرہ کو اگر متعین شرح فی صد کمیشن دینے کی شرط پر مقرر کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ زکوٰۃ ادا ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ ایسے شخص کو مالک بنا دیا جائے جو مصرف زکوٰۃ ہو اور مالک بنانا بھی بلا کسی معاوضہ کے ہو، بناء علیہ زکوٰۃ کے آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے لیے مدرسہ کی طرف سے جو عملہ مقرر ہوتا ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔

لما فی بدائع الصنائع[1]: واما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم الامام لجبایۃ الصدقات واختلف فیما یعطون قال اصحابنا یعطیہم الامام کفایتہم منہا وقال الشافعیؒ یعطیہم الثمن ولنا انما یستحقہ العامل انما یستحقہ بطریق العمالۃ لا بطریق الزکوٰۃ بدلیل انہ یعطی وان کان غنیا بالاجماع ولو کان ذلک صدقۃ لما حلت للغنی الی ان قال لا علی سبیل الاجرۃ لان الاجرۃ مجہولۃ وفیہ ایضا وجہالۃ احد البدلین یمنع جواز الاجارۃ۔

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۴۴

وفی تفسیر روح المعانی[1]: تحت قولہ تعالیٰ والعاملین علیہا وھم الذین یبعثھم الامام لجبایتھا وفی الفقہ علی المذاھب الاربعۃ[2]: والعامل ھو الذی نصبہ الامام لاخذ الصدقات والعشور۔

وفی احکام القرآن للجصاص[3]: تحت قولہ تعالیٰ والعاملین علیہا ویدل ایضا علی ان اخذ الصدقات الی الامام۔

وفی البحر الرائق[4]: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للّٰہ تعالیٰ۔

وفی فتاویٰ عالمگیری[5]: ومنہا العامل وھو من نصبہ الامام لاستیفاء الصدقات والعشور کذا فی الکافی۔

وفی الدر المختار[6]: لو استأجر بغلاً لیحمل طعامہ ببعضہ اوثورا لیطحن برہ ببعض دقیقہ فسدت فی الکل لانہ استأجرہ بجزء من عملہ والاصل فی ذلک نہیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن قفیز الطحان۔

وفی الدر المختار[7]: دفع الزکوٰۃ الیٰ صبیان اقاربہ برسم عید اوالیٰ مبشر اومہد الباکورۃ جاز الا اذا نص علی التعویض۔

وفی العنایۃ علی الھدایہ تحت قولہ وھو الرکن[8]: لان الاصل فی دفع الزکوٰۃ تملیک فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ جزءا من المال مع قطع منفعۃ المدفوع عن نفسہ مقرونا بالنیۃ۔

---

(۱) روح المعانی ۱۲۱/۱۰ (۲) الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۶۲۱/۱ (۳) احکام القرآن للجصاص ۲/۳
(۴) بحرالرائق ۲۱۶/۲ (۵) فتاویٰ عالمگیری ۲۶/۱ (۶) درمختار ۳۸/۵
(۷) درمختار ۹۶/۲ (۸) العنایہ علی الھدایہ ۲۰/۲

مصرف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصارفِ زکوٰۃ کے بارے میں سورۂ توبہ کی جو آیت ہے اس میں کلمہ انما مذکور ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے اور یہاں پر حصر، حصر حقیقی ہے جو مختار ہے جمہور مفسرین اور فقہاء کا۔

(۲) آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکور فی سبیل اللہ سے غازی مراد ہے کیوں کہ کتاب و سنت میں جب فی سبیل اللہ کا استعمال مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد مراد ہوتا ہے، جیسا کہ جمہور مفسرین اور فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے۔

(۳) صحابہ کرام، تابعین مفسرین اور فقہاء کرام نے جب فی سبیل اللہ میں دو ہی قول ذکر کیا ہے تو اس میں تیسرا معنیٰ مراد لینا درست نہ ہوگا۔

(۴) فقہاء احناف کا قول راجح یہی ہے کہ عاملین کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر شرط ہے البتہ ایک اشکال یہاں رہتا ہے کہ ایسی صورت میں دوسرے مصارف کو ذکر کرنے کی بظاہر ضرورت ہی نہیں رہتی، للفقراء والمساکین کے تحت میں وہ داخل ہوجاتے ہیں۔

الف): فی سبیل اللہ کے مصداق غزاۃ ہیں۔

ب): فی سبیل اللہ کے مصداق جو لوگ ہیں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر شرط ہے۔

(۵) زکوٰۃ کے مصارف کی تعلیل کرکے اشتراک علّت کی بنا پر مذکورہ مصارف کے علاوہ دوسرے کو مصارف زکوٰۃ کے ساتھ ملحق کرنا درست نہ ہوگا۔

(۶) دورِ حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لیے جس طرح بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے ایسا ہی امت مسلمہ میں فقر و محتاجگی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے فقراء کی حمایت کے لیے بھی بے پناہ سرمایہ کی شدت سے ضرورت ہے اور نص قرآنی سے اموال زکوٰۃ میں ان کا حق ثابت ہورہا ہے اس لیے فی سبیل اللہ کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۷) احقر کے نزدیک زکوٰۃ کا مصرف فی سبیل اللہ میں فقہاء احناف کا قول راجح ہی مختار ہے۔

هذا ما سنح لی واللّٰه تبارك وتعالیٰ اعلم وعلمه اتم

زکوٰۃ کے مسائل

از ——— حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی، صدر المدرسین، اشرف العلوم، کنہواں

الحمد للہ وبہ نستعین والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ سید المرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد:

"اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا" نے اپنے پانچویں سیمینار منعقدہ اعظم گڈھ میں زیر بحث لانے کے لیے جن مسائل کو موضوع قرار دیا ہے، ان میں ایک مسئلہ زکوٰۃ بھی ہے۔

بلاشبہ ان سے متعلق جتنے بھی سوالات ترتیب دیئے گیے ہیں وہ اپنی جگہ اہم اور افادیت کے حامل ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی مسائل ہیں جو اپنی جگہ معروف ومعلوم اور کتب فقہ میں مصرح موجود ہیں، جس میں نہ اختلاف رائے کی کوئی گنجائش محسوس ہوتی ہے اور نہ دور حاضر میں وہ کسی نئے اجتہاد اور غور وفکر کے محتاج نظر آتے ہیں، اس طرح انہیں زیر بحث لانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس کے علاوہ ان میں ایسے بھی سوالات نظر آئے جن کے متعلق اختلاف رائے بہرحال لازمی ہے، کیونکہ اس کے سلسلے میں خود حضرات ائمہ کے مختلف اقوال صراحتاً ہماری کتب متداولہ میں منقول ملتے ہیں، مثلاً مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں۔

اس لیے ایسے مسائل میں تو اختلاف العلماء رحمۃ کے پیش نظر اسے مبتلی بہ کی ذاتی شرعی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ وقت ضرورت متدین علماء اور معروف صاحب فتویٰ، فقہاء کی طرف رجوع ہو کر ان کے فتویٰ پر کے عمل کرتا رہے، اپنے اس خیال واحساس اور مذکورہ بالا رائے کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سے متعلق بعض خاص سوالات کے سلسلے میں اپنے محدود مطالعہ وتحقیق کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا اور جس طرف اپنا رجحان ہوا اسے پیش کر دوں: ان اصبت فمن اللہ وان اخطأت فمنی ومن الشیطان۔

۱ ——— ایک تاجر بغرض تجارت بیع وشراء کرتا ہے، اور مشتری قیمت سپرد کر دیتا ہے لیکن مبیع اس کے قبضہ میں نہیں آتی ہے تو بائع پر اس مقبوضہ ثمن کی زکوٰۃ بشرط نصاب وحول بہرحال لازم ہو گئی:

"لکونہ مالکا بملک تام ای یدا ورقبۃ"۔

لیکن مشتری پر اس مبیع غیر مقبوضہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس میں فقہاء کی عبارتیں خود مختلف ہیں۔

اپنا خیال یہ ہے کہ اس میں قبضہ کے قبل تو زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، مگر بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی بشرط نصاب وحول واجب الاداء ہوگی، کیونکہ یہ بہرحال مال تجارت کے بدل کے طور پر مشتری کا ایک دین بذمہ بائع رہتا ہے جو دین قوی کے حکم میں ہے اور دین قوی میں حسب تفصیل فقہ بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

۲ کرایہ دار جو رقم بطور اجرت معجلہ مالک مکان کے حوالہ کرتا ہے، اس کی زکوٰۃ تو مالک پر بشرط نصاب وحول لازم ہو جائے گی۔

"لانہ ملك الاجرة بالتعجيل كلها"[۵۱]

"واذا عجل الاجرة لا يملك الاسترداد"[۵۲]

جیسی فقہی عبارتوں کا یہی مقتضا ہے۔

البتہ وہ رقم جو بطور ڈپوزٹ اور زر ضمانت، کرایہ دار جمع کرتا ہے اس کی زکوٰۃ بشرط نصاب وحول خود کرایہ دار پر واجب ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی ہوگی، کیونکہ یہ رقم یا تو امانت ہے یا بعد الاذن تصرف کے سبب قرض ورنہ کالمغصوب، بہرحال جب اس کی واپسی کا ظن غالب ہوگا تو دین قوی کا حکم رہے گا ورنہ مال ضمار کا حکم۔

اس رقم کو کالمرہون کہنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ ایک حق ثابت اور دین موجود کو ممکن الاستفاء اور سہل الحصول بنانے کے لیے جس چیز کو صاحب حق اپنے پاس محبوس کرتا ہے وہ شئے مرہونہ بنتی ہے، یہاں مالک مکان کا کوئی حق یا دین فی الحال کرایہ دار پر ثابت وموجود نہیں، وصول کرایہ کا حق تو حسب شرائط مہینہ اور سال کے اختتام پر ثابت ہوگا، ڈپوزٹ کی رقم صرف اس احتمال وامکان کی بنیاد پر جمع کی اور کرائی جاتی ہے کہ حسب معاہدہ وقت معہودہ پر اگر کرایہ مکان وصول نہ ہو سکے گا، تو اس رقم سے محسوب ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ ایک حق موہوم اور دین مظنون کے بدلے شئے محبوسہ کو رہن نہیں کہا جا سکتا، اس لیے اسے یا تو امانت کے لیے یا قرض یا کالمغصوب اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہونی چاہیے۔

---

۵۱ بحرالرائق ۲/ ۲۱۹۔

۵۲ شامی ۶/ ۱۰۔

یہاں اس کی وضاحت ہو جانی مناسب ہے کہ بلاشبہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تام ضروری ہے اور ملک کی تمامیت رقبۃً و یداً ہر دونوں طرح کی ملکیت پر موقوف ہے مگر ملک ید کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ میرے پاس اور میرے ہاتھ میں بالفعل موجود ہو، بلکہ جس چیز میں ہمیں شرعاً تصرف کا حق ہو ہم تصرف میں کسی کے اذن کے محتاج نہ ہوں، اور اس کا کبھی نہ کبھی مقبوضہ ہو جانا مظنون بظن غالب ہو، وہ حکماً مقبوضہ اور یداً مملوکہ ہی کہلائے گی، ورنہ دین قوی وغیرہ میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کو واجب الاداء کہنے کا کوئی جواز نہ ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ یہاں اس امر کا استحضار بھی ضروری ہے کہ شئے مرہونہ بقدر دین ہی مضمون ہوتی ہے اور اسی کے بقدر وہ مشغول بالدین مشغول بالحاجۃ ہونے کے سبب کالمعدوم قرار پاتی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ راہن پر بعد الاسترداد بھی واجب نہیں ہو پاتی ـــــــ لیکن کیا اس کا بھی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ کہ بشرط نصاب قدر دین سے زائد مالیت کی زکوٰۃ بھی بعد الاسترداد والانفکاک سنین ماضیہ کی واجب الادا نہیں ہوگی، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی سے ملک ید کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔

۳ ـــــــ کسی مال کا ایسا ہونا کہ اس کا کوئی مالک معین نہ ہو نہ معلوم الذات ہو نہ معلوم النوع والجنس اس کی نظیر شریعت میں نہیں "لا سیابۃ فی الاسلام" حدیث ہے، ہاں بیع بشرط خیار اس کی نظیر ہو سکتی تھی، مگر وہ بھی مختلف فیہ ہے، اس لیے سوال یوں کیا جائے کہ جس مال کا کوئی معلوم الذات معین مالک نہ ہو بلکہ معلوم النوع والجنس اور مجہول الذات مالک ہو جیسے کہ مال موقوفہ اور مدارس اسلامیہ جیسے اداروں میں جمع شدہ مال، تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا۔

چوں کہ مدارس اسلامیہ میں زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم پر مستحق زکوٰۃ طلبہ کی ملکیت ہوتی ہے سفراء اور نظماء مدرسہ کا قبضہ دراصل طلبہ مستحق کا قبضہ ہوتا ہے، سارے اکابر دیوبند اس کے قائل ہیں اور یہ معلوم النوع مگر مجہول الذات طلبہ اشخاص حقیقی نہیں، اشخاص حکمی ہیں، اس لیے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی۔

"لعدم تصور التعليك من الاشخاص الحكمية۔"

۴ ـــــــ مال حرام یا تو واجب التصدق ہوتا ہے یا اصل مالک پر واجب الرد، مال حلال کے ساتھ اس کا خلط گو بوجہ استہلاک موجب ملک ہے، مگر اس مقدار کا وہ متملک ضامن ہونے کے سبب مدیون بھی بن جاتا ہے، اس لیے بقدر حرام مشغول بالدین والحاجہ ہونے کے سبب کالمعدوم ہی ہوگا، اس لیے اس قدر حرام کے استثناء کے بعد صرف مابقی پر بشرط نصاب وحول زکوٰۃ واجب ہوگی،

"وھو ظاھر جداً مستفاد من عبارۃ الفقھاء، مثلاً ولو خلط السلطان المال المغصوب بمال ملکہ فتجب الزکوٰۃ فیہ ویورث عنہ (الی قولہ) وھذا اذا کان لہ مال غیر ما استھلکہ بالخلط منفصل عنہ یوفی دینہ والا فلا زکوٰۃ کما لو کان الکل خبیثاً"[1]

اور اس صورت میں ثبوت ملکیت کا ثمرہ صرف وراثت وتوریث میں ظاہر ہوگا، اور بس۔

۵۔۔۔۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، اس تفصیل وشرائط کے ساتھ جو فقہ کی تمام ہی کتب متداولہ میں صراحتاً موجود ہیں، دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف کی ماہیت وحقیقت کا بیان پھر ان کے درمیان سنین ماضیہ اور سنین آتیہ کے اعتبار سے وجوب ادا میں فرق کا مسئلہ، اسی طرح کس دین کے کس مقدار پر قبضہ کے بعد کسب سے وجوب ادا کا حکم ہوگا، اور اس سلسلے میں خود امام اعظم اور صاحبین کے درمیان میں اختلاف اور تعدد اقوال کی ساری بحثیں اور تفصیلات فقہی کتابوں موجود ہیں، اس کے نقل واعادہ کی کیا ضرورت۔

مدیون پر اس قدر دین کے زکوٰۃ واجب ہونے کی بات "لکونہ مشغولاً بالحاجۃ کالمعدوم" ہونے کے باوجود خلاف عقل ونقل ہے، البتہ اس دین سے اگر مدیون نے بذریعہ تجارت نفع حاصل کیا ہوگا تو بشرط نصاب وحول مال مستفاد کی طرح اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۶۔۔۔۔ سرکاری غیر سرکاری ملازمین کو ریٹائر ہونے کے بعد جو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملا کرتی ہے۔ وہ بہرحال ایک دین ضعیف کے حکم میں ہے اس کا حکم شرعی معلوم ومعروف ہے کہ بعد القبض بشرط نصاب وحول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۷۔۔۔۔ دین اور قرض کے درمیان جو جوہری فرق ہے اسے مستحضر رکھا جائے تو کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوسکتا کہ حکومت یا کمپنی سے بغرض تجارت حاصل کردہ طویل المیعاد قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں، اور نہ اس کے جواب میں دین مؤجل کے مانع ہونے نہ ہونے کے درمیان اختلاف ائمہ اور تعدد اقوال کی طرف ذہن بھٹکے گا، کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، جس میں لزوم نہیں، اس لیے اس کی تاجیل بھی صحیح ولازم نہیں؛ "التاجیل فی القرض باطل" جیسے اصول اور "کل دین حال اذا اجلہ صاحبہ صار مؤجلا القرض فان

---

[1] درمختار ۲/۳۳

تاجیلہ لا یصح[1] جیسی عبارتوں کا یہی اقتضاء ہے۔

اس لیے حکومت یا کسی سے بھی حاصل کردہ قرض کی رقم خواہ بظاہر وہ موجل ہی ہو، تکمیل نصاب میں یقیناً وہ مانع ہوگا۔ چنانچہ کمل قرض کے بقدر وضع کرکے ہی اس کے مالک نصاب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوگا

۸ ـــــ ہیرے جواہرات کی خریداری بغرض زینت و آرائش ہو یا مقصد اظہار تمول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر بغرض تجارت نہ ہو اور عملاً اس کی تجارت بھی کر رہا ہے تو اس میں بشرط نصاب و حول زکوٰۃ واجب الادار ہوگی۔ کما هو الظاهر، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جواہرات کی خریداری کرے یا کسی قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے اپنے سرمایہ کو ہیرے اور جواہرات وغیرہ (ملتقی طور پر اغیر نامی اشیار) کی شکل میں تبدیل کرے، اور فی الحال عملاً اس میں تجارت بھی نہیں کر رہا ہے، مگر اس کی نیت یہی ہو کہ مناسب موقع پر حسب احوال و مواقع سرّاً یا علناً فروخت کرلیں گے، تو ایسے جوہریوں کا کیا حکم ہوگا۔؟

میرا خیال یہ ہے کہ جو اس ارادہ سے خریدے اسے حکماً بغرض تجارت خریدار قرار دے کر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگنا چاہیے، اور ہمارے سمجھ کے مطابق سد ذرائع جیسے فقہی اصول کا یہی مقتضیٰ ہے ورنہ پھر اس حرص و ہوس کے افراط، بددینی اور خوف خداوندی سے عاری ماحول میں اسقاط زکوٰۃ کا ایسا حیلہ سرمایہ داروں کے ہاتھ آجائے گا، کہ بس الامان والحفیظ اور فقرار، مساکین تو تک تک دیدم دم نہ کشیدم کا منظر پیش کریں گے اس لیے نہ صرف دیانتاً بلکہ قضاءً بھی وجوب زکوٰۃ کا فتویٰ اور حکم ہونا چاہیے، سد ذرائع کے علاوہ دوسرے اہل کلی مثلاً "الامر اذا ضاق اتسع واذا اتسع ضاق" کا بھی یہی اشارہ ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

۹ ـــــ تجارتی اموال کے قدر و مالیت کے تحقیق میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟ اس میں حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے تو مولان حول یعنی وجوب ادار کے دن کی قیمت و نرخ کا معتبر ہونا منقول ہے مگر صاحبین فرماتے ہیں کہ اگر اسی دن ادا نہیں کیا تو پھر ادائے گی کے دن کی قیمت و نرخ کا اعتبار ہوگا، اور ہمارے خیال میں صاحبین ہی کا قول ایسر وارفق ہونے کے سبب لائق ترجیح ہے۔ اب وہ تاجر جس معیار کلے

---

[1] هدایہ ثالث / ۹۰۔

یعنی تھوک فروش ہے یا خردہ فروش وہ اپنے معیار و مقابل کے اعتبار سے ہی نرخ و قیمت کا حساب لگائے گا۔

۱۰۔ جو لوگ "اراضیات" کی تجارت کرتے ہیں، اگر وہ زمین عشری یا خراجی نہیں تب تو اس کی مالیت پر بشرط نصاب و حول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہونے میں کوئی اختلاف ہے نہ کوئی خفاء۔

البتہ اگر وہ زمین عشری یا خراجی ہوگی تو اس میں بظاہر اشکال ہوگا کہ عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم لگانے سے تضاعف حق اللہ لازم آئے گا، اور فقہی عبارت مثلاً "حقوق اللہ تعالیٰ المتعلقۃ بالاموال لا یجب فیہا حقان[1]" وغیرہ کے خلاف ہوگا، مگر اس سلسلہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ حضرت امام محمد علیہ الرحمۃ کی تحقیق و توجیہ کو راجح قرار دیتے ہوئے ان تجارتی اراضیات میں عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی لگنا چاہیے، یہ فرماتے ہیں کہ عشر و خراج کا محل دراصل پیداوار حقیقی یا حکمی ہوگا اور وجوب زکوٰۃ کا محل نفس زمین اور اس کی قیمت ہوگی، فلا یلزم کون حق اللہ مضاعفا فی محل واحد۔

محور ثالث

محور ثانی میں صرف یہی ایک سوال تھا کہ اموال تجارت کے نصاب متعین کرنے میں سونے چاندی میں سے کس کے نصاب کو اصل تسلیم کیا جائے؟ اور چوں کہ اس کا جواب انفع للفقراء کی روشنی میں واضح تر تھا اس لیے اس سے تعرض کیے بغیر محور ثالث کے سوالات پر غور کیا۔

۱۔ اس میں پہلا مسئلہ یہ غور طلب نظر آیا کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم اور ان کے ماتحت سفراء و محصلین مد زکوٰۃ کی رقوم پر کس حیثیت سے قابض ہوتے ہیں، چوں کہ جواہر الفقہ جلد چہارم صفحہ ۲۸۷ میں موجود مباحث و نقول سے یہ بات منقح ہو جاتی ہے کہ رجوع و اعتراف اور افادہ و استفادہ کے بعد حضرات اکابر مثلاً حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری بلکہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ سب ہی لوگ بالاتفاق تسلیم کر چکے ہیں کہ مہتمم مدرسہ معطی و مستحق زکوٰۃ دونوں کے وکیل ہوتے ہیں اس لیے جیسے خود فقراء و مستحقین زکوٰۃ کے قابض ہونے کی شکل میں صرف قبضہ فقراء سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے،

---

[1] بدائع ۲/۵۷۔

ملک معطی سے وہ رقم نکل جاتی ہے اور معطی بری الذمہ ہو جاتا ہے، اسی طرح مہتمم اور اس کے مامور د ماتحت سفراء کے قبضہ میں آتے ہی معطی کی زکوٰۃ ادا شدہ بن جائے گی، کیوں کہ "ید الوکیل کید الموکل" مسلمہ قاعدہ شرعیہ ہے'

یہاں اس تفریع حکم کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ یہ مہتمم د سفراء معطی زکوٰۃ کے وکیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس لیے جس طرح خود معطی کو اپنی زکوٰۃ بلا تملیک فقراء کسی دوسرے مصارف خیر مثلاً تعمیر مساجد، بنا مدارس اور تکفین میت وغیرہ میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں، اسی طرح مہتمم حضرات بھی بلا تملیک اگر مصارف خیر میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے ——— اس طرح یہ مسئلہ ہمارے خیال میں مفروغ عنہا بن چکا ہے، ان حضرات اکابر کی اجتماعی رائے سے اب اختلاف کرنے کے بجائے اتفاق کر لینا ہی انشاء اللہ خیر قرار پائے گا۔

۲ ——— دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سفراء و محصلین کو منصوص مصرف زکوٰۃ "العاملین علیہا" میں داخل مان کر وہ زکوٰۃ سے انہیں تنخواہ دی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

اپنا خیال اور رجحان اس طرف ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ جواز کو تسلیم کر لینا چاہیے[۱]۔

یہ صحیح ہے کہ عاملین کا تقرر د انتخاب امیر و سلطان کی طرف سے ہوتا ہے جو مدارس کے سفراء کے حق میں بظاہر مفقود ہے مگر ملک ہندوستان میں جب خود امیر و قاضی کا تقرر د انتخاب ارباب حل وعقد کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور اس پر دور حاضر کے سارے معروف علماء کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے تو مدارس کے مہتمم حضرات جو اپنے اپنے دائرہ میں ارباب حل وعقد کے ہی منتخب و مقرر کردہ ہوتے ہیں ان کی حیثیت امیر کی کیوں نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری علیہ الرحمہ کی وہ تحریر جو حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے رفع اشکال کے طور پر ہمارے سامنے ہے وہ اس کی واضح دلیل کہی جا سکتی ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت (سیاست اور انتظام ملکی) جس کا ثمرہ تنفیذ حدود و قصاص ہے دوسرا نظم حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، لیکن امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد

---

[۱] کفایت المفتی ۴/ ۲۶۹۔

کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی انتظام مدارس جو برضار ملاک وطلبہ ابقار دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولی معتبر ہوگا[1]۔ بلکہ فتاویٰ خلیلیہ[2] میں ان کے الفاظ میں یہ صراحت ہے کہ اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کے الفاظ یہ ہیں، "چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہوکر فقراء کے وکیل ہیں، معطیین چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقراء تسلیم کرکے اپنا چندہ ان کے حوالہ کردیا[3]۔

بہرحال ان اکابر کی ان تحریروں سے بھی مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمۃ کے فتویٰ کی تائید ہی ہوتی ہے، اور جب ان حضرات کی تحریر سے سفراء کا مثل عمال ہونا اور عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہونا واضح ہو رہا ہے تو "اذا ثبت الشیٔ ثبت بلوازمہ" کے تحت ان کو مدزکوٰۃ سے عوض عمل بھی دینا جائز ہونا چاہیے، لیکن زمانہ حرص وہوس کا ہے، صبر وقناعت اور جذبۂ ایثار سے عام قلوب خالی ہوچکے ہیں اس لیے قدر کفاف کی تعیین وغیرہ میں باہمی نزاع واختلاف کا قوی اندیشہ ہے، اس لیے برضاء طرفین بطور تنخواہ اس کی پہلے ہی تعیین کی جاسکتی ہے، یہ محض تغیر اسم ہے تغیر مسمیٰ نہیں، درحقیقت یہ کفاف اور عمالہ ہی رہے گا۔

باقی رہا کمیشن کی اجازت دینا کہ کسی طرح صحیح طریقہ کار نہیں کہا جاسکتا، اس سلسلے میں عام طور پر اس کے عدم جواز کی جو دلیلیں بیان کی جاتی ہیں، گو ہمیں ان دلائل اور طرز استدلال سے کوئی انس اور مکمل اتفاق نہیں، مگر اس طریقہ کار کا کبھی مفضی الی الضرار ہوجانا لازم بلکہ معلوم ومشاہد ہے، اس کمیشن کی اجازت پر ہمیں کبھی شرح صدر نہیں ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳ــــــ اب رہا تیسرا مسئلہ "فی سبیل اللہ" کے مفہوم ومصداق کی تعیین کا، تو اس سلسلے میں حدیثاً وقدیماً بہت ساری بحثیں ہوچکی ہیں، اور ہر طرح کے رطب ویابس دلائل کا ایک انبار باخبر حضرات کے سامنے آچکا ہے، لیکن حق یہی ہے کہ نظریۂ تعمیم کے حاملین کی جتنی بھی پیش کردہ دلیلیں ہیں، بہ رنگ اجتہاد واستنباط ہیں، اس پر نقد وتبصرہ، توجیہ وتاویل سے قطع نظر کسی دلیل میں وہ قوت اور وزن نہیں جو نظریۂ تخصیص کے دلائل میں ہیں۔

اور اگر صحیح فیصلہ کی بنیاد قوت دلائل پر ہوا کرتی ہے، اور یقیناً ہوا کرتی ہے تو یہ بات طے شدہ

---

[1] امداد الفتاویٰ ۲۶۷/۹ [2] فتاویٰ خلیلیہ/۳۱۹ [3] جواہر الفقہ ۳۸۸/۴۔

سمجھنی چاہیے کہ قرآن پاک میں مصارف زکوٰۃ میں آئے ہوئے لفظ فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اور صرف جہاد عسکری ہے اور بس۔

یہ صحیح ہے کہ قرآنی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایتوں میں فی سبیل اللہ کا استعمال لغوی معنی میں بھی ہوا ہے اور یہ لفظ لغوی طور پر سارے ہی قربات وطاعات کو عام اور شامل ہے لیکن یہ بھی ایک زبردست سچائی اور حقیقت ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں جو فی سبیل اللہ آیا ہے وہ بطور منقول شرعی بلکہ منقول عرفی کی حیثیت سے جہاد عسکری کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے کہ سارے استدلال پر بھاری ہے شہادت اس کی۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اس لفظ کے مطلق استعمال کی صورت میں تبادر ذہنی صرف جہاد عسکری کی طرف ہوتا تھا، اور یہ مفہوم ومصداق عوام وخواص میں اتنا معروف تھا کہ از قبیل عوام ایک صحابیہ اور ایک صحابی جن کا کوئی علمی مقام معروف نہیں اور جن کی کوئی فقیہانہ امتیازی شان نہیں وہ بھی فی سبیل اللہ کا یہی مفہوم سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

آخر ابوداؤد کی روایت میں حضرت ام معقل کا جو واقعہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر حضرت ابومعقل سے سفر حج کے لیے اونٹ مانگا تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ اونٹ تو میں نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور صحابیہ اس عذر کو معقول سمجھتی ہوئی کوئی بحث واعتراض نہیں کریں اور نتیجتاً وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت سے محروم ہو جاتی ہیں، اس سے کیا یہ حجت قائم نہیں ہو جاتی کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فی سبیل اللہ کا مفہوم ومصداق جہاد عسکری ہی تھا، اور غالباً اسی عرف وتبادر اور منقول شرعی وعرفی ہونے کی بنیاد پر تابعین، تبع تابعین اور سارے ائمہ مجتہدین کا اس مفہوم پر اجماع ہو چکا ہے، اقوال شاذہ اور تفردات قابل اعتنا رکب اور کس مسئلے میں ہوتے ہیں کہ یہاں ان کی طرف ادنیٰ التفات کا جواز نکالا جائے، سلف وخلف کے اس اجماع کی صورت میں موجود ایک قطعی اور بدیہی دلیل کے مقابلہ میں دور حاضر یا ماضی قریب وبعید کے اصاغر واکابر کی محض اجتہادی واستنباطی اور صرف ظنی ونظری دلیلوں کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔" فیا عجب این تذھبون "

یہ صحیح ہے کہ ام معقل رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔" فہلا خرجت علیہ فان الحج فی سبیل اللہ " جس سے فی سبیل اللہ کے مصداق میں

یک گونہ عموم کا ثبوت ہوتا ہے، یہاں اس حدیث پر سنداً متناً بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دراصل ایک لفظ کے معنی لغوی اور سطح ظاہر سے استفادہ کی صورت ہے اور بس۔

آپ جیسے باخبر حضرات سے کون زیادہ واقف ہوگا کہ یہ بھی ایک معروف طرز استدلال ہے کہ بسا اوقات مختلف مصالح کی بنیاد پر آیت و روایت کی ظاہری سطح پر نظر رکھتے ہوئے اسے مواقع استدلال میں پیش کر دیا جاتا ہے، مگر درحقیقت آیت و روایت کا حقیقی انطباق مقصود نہیں ہوتا، اور اس کے نظائر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام اور فقہائے عظام سبھوں کے استدلال میں ملتے ہیں، مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رئیس المنافقین کے لیے دعا و استغفار کرتے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآنی آیت "استغفر لهم او لا تستغفر لهم ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم" پیش کرتے ہوئے آڑے آتے ہیں تو آپ جواب میں جو یہ فرماتے ہیں کہ مجھکو استغفار سے منع تو نہیں کیا گیا ہے" بلکہ بخاری کے الفاظ میں آپ جو فرماتے ہیں کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے انکی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا" یہ کون استدلال ہے؟ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ کی شکل ہے حقیقی انطباق نہیں۔

اور مثلاً حضرت ابن عباس رضؓ کے پاس ایک مسلمان آتا ہے جو قتل مسلم کا ارادہ رکھتے ہوئے قتل مسلم کے متعلق دریافت کرتا ہے تو آپؓ "من يقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤه جهنم خالدا فيها" کی آیت تلاوت کرتے ہیں، یہاں بھی مصلحتاً اور سداً لباب الفتنہ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ ہے، اسی طرح جب حضرت احنف بن قیس جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں تو ان کی ملاقات حضرت ابوبکرہ سے ہوتی ہے اور احنف بن قیس کے ارادہ پر مطلع ہو کر انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جو حضرت ابوبکرہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

"اذا التقى المسلمان بسيفيهما فالقاتل والمقتول في النار الخ"

یہ بھی اسی قبیل سے ہے ورنہ حضرت علی اور حضرت عائشہ وغیرہما اگر حضرات صحابہ پر جو ارباب حق کا محض اجتہادی خطا کے سبب قتال تھا، روایت کا انطباق ممکن نہیں، یہاں حضرت ابوبکرہ تقلیل فتنہ کی وقتی مصلحت کے سبب الفاظ کی ظاہری سطح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ روایت پیش کرتے ہیں اور بس۔

اور مثلاً فقہاء کرام جو لکھتے ہیں کہ اگر بحالت صوم غیبت کرنے کے ارادے سے کوئی مسئلہ

دریافت کرے تو جواب میں یہ حدیث سنا دیا جائے "من اغتاب فافطر" یہ استدلال بھی ظاہر ہے کہ روایت کا صحیح انطباق نہیں صرف مصلحتاً موقع استدلال میں پیش کر کے ظاہری سطح سے استفادہ ہے، الغرض اس طرح کے بہت سے نظائر ہیں، اس لیے اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام معقلؓ سے فان الحج فی سبیل اللہ" فرمایا تھا، تاہم مصرف زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے مفہوم و مصداق کے مختص بالغزوہ ہونے کی اجماعی رائے پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔

اور سچی بات یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے مختص بالجہاد العسکری ہونے کی سبب مضبوط اور جامع تر دلیل بس یہی اس کا عرفی و اجماعی ہونا ہی ہے دیگر سارے دلائل کے متعلق فیہ مافیہ کہا جا سکتا ہے مثلاً کلمۂ "انما" اگر حصر حقیقی کے لیے ہی ہو اور کوئی فی سبیل اللہ کو ہر قاضی، مفتی، عالم مشغول بخدمت الدین پر عام و شامل مان لے تو اس سے مصارف زکوٰۃ کے "اصناف ثمانیہ" کا حصر حقیقی کب ٹوٹے گا۔ اصناف تو اب بھی وہی آٹھ رہیں گے، ایک صنف کے صرف افراد بڑھیں گے، "ولا مانع من ذالك"؛ اسی طرح دوسرے دلائل کا بھی تجزیہ ممکن ہے، اس لیے اس سے زیادہ مزید کچھ کہنا لاحاصل یا تحصیل حاصل ہے۔

اجماع سلف صالحین کے خلاف آج فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیم کی کوشش، "اعاذنا اللہ، من یتبع غیر سبیل ... ین نولہ ما تولی و نصلیہ جہنم و ساءت مصیرا" کی وعید کا مستحق بنا سکتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہٗ۔ فقط

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

از: مفتی عزیز الرحمٰن مدنی دارالافتاء، بجنور (یوپی)

حامداً ومصلیاً، امابعد!

اسلام میں زکوٰۃ کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی نماز کی، قرآن پاک میں ان دونوں فریضوں کو ایک ہی ساتھ بیان فرمایا ہے۔ نماز اگرچہ ابتدا، اسلام یعنی لیلۃ المعراج ۱۲ نبوی میں فرض ہوئی تھی، لیکن اس سے قبل بھی نماز پڑھی جاتی تھی، چنانچہ سورہ مزمل ۳ نبوی میں نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ ایک ہی ساتھ ملتا ہے۔

"اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللّٰہ قرضا حسنا۔"

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض حسن دو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے تحریر فرمایا ہے:

"ایسے ہی زمانہ جاہلیت میں زکوٰۃ بھی تھی، اسی زکوٰۃ میں مہمان نوازی، مسافر نوازی، عیال پروری، مساکین پر صدقہ اور خیرات، صلہ رحمی، حوادث میں امداد، سب زکوٰۃ میں داخل تھے۔" (۱)

مفسر عمادالدین ابن کثیر نے تحریر فرمایا ہے:

---

(۱) حجۃ اللّٰہ البالغہ: باب ۲۔

" فرضیت زکوٰۃ مکہ میں ہو چکی تھی لیکن نصاب زکوٰۃ اور مقدار مخرج یہ مدینہ منورہ میں ہوا۔(۱)

اس تمہید سے غرض محض اس قدر ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی وہی اہمیت ہے جو نماز کی ہے، دونوں فرض ہیں، رکن ہیں اور اسلام کی بنیادیں ہیں۔ نماز کی طرح زکوٰۃ کے اصول و قوانین بھی ہیں، یہ بات دیگر ہے کہ نماز میں ان قوانین کو سنن، واجبات، فرائض کے ناموں سے یاد کیا ہے جب کہ زکوٰۃ میں نصاب زکوٰۃ، مقدار مخرج، مصرف اور اہلیت کے ناموں سے یاد کیا ہے، اس مقالہ میں بعض ان مسائل کا ذکر ہے جو موجودہ حالات اور ضروریات کے تحت اہم ہیں۔

نصاب زکوٰۃ

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے مالداری (صاحب نصاب ہونا) کی حد مقرر کی ہے مقررہ حد سے کم فقیر مستحق اخذ زکوٰۃ زکوٰۃ وصدقات ہے اور مقررہ حد یا اس سے اوپر کو مالداری یا غنی جس کو صاحب نصاب کہا جاتا ہے اس کے لیے اخذ زکوٰۃ وصدقات حرام ہے، اسلام نے یہ حد بندی چاندی اور سونے کے ذریعہ کی ہے جو آج تک برقرار ہے، جواہرات اور موتی، ہیرے وغیرہ قیمتی سے قیمتی دھاتوں کی قیمت کا تعین ان ہی دو چیزوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے اس وجہ سے ان تمام قیمتی اشیا، کو عروض تجارت میں شمار کیا ہے، بشرطیکہ وہ اسی غرض سے فراہم کیے گئے ہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

" لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفاً اتفاقاً الا ان یکون للتجارۃ"(۲)

وفی رد المحتار وفی نسخۃ الوفاً"(۳)

یہ جواہرات کسی شخصیت کے تمول اور قدآوری کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ٹی۔ وی، فرج وغیرہ، اس لیے زکوٰۃ میں مالداری کی حد بندی ان اشیاء سے نہیں بلکہ چاندی سونے سے ہوتی ہے سونے میں بیس مثقال اور چاندی میں دوسو درہم ہے لیکن موجودہ زمانہ میں نوٹوں کی ایجاد نے نوٹوں کو معیار قرار نہیں دیا بلکہ معیار وہی ہے یعنی چاندی سونا، اس وقت یہ فرق غیر متوازن ہو گیا ہے، جس زمانہ میں احکام زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ مقرر ہوا تھا اس وقت تو بیس مثقال برابر دوسو درہم تھے، لیکن اب نہیں ہیں

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۴/۴۳۹ (۲) درمختار (۳) ردالمحتار ۲/۱۴

اس لیے اب کسی کے پاس اگر دس مثقال سونا ہے اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوسو درہم چاندی کا حکماً مالک نہیں ہے، بے شک وہ مالک ہے بلکہ کچھ زائد کا مالک ہے اور صاحب نصاب ہے۔

(الف): اس وجہ سے کہ جس کے پاس دس مثقال یا ایک تولہ سونا ہے وہ کچھ نہ سہی دو چار کے نوٹ تو ضرور اپنے پاس رکھتا ہوگا۔

(ب): بالفرض اگر دو چار روپیہ بھی پاس نہ ہوں تب بھی وہ صاحب نصاب ہے کیوں کہ سونا نہ سہی چاندی کا نصاب تو قیمتاً پورا ہو ہی جاتا ہے۔

"من ذهب و ورق مقوما باحدهما (۱) - وفی رد المحتار: قوله تعيين تقويم به اى اذا كان يبلغ به نصابا كما فى النهر ويقوم فى البلد الذى المال فيه الى قوله يتعين ما يبلغ نصابا دون ما لا يبلغ نصابا فان بلغ بكل منهما او احدهما اروج تعين التقويم بالاروج" (۲)

ملکیت اور قبضہ

زکوٰۃ کے بیان میں دوسرا اہم مسئلہ ملکیت کا ہے اسی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ملکیت سے مراد کیا ہے؟ اس پر حضرات فقہاء کی بہت جامع و مانع تعریفات ہیں:

(الف) "الزكوة فى الشرع عبارة عن اخراج الحر المسلم البالغ العاقل اذا ملك نصابا ملكا تاما طائفة من المال إلى الصرف" (۳)

لیکن ملک تام سے مراد کیا ہے؟

(ب): الملك قيل هو القدرة على التصرف (۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ملک تام وہ ہے کہ مالک بھی ہو اور تصرف کی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قبضہ بھی ہو، اور قبضہ ہی وہ حقیقت ہے جو تصرف کا حق دیتا ہے، چنانچہ مہر قبل قبضہ کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

(۱) درمختار (۲) رد المحتار ۲/۲۱ (۳) البنایہ ۱/۱۱۵ مطبعہ نولکشور

(۴) البنایہ ایضاً

" اما الصداق قبل القبض فان بالعقد اصل الملك وتمام بما هو المقصود ولایحصل الابالقبض " (۱)

یعنی مہر کی ملکیت تو عورت کے لیے نکاح ہوتے ہی متعین ہو گئی لیکن چوں کہ قبضہ نہیں ہوا اس لیے اس کے تصرف کی قدرت بھی معدوم ہے بدیں وجہ عورت پر زکوٰۃ واجب نہیں اور مرد پر زکوٰۃ واجب ہونے کو عورت کی ملکیت مانع نہیں۔

" وعن ابی حنیفۃ رح لایمنع الی قولہ والصحیح انہ غیر مانع " (۲)

(ج): ایک اور مثال ملک کامل کی ملاحظہ ہو۔

" ویخرج ایضا المشتری للتجارۃ اذالم یقبض حتی حال علیہ الحول لازکوٰۃ فیہ اذالم یستفد ملک التصرف کمال الملک بکونہ مطلقا للتصرف " (۳)

" الملک التام الذی یکمل جمیع آثار الملک " (۴)

" المشتری للتجارۃ قبل القبض " (۵)

موجودہ زمانہ میں وہ اشیاء (خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی) جن کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے اگرچہ خریدار مالک ہو چکا ہے لیکن ملک ناقص ہونے کی وجہ سے ادائے گی زکوٰۃ میں باوجوب زکوٰۃ میں محسوب نہ ہوگی ——— یہیں سے ایک دوسرا مسئلہ بھی مستفاد ہوتا ہے (یعنی پراویڈنٹ فنڈ (جس کی تفصیل سوال ۲۶ میں مذکور رہے) پر زکوٰۃ کا معاملہ، اس مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اس فنڈ کی رقم اگر پیشگی طور پر کل رقم کا جزو لیا جاتا ہے وہ قرضہ ہوتا ہے جس کو صاحب فنڈ یعنی مالک ادا کرتا ہے، اس فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ میں سے وضع کر لیا ہے کہ وہ سرکار یا کمپنی کے ذمہ قرضہ ہوتا ہے اور جو اضافہ ہوتا ہے وہ امداد ہے جس کا مالک ملازم ملنے پر ہی ہوگا، یعنی بقدر تنخواہ حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور بقدر اضافہ جو ایک قسم کا قانونی وعدہ ہے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ ملک تام نہیں ہے۔

---

(۱) البنایہ ۱/۱۱۵۲ - الاشباہ ص۲۸ (۲) ردالمحتار ۲/۵ (۳) فتح القدیر ۱/۲۹۹

(۴) البنایہ (۵) ردالمحتار ۲/۵

مال مخلوط پر زکوٰۃ

یہیں سے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بینکوں اور ڈاک خانوں اور ایسے ہی پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود لگایا جاتا ہے اور یہ سب مال مل جاتا اور مخلوط ہو جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ جب اصل رقم کا اضافہ کردیا گیا تو کھاتہ دار کل رقم کا مالک ہو جاتا ہے لہٰذا کل رقم پر اس کو زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔

" ودخل ماملك بسبب خبيث كمغصوب خلطه الخ " (۱)

وفی رد المحتار: واما المملوك شراءً فاسدًا فهو مشكل لانه قبل قبضه غير مملوك وبعده مملوك ملكا تاما " (۲)

اس لیے کھاتہ میں سود کی رقم کا جو اضافہ ہوا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کیوں کہ ملک تام ہے اگرچہ اس کا سبب حرام ہے۔

مدارس اور اوقاف کے مال

ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے مدارس اور اوقاف کے اموال پر ایسے ہی بیت المال کے اموال پر اور ایسے ہی مسلم فنڈوں کے اموال پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔

" فلا زكوٰة فی سوائم الوقف والخيل المسبلة تقدم الملك ولا فی ما احرزه العدو بدراهم لانهم ملكوه بالاحراز عندنا خلافا للشافعی " (۳)

مصارف زکوٰۃ

منجملہ مصارف زکوٰۃ میں عاملین زکوٰۃ بھی زکوٰۃ کا مصرف قرار دیے گئے ہیں اور ان کو قرآن پاک نے مصرف قرار دیا ہے۔ زمانہ رسالت میں اور اس کے بعد بھی زکوٰۃ کی وصول یابی کا انتظام اور ایسے ہی اس کے خرچ کا انتظام اسلامی گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا ہے، گورنمنٹ اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو وصول

---

(۱) درمختار ۲/۵ (۲) ردالمحتار ۲/۵ (۳) ایضا ۲/۴

کراتی اور اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو تقسیم کراتی تھی، اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا تھا،
"ولو منعونی عقالاً" اگر مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو ان سے جہاد کیا جائے گا۔

یہ بھی مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظم انفرادیت پر آگیا، جس کی وجہ سے وہ اپنی اقتصادیات کے مسائل حل نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ فقہی اصطلاح میں تراضی مسلمین کے تحت ہر قریہ اور ہر بستی میں امیر یا قاضی کا تقرر جائز ہے اور طلاق و نکاح، رویت ہلال وغیرہ کے بارے میں اس کے فیصلے نافذ ہیں تو کیوں نہیں فریضۂ زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کے قیام کی طرف توجہ دی جاتی؟ غالباً اس میں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ یہ مدارس اور مکاتب کس طرح چلیں گے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس اشکال میں قومی اور اسلامی مفاد کے بجائے انفرادی منفعت زیادہ حائل ہے۔

عاملین زکوٰۃ یا محصلین زکوٰۃ کو اسلامی گورنمنٹ بقدر کفایت تنخواہ دیتی ہے اور یہ بقدر کفایت بقدر نصف سے زیادہ نہ ہوگا۔ عامل مالدار ہوں یا فقیر بہرصورت ان کو زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا اور یہ جائز ہے بشرطیکہ وہ خاندان رسالت میں سے نہ ہوں۔ صاحب مظہری نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے عاملین زکوٰۃ کو بھی اصناف فقراء میں شمار کیا ہے خواہ وہ مال دار ہوں یا فقیر کیوں کہ وہ اموال زکوٰۃ وصول کرنے میں فقراء کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں مشغول ہیں، اس لیے حکماً وہ بھی فقیر ہیں۔" (۱)

"لان الفقر شرط فی جمیع الاصناف إلا العامل والمکاتب وابن السبیل" (۲)

مصرف زکوٰۃ کی تمام قسموں میں فقیر ہونا شرط ہے مگر عامل، مکاتب اور مسافر کے لیے شرط نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ نے ایک صفحہ کے بعد یہاں تک تحریر کر دیا ہے:

"لایجوز دفع الزکوٰۃ إلی من یملك نصاباً إلا إلی طالب علم والغازی ومنقطع الحج لقوله علیه السلام یجوز دفع الزکوٰۃ لطالب علم وان کان له نفقة اربعین سنة" (۳)

---

(۱) مظہری ۲۳۲/۴ (۲) ردالمحتار ۵۸/۲ (۳) ردالمحتار ۵۹/۲

فی سبیل اللہ کے مفہوم کو متأخرین علماء نے اس قدر وسعت دی کہ بقول امام رازی وہ کفن موتی، تعمیر مساجد وغیرہ جمیع اصناف خیر کو فی سبیل اللہ سمجھنے لگے، لیکن حضرات حنفیہ کے نزدیک چوں کہ ادائے گی زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور یہ اشیاء اس مفہوم سے خالی ہیں اس لیے زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں۔

(الف): صاحب مظہری نے عاملین زکوٰۃ میں ایک علت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ چوں کہ فقراء کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں مشغول رہتے ہیں اس لیے بقدر نصف تک ان کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے۔

(ب): یہیں سے یہ بھی ایک مسئلہ مستفاد ہوتا ہے کہ معلمین علماء، اور اہل افتا، صاحب الدرس اور مہتمم مدارس صاحبان بھی طلبائے علم کے لیے مشغول ہوتے ہیں، اس لیے ان کو بھی زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں، جیسا کہ ردالمحتار کی مندرجہ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے، اس لیے میری رائے میں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کا استدلال وقیع معلوم ہوتا ہے کہ:

آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکورہ لفظ فی سبیل اللہ کے معنی اللہ کا راستہ ہے اور جہاد اگرچہ اللہ کے راستوں میں اہم ترین راستہ ہے، لیکن باب زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے حصہ کو مجاہدین کے ساتھ خاص کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ اس کا صرف کرنا ہر اس عمل پر جو اللہ تک پہونچنے کا ذریعہ ہوں جائز ہوگا۔

اس کے بعد نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"منجملة فی سبیل اللّٰه الصرف فی العلماء الذین یقومون بمصالح المسلمین الدینیة فان لهم فی مال اللّٰه تعالی نصباً سواء کانوا اغنیاء او فقراء بل الصرف فی هذه الجهة من اهم الامور لان العلماء ورثة الانبیاء وحملة الدین وبهم تحفظ بیضة الاسلام وشریعة سیدنا الامام" (۱)

حضرات علماء کرام کی اس عطا کردہ سہولت کو اگر عمومیت دی جائے تو تمام لیڈران عظام اور ہر ایک شخص ملت اسلامیہ کا خادم نظر آئے گا اور وہی مصرف زکوٰۃ قرار پاجائے گا۔ میرے نزدیک اتنی ڈھیل اور وسعت کسی طرح جائز نہیں ہے کیوں کہ نصوص کو خدا اور رسول کی عطا کردہ حدود سے زیادہ پر قیاس کرنا جائز

---

(۱) الروضة الندیة ۱/۲۰۷

نہیں ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ:

طلباء علم دین، محصلین زکوٰۃ، خدام اور اساتذہ طلبائے دین زکوٰۃ کا مصرف قرار پا سکتے ہیں لیکن وہ بھی بعض شرائط کے ساتھ، وہ شرائط ہیں امام کی جانب سے ان کا تقرر۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ یہ معنی حاصل نہیں ہیں، لیکن تراضی مسلمین کی قید نے جو مقتدر علماء اور مستند اور با اعتبار مسلم اداروں کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے۔

سوال نامہ کے اعتبار سے ایک اشکال اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ محصلین زکوٰۃ کو اگر تنخواہ دیں تو اتنا عمل نہیں تو کیا سکہ رائج الوقت کی طرح کمیشن پر مقرر کیا جا سکتا ہے اس میں محصل کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی فائدہ ہے۔

اس باب میں دو طرح پر جواب ہے ایک وجہ یہ کہ محصل کو بقدر نصف عمل کے زکوٰۃ کا مال دیا جا سکتا ہے اور کسی چیز کا نصف یا ثلث اسی وقت مقرر ہو گا جب وہ عمل وجود میں آئے گا، اس کے باوجود نصف زکوٰۃ تک محصل کو دینا جائز ہے اس میں دلیل ہے کہ کمیشن جائز ہے لیکن اگر اس کو اجارہ فاسدہ قرار دیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ عموم بلویٰ کی وجہ سے علماء بخاریٰ و بلخ نے اس قسم کے اجارہ کو جائز قرار دیا ہے۔

"قال فی التبیین ومشائخ بلخ والنسفی یجیزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل اهل بلدهم بذلك" (۱)

بتوفیق اللہ تعالیٰ میں عرض کرتا ہوں ہمارے دیار میں گیہوں کی فصل کی کٹائی پر یہ تعامل رہا ہے کہ بیس گڈیوں پر ایک گڈی مزدور کو دی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں مزدور نقد لینا پسند نہیں کرتا اور یہ تعامل سکہ رائج الوقت کی طرح رہا ہے اور اب بھی ہے اور اہل مدارس نے محصلین کی بدعنوانیوں کی وجہ سے کافی عرصہ سے کمیشن مقرر کرنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ تعامل عام بن گیا ہے، اس لیے مشائخ بلخ کی رائے کی تصویب زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ردالمحتار ۵/۴۶

سوالات کے جوابات

از: ــــــــــــــــ مفتی عبد الرحمٰن صاحب، دھلی

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

چار قسم کے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے۔
(۱) سونے چاندی پر (۲) تجارتی مال پر، خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ (۳) سائمہ جانوروں پر۔
(۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر جس کو عشر کہا جاتا ہے۔

س (۲): ملک تام سے یہی مراد ہے کہ مال مالک کی ملک میں ہو، یداً بھی اور رقبۃً بھی۔

(۱) لہٰذا وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہے مگر مال ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا، اس کی زکوٰۃ کی ادائے گی وصول ہونے سے پہلے واجب نہ ہوگی۔

"فلا تجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض" (۱)

جو قیمت ادا کی جا چکی ہے اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی۔ لانه ملكها يدًا ورقبة۔

(۲) کرایہ کی مد میں جو رقم پیشگی دی گئی ہے وہ اجارہ پر دینے والے کی ملک ہوگئی یداً بھی اور رقبۃً بھی، اس لیے وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، بشرطیکہ اجارہ کی مدت پوری ہوجائے اس سے قبل اجارہ فسخ نہ ہو۔

---

(۱) بحر ۲/۲۰۳

"وفی المحیط معزیا الی الجامع رجل لہ الف درھم لامال لہ غیرہ استاجر بہا دارا عشر سنین لکل سنۃ مأۃ فدفع الالف ولم یسکنہا حتی مضت السنون والدار فی ید الأجیر زکا الأجر فی السنۃ الاولیٰ عن تسع مأۃ وفی الثانیۃ عن ثمان مأۃ الا زکاۃ السنۃ الاولیٰ ثم یسقط لکل سنۃ زکاۃ مأۃ اخریٰ وما وجب علیہ للسنین الماضیۃ لانہ ملك الالف بالتعجیل کلہا(۱)"

ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس لیے واجب نہیں کہ اس پر اس کا قبضہ نہیں اور اس لیے بھی واجب نہیں کہ مکان حوائج اصلیہ میں سے ہے اور یہ رقم حوائج اصلیہ میں محبوس تھی کہ اس کے بغیر مکان کا میسر آنا ناممکن اور آجر پر اس لیے اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کہ وہ اس رقم کا مالک نہیں۔

س: (۳) وہ مال جو کسی شخص کی ملک نہیں ہے جیسے مدارس اور اداروں کے اموال، ان اموال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

فلازکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملك"(۲)

(۴) مال حرام جو اپنے پاس ہے اگر وہ اپنے مال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو واجب الرد نہیں تو واجب التصدق ہے۔

اور اگر مال حرام اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوگیا ہے کہ امتیاز مشکل ہے تو یہ استہلاک ہے جو امام صاحب کے نزدیک موجب ملک ہے، لیکن اس مال حرام کا ضمان اس صورت میں واجب ہوگا جو اس کے ذمہ دین ہوگا اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی بشرطیکہ اس کے علاوہ اتنا مال موجود ہو کہ اس مال حرام کا ضمان ادا کیا جاسکے اور اگر اس کے علاوہ مال نہیں ہے تو پھر زکوٰۃ اس کی واجب نہ ہوگی بلکہ مال حرام کو منہا کرنے کے بعد جو بچے اگر وہ نصاب کو پہنچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔

"ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ فتجب الزکاۃ

---

(۱) بحر ۲/۲۰۳ (۲) ردالمحتار ۲/۹

فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تمييزه
عند ابى حنيفة وقوله ارفق اذ قل ما يخلو مال عن غصب
وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه
يوفى دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما فى النهر" (۱)

(۵) ایسا دین کہ اس کا ثبوت دائن کے پاس موجود ہے یا مدیون اس دین کا منکر نہیں ہے اور اس کے وصول ہونے کی امید ہے اور دین قوی ہے یا متوسط ہے تو ایسی حالت میں دین کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ لازم ہے مگر بعد قبضہ کے۔ دین قوی میں تو چالیس درہم پر قبضہ کے بعد اور دین متوسط میں دو سو درہم پر قبضہ کے بعد۔ اور اگر دین ضعیف ہے تو اس کی زکوٰۃ دینا لازم نہیں، جب وہ قبضہ میں آجائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو مثل اور مالوں کے اس کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

لیکن اگر مدیون ٹال مٹول کر رہا ہے اس سے قرض کے وصول ہونے کی امید نہیں ہے وہ اقرار کے باوجود دیتا نہیں ہے اور دائن اس سے لینے پر قادر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس دین کی ماضی کی زکوٰۃ دائن پر وصولیابی کے بعد بھی واجب نہ ہوگی۔

" وقدمنا اول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتى إلى هذا
وقال بل فى زماننا يقر المديون بالدين وبملاءته ولا يقدر الدائن
على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم" (۲)

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم (یعنی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ سے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی وضع کرلی جاتی ہے اور اس پر بطور انعام حکومت اپنی طرف سے مع سود کے بڑھا کر دیتی ہے اس) رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جب یہ رقم وصول ہوگی اور اس پر سال گزر جائے گا (یا پہلے سے صاحب نصاب ہے تو جب اس کے نصاب کا سال ہوگا) تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لیے کہ تنخواہ سے وضع شدہ رقم جو قبضہ میں نہیں آئی ہے وہ خدمتِ حُر (آزاد) کا بدل ہے اور خدمتِ حر مال نہیں ہے اس لیے اس کا بدل دین ضعیف ہے اور دین ضعف کا حکم یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ

---

(۱) درمختار علی ردالمحتار ۲/۲۳ و ۲۴ (۲) شامی ۲/۸۵

واجب نہیں ہوتی۔

شرط ثانی نما ہے

نما لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں جس کی شرعاً دو قسمیں۔ تحقیقی و تقدیری۔ حقیقی نما وہ زیادتی ہے جو توالد و تناسل کے ذریعہ یا تجارت کے ذریعہ ہو، اور تقدیری نما یہ ہے کہ مال کے اپنے یا اپنے نائب کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے زیادتی پر قدرت ہو۔ کذا فی رد المحتار۔

تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ وہ ضرورت ہے جو جان یا آبرو سے متعلق ہو، یعنی اس کے پورا نہ ہونے سے جان کے یا آبرو کے جانے کا خوف ہو، تو جو چیزیں انسان سے ہلاکت کو دفع کریں حقیقتاً جیسے نفقہ اور رہنے کا مکان اور آلات حرب اور سردی و گرمی کے کپڑے یا تقدیراً جیسے دین کہ مدیون اس کی ادائے گی کی طرف محتاج ہے اپنے نفس سے حبس (قید) کو دفع کرنے کے لیے جو بمنزلہ ہلاکت کے ہے اور جیسے پیشہ کے آلات اور گھر کا سامان اور سواری اور کتابیں اہل علم کے لیے۔ لان الجہل عندھم کالہلاک۔ تو جو مال اپنی اصلی ضرورتوں سے زائد ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور جو مال ان اصلی ضرورتوں کے لیے ہو وہ مثل معدوم کے ہے اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

"وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ لان المشغول بہا کالمعدوم" (۱)

رہی نفس حوائج تو ان میں بدرجۂ اولیٰ زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ وہ حوائج اصلیہ میں سے ہیں اور نمو بھی نہیں ہے۔

"لکن کلام الھدایۃ مشعر بان المراد بہ نفس الحوائج فانہ قال ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمۃ وسلاح الاستعمال زکاۃ لانہا مشغولۃ

---

(۱) درمختار ۲/۶

بحاجة الأصلية وليست بنامية ايضاً" (ردالمحتار ۸/۲)

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

مال زکوٰۃ کا ایسے قرض سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ اللہ جل شانہ کا قرض ہو جیسے زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ کہ حق اللہ تو ہیں مگر ان کا مطالبہ امام وقت کی طرف سے ہوتا ہے یا وہ قرض بندوں کا ہو، جو مال اس قسم کے قرض میں مستغرق ہو یا اس قدر قرض ہو کہ اس کے ادا کرنے کے بعد نصاب پورا نہ رہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

دیون کی اقسام

امام صاحب کے نزدیک دیون کی تین قسمیں۔ قوی۔ متوسط۔ ضعیف۔

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض کسی کے ذمہ عائد ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہوا ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو اور دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بذمۂ مدیون عائد نہ ہوا ہو، جیسے دین مہر وغیرہ۔

دین قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کی مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن جب ادا کی جائے گی تو تمام سنین ماضیہ کا حساب کر کے ادا کی جائے گی، اور دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد بھی جب تک سال بھر نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوتی اور دین متوسط میں امام اعظم ابوحنیفہ رح سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس پر دین قوی کی طرح زکوٰۃ تو ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم یا اس کی مقدار مال جب وصول ہو اس وقت ادا کرنا لازم ہوگا، مگر ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ ایام ماضیہ واجب نہیں ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال بھر اس پر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور صاحب بدائع نے اسی آخری روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد جوابات درج ذیل ہیں۔

(۱) ایسا کثیر دین جو طویل الاجل ہے اور اس کی ادائے گی کی مدت قسط وار بیان کر دی گئی ہے 'جل ہیلاہ دین مؤجل کو اگرچہ بعض نے مانع زکوٰۃ قرار دیا ہے مگر صحیح یہی ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں قہستانی کے حوالے سے جواہر سے اسی قول کی تصحیح نقل کی ہے کہ دین مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

" زاد القہستانی عن الجواهر والصحيح انه غير مانع" (۱)

اس روایت پر جس قسط کی ادائے گی ہو رہی ہے وہ مانع بنے گی باقی قرض کا چوں کہ مطالبہ نہیں اس لیے مانع نہیں بنے گا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

ایسی کمپنی جس میں متعدد شرکا، ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں ان پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جس فرد کا انفرادی حصہ نصاب کو پہنچے گا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے زیورات ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر ہیرے اور جواہرات تجارت کے لیے ہیں تو اس صورت میں وہ مال تجارت ہوں گے اور ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"لا زكاة في اللآلی والجواهر وان ساوت الوفا الا ان تكون للتجارة" (۲)

واما اليواقيت واللآلی والجواهر فلا زكوة فيها وان كانت حليا الا ان تكون للتجارة. كذا في الجوهرة النيرة" (۳)

---

(۱) ردالمحتار ۲/۶ (۲) درمختار علی هامش ردالمحتار ۲/۱۶ (۳) عالمگیری ۱/۱۹۱

اموال تجارت پر زکوٰۃ

جو مال تاجر کے قبضہ میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں یوم وجوب کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یوم خرید کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا۔ زمین وجائداد جو تجارت کے لیے ہے ان کا یہی حکم ہے۔ یہ امام صاحب رح کا قول ہے اور صاحبین رح کے نزدیک یوم ادا کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ تاجر عام طور پر تھوک سے ہی خرید کرتا ہے تو اسی کے اعتبار سے اسٹاک کی قیمت لگائے گا، اور جو اشیاء پھٹکر سے خرید کی ہیں ان میں پھٹکر کی قیمت لگائے گا اور زکوٰۃ ادا کرے گا۔

"وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعاً" (درالمختار ۲/۳۰)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیرز ہولڈر نے جو روپیہ کمپنی کو دیا ہے وہ پوری رقم تجارت میں لگی ہوئی ہے اس میں سے اس کے حصہ کی وہ رقم جو مشنری کی خرید میں صرف ہوگئی ہے یا دیگر آلاتِ حرفہ (پیشہ) میں صرف ہوئی ہے اس تمام رقم کو منہا کر کے بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بشرط نصاب وحولان حول)۔ اگر مشنری میں صرف شدہ رقم کا علم نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا تو احتیاط اس میں ہے کہ پوری رقم کی زکوٰۃ ادا کردی جائے۔ جو رقم نفع کی آتی ہے اور وہ صرف ہونے سے بچ رہتی ہے اس پر (اگر وہ بقدر نصاب ہے اور سال گزر گیا ہے) زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈس جو بڑا قرضہ حکومت کو دیا گیا ہے اس کا حکم یہی ہے کہ وصولیابی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور یہ دین بھی دین قوی ہے۔ چالیس درہم یا ان کے بقدر روپیہ وصول ہونے پر زکوٰۃ کی ادائے گی لازم ہوگی۔ فقط واللہ اعلم۔

سوالات کے جوابات

از ـــــــ (حضرت مولانا عبد الجلیل قاسمی، مدرس مدرسہ جامعۃ اسلامیہ قرآنیہ سمرا، چمپارن)

الحمد لاهله والصلوٰة والسلام على حبيبه وعلى آله وصحبه اجمعين

اما بعد:

زکوٰۃ، سونا، چاندی، سامان تجارت اور سائمہ جانوروں میں واجب ہوتی ہے، ملک تام سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور اس سے انتفاع بھی ممکن ہو، علامہ کاسانی نے اس کو ملک مطلق سے تعبیر کیا ہے:

"وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويدا"[1]

سوال[1] ـــــــ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے اس میں زکوٰۃ تو واجب ہوگی لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے ادائیگی واجب نہیں ہوگی، قبضہ میں آنے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، علامہ شامی نے ملک تام کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وخرج به ايضا كما في البحر، المشترى للتجارة قبل القبض"[2]

پھر آگے درمختار کی عبارت:

"ولا فيما اشتراه للتجارة قبل قبضه" پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اما بعده فيزكيه عما مضى"[3]

---

[1] بدائع ۲/۹، شامی ۲/۲۵۹/۲۶۳، والمنتقى على هامش مجمع الانهر ۲/۱۹۳ [2] شامی ۲/۲۶۰،

[3] درمختار ۲/۲۶۳۔

سوال ۲ ______ کرایہ دار نے جو پیشگی رقم مالک مکان کو دیا ہے وہ دو قسم کی ہو سکتی ہے اوّل یہ کہ وہ پیشگی کرایہ ہو، دوم یہ کہ وہ زرِ ضمانت ہو جو عقدِ اجارہ کے فسخ ہونے یا مدّت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جائے گا، پہلی صورت میں اس کا مالک، مالک مکان ہوگا، اور اس کو ملک تام حاصل ہے، اس لیے اس قسم کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی، گرچہ صاحب بدائع نے ایک قول کرایہ دار پر بھی وجوب کا نقل کیا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے:

"ذكر الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل البخاري في الاجارة الطويلة التي تعارفها اهل بخارى ان الزكاة في الاجرة المعجلة على الأجر لأنه ملكه قبل الفسخ وان كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا انه يجب على المستاجر ايضاً لأنه يعد مالا موضوعا عند الأجر"[۱]

دوسری صورت میں چوں کہ اس کا مالک کرایہ دار ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی، قبضہ پانے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، جس طرح دوسرے تمام دیون میں ہوگا۔ علامہ کاسانی نے بیع الوفاء کے ثمن پر بحث کرتے ہوئے بائع اور مشتری دونوں پر وجوب زکوٰۃ کو نقل کیا ہے، علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے اپنا رجحان صرف مشتری پر وجوب کی طرف ظاہر کیا ہے:

"قلت ينبغي لزومها على المشتري فقط على القول الذي عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزل منزلة الرهن فيكون الثمن دينا على البائع"[۲]

پہلی صورت کی تائید اس بحث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ شامی نے کیا ہے کہ اگر کسی عورت کا نکاح ایک ہزار درہم پر ہوا اور عورت نے اس پر قبضہ پا لیا، اور اس پر سال گزر گیا تو اس صورت میں عورت پر زکوٰۃ واجب ہو گئی۔ اب اگر شوہر نے قبل الدخول طلاق دیدیا تو عورت نصف مہر شوہر کو واپس کرے گی، لیکن اس نصف کی زکوٰۃ اس سے ساقط نہیں ہوگی[۳]

سوال ۳ ______ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے:

"وهذا لان في الزكاة تمليكا والتمليك في غير الملك لا يتصور"[۴]

---

۱ بدائع الصنائع ۲/۶ ۲ شامی ۲/ ۲۶۱ ۳ شامی ۲/ ۳۰۶ ۴ بدائع ۲/ ۹ ۔

سوال ۴ ـــــــ جو مال کہ کسی کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، وہ کل واجب التصدق ہے، تمام کا صدقہ کرنا واجب ہوگا نہ کہ ایک جزء (زکوٰۃ) کا، یعنی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی:

"فی القنیة لوکان الخبیث نصابا لایلزمه الزکاة لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه"[۱]

اگر یہ حرام مال اس کے حلال مال میں اس طرح مخلوط ہوگیے کہ تمیز ممکن نہیں ہے تو حرام مال کے بقدر وضع کرنے کے بعد اگر باقی ماندہ مال نصاب کے برابر ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں:

"من ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰة علیه فیها وان بلغت نصابا لأنه مدیون ومال المدیون لاینعقد سببا لوجوب الزکوٰة عندنا فافاد بقوله وان لم یکن له سواها نصابا الخ ان وجوب الزکوٰة مقید بما اذا کان له نصاب سواها"[۲]

سوال ۵ ـــــــ دین کی زکوٰۃ بہرحال دائن پر ہوگی نہ کہ مدیون پر، مدیون کے ٹال مٹول کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کی جاسکتی، نہ دائن وجوب سے بری قرار دیا جاسکتا ہے، فقہاء نے دین کی جو تقسیم کی ہے، اس میں سے دین قوی اور متوسط کا اگر وصول پانا آج کل کے حالات کے اعتبار سے ممکن ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب وصول پائے گا گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا۔ اور اگر دین ضعیف ہو تو اس میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ پائے گا اس وقت اگر اس کے پاس نصاب ہوگا تو اس میں ضم کرکے زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر اس کے علاوہ نصاب نہیں ہوگا، تو جب نصاب کے برابر وصول پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا، تو زکوٰۃ ادا کرے گا، اگر آج کل کے حالات کے اعتبار سے دین کا وصول پالینا ممکن نہ ہو، تو قبضہ سے پہلے کسی قسم کے دین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی[۳]

سوال ۶ ـــــــ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا مالک ملازم ہوتا تو ہے، لیکن وہ رقم اس کے لیے ممکن الانتفاع نہیں ہے اور اگر وہ چاہے تو اس رقم کو استعمال میں نہیں لاسکتا، البتہ اس رقم کی بنیاد پر اس کو قرض تو

---

[۱] شامی ۲/۲۹۱ [۲] شامی ۲/۲۹۱ [۳] شامی ۲/ ۲۶۶، ۳۰۷، ۳۴۴۔

مل سکتا ہے جو پھر اس کی تنخواہ سے وضع ہو جائے گا، اگر وہی رقم اس کو ملتی، جس طرح تنخواہ کا باقی حصہ ملتا ہے، تو پھر اس کے وضع کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لیے اس پر قبضہ پانے سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جس وقت قبضہ پائے گا اگر اس کے پاس اس کے علاوہ نصاب ہوگا، تو اس میں ضم ہو جائے، ورنہ جب نصاب کے برابر پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اس رقم کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع کی لمبی عبارت نقل کرنے کے بعد پوری تفصیلی بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ دین ضعیف میں داخل ہے، قبضہ پانے کے بعد ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے[1]۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی عدم وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں[2]۔

دوسری شرط نما

"نما" کا معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے، یہ جانوروں میں توالد وتناسل کے ذریعہ ہوتا ہے اور دوسری اموال میں تجارت کے ذریعہ، اسامہ دودھ، گھی اور نسل کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، اور تجارت نفع کا سبب ہے تو سبب کو مسبب کی جگہ دی گئی ہے، جیسا کہ سفر نکاح اور نوم کو مشقت وطی اور حدث کے قائم مقام کر کے ان پر احکامات جاری کیے گئے ہیں، البتہ سونا، چاندی میں مطلقاً زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں تجارت کی نیت شرط نہیں ہے اگر زیور کی شکل میں ہو تو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؛

"هوان يكون معدا للاستنماء وذالك بالاعداد للاسامة في المواشي والتجارة في اموال التجارة إلا ان الاعداد للتجارة في الاثمان المطلقة من الذهب والفضة ثابت باصل الخلقة لانها لاتصلح للانتفاع باعيانها في دفع الحوائج الاصلية فلاحاجة إلى الاعداد من العبد للتجارة بالنية إذ النية للتعيين وهي متعينة للتجارة باصل الخلقة فلاحاجة إلى التعيين بالنية فتجب الزكاة فيها نوى التجارة او لم ينو اصلا اونوى النفقة"[3]

---

[1] إمداد الفتاوى ۲/ ۴۴، ۴۵ [2] فتاوى دارالعلوم ۶/ ۳۲۱، ۳۲۲ [3] بدائع ۲/ "

نصاب کے لیے نما تحقیقی جو اسامہ یا تجارت کے ذریعہ ہے ضروری نہیں ہے، بلکہ نما تقدیری بھی نصاب کی تکمیل کے لیے کافی ہے، علامہ شامی نے نما کی بحث میں لکھا ہے:

"هو نوعان حقيقى وتقديرى فالحقيقى الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقديرى تمكنه من الزيادة بكون المال فى يده او يد نائبه[1]"

(نام ولو تقديرًا) النماء اما تحقيقى يكون بالتوالد والتناسل والتجارات او تقديرى يكون بالتمكن من الاستنماء بان يكون فى يده او يد نائبه[2]"

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے جتنی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، مثلاً رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے سواری کے جانور وغیرہا، آج کل سواری کے لیے جیپ کار اور موٹر سائیکل بھی حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، ملک العلماء کی پوری بحث کا حاصل[3] ہے کہ نقدین کے علاوہ جو سامان بھی تجارت کے لیے بنے ہیں وہ حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں اور ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، میرے خیال میں ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے حوائجِ اصلیہ کا اعتبار کیا جائے گا۔[4]

چوتھی شرط

دین سے محفوظ ہونا، ہر وہ دین جس کا مطالبہ آدمی کر سکتا ہو، وہ مانعِ وجوبِ زکوٰۃ ہے[5] چاہے یہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا، چاہے یہ دین حال ہو یا مؤجل ہو:

"ومنها ان لا يكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا فان كان فانه يمنع الزكاة بقدره حالا كان او مؤجلا[6]"

---

[1] شامی ۲/ ۲۶۳ [2] مجمع الانہر ۱/ ۱۹۳ -

[3] شامی ۲/ ۲۶۲، بدائع ۲/ ۱۱ [4] بدائع ۲/ ۶ -

بیوی کا مہر وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں اس سلسلہ میں صاحب بدائع ۲/۶ اور صاحب مجمع الانہر ۱/۲۱۲ نے فقہاء احناف کے مختلف اقوال نقل کیا ہے، لیکن آج کے دور میں علامہ شامی کی نقل پر عمل ہونا چاہیے کہ بیوی کا مہر کسی حال میں بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع نہیں ہوگا :

"وعن ابی حنیفة لایمنع .... زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انهٗ غیر مانع[۱]"

آج کے دور کے طویل المیعاد قرضے بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں گے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر شخص کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نصاب کا مالک ہونا ضروری ہے جو نصاب کا مالک ہوگا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو مالک نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی :

"ولو كانت الفضة مشتركة بين اثنين فان كان يبلغ نصيب كل واحد منهما مقدار النصاب تجب الزكوٰة وإلاّ فلا ويعتبر فی حال الشركة ما يعتبر فی حال الانفراد[۲]"

لهذا الذی ذكرنا إذا كانت السوائم لواحد فاما اذا كانت مشتركة بين اثنين فقد اختلف فيه قال اصحابنا انهٗ يعتبر فی حال الشركة ما يعتبر فی حال الانفراد وهو كمال النصاب فی حق كل واحد منهما فان كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصابًا تجب الزكوٰة وإلا فلا[۳]"

پھر امام شافعی کا اختلاف اور دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"كل جواب عرفته فی السوائم المشتركة فهو الجواب فی الذهب والفضة واموال التجارة[۴]"

---

[۱] شامی ۲/۲۱۶ [۲] بدائع ۲/۱۶ [۳] بدائع ۲/۲۹ [۴] بدائع ۲/۳۰، شامی ۲/۳۰۴۔

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات کو اگر سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو بیچ کر ضرورت پوری کی جائے گی، یعنی خریداری و فروختگی کی نیت کے ساتھ ہے تو یہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر استعمال کے لیے خریدا ہے تو سونے چاندی کے علاوہ زیورات حوائج اصلیہ میں داخل ہیں یا نہیں مختلف فیہ ہے، مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو حوائج اصلیہ میں داخل ہونا چاہیے :

"سئل الحسن بن علی عمل لہا جواھر ولآلی تلبسھا فی الاعیاد وتتزین بہا للزوج ولیست للتجارۃ ھل علیہا صدقۃ الفطر قال نعم اذا بلغت نصاباً وسئل عنہا عمر الحافظ فقال لایجب علیہا شئ وحاصلہ ثبوت الخلاف فی ان الحلی غیر النقدین من الحوائج الاصلیۃ، واللہ تعالیٰ اعلم۔"[1]

صاحب درمختار نے وضاحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات میں، اگر تجارت کے لیے نہ ہوں، تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی :

"لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان سارت الفا إتفاقا الا ان تکون للتجارۃ۔"[2]

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین اس دن کی قیمت سے کیا جائے گا، میرے خیال میں تھوک بھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا۔

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں اگر وہ زمین شہر میں ہے، عشری یا خراجی نہیں ہے تو وہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور قیمت کا تعین زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن کی قیمت سے کیا جائے گا، اگر وہ زمین کاشت کی ہے، عشری یا خراجی

---

[1] شامی ۲/۲۴۸ [2] شامی ۲/۲۷۳۔

ہے تو علامہ کاسانی نے اس میں فقہاء کا اختلاف نقل کیا ہے، مشہور روایت کے مطابق اس زمین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ عشر یا خراج واجب ہوگا، تاکہ حق اللہ مضاعف نہ ہو جائے، مثال میں سائمہ مع التجارۃ کو پیش کیا ہے، یعنی اگر کسی کے پاس تجارت کے لیے جانور ہوں اور وہ سائمہ بھی ہوں، تو ان میں سائمہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ تجارت کا مال ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی :

"لو اسیمت للبیع والتجارۃ ففیہا زکوٰۃ مال التجارۃ لا زکوٰۃ السائمۃ[1] "

اسی طرح اگر کسی کے پاس عشری یا خراجی زمین ہو تو اس میں عشر یا خراج واجب ہوگا، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ورنہ حق اللہ مضاعف ہو جائے گا، امام محمد علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ ایسی زمین میں زکوٰۃ اور عشر یا زکوٰۃ اور خراج واجب ہوگا، وجہ یہ ہے کہ عشر پیداوار میں ہوگا اور زکوٰۃ قیمت میں ہوگی، اس لیے ایک مال میں دو حق جمع نہیں ہوں گے، میرے نزدیک امام محمد رحمۃ اللہ کا قول راجح ہے، جانور میں سائمہ اور مال تجارت کی زکوٰۃ واجب کرنے میں دو حقوں کے جمع ہونے کا امکان ہے، مثلاً کسی کے پاس اکتالیس بکریاں سائمہ تجارت کے لیے ہوں، اگر وہ سائمہ کی زکوٰۃ دے گا اور مال تجارت کی زکوٰۃ دے گا، تو بھی ایک بکری دے گا، اس طرح حق مضاعف ہو جائے گا، کیوں کہ سائمہ کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی ہوتی ہے اور مال تجارت کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی میں ہوتی ہے لیکن زمین میں زکوٰۃ کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے، عشر صرف منافع یعنی پیداوار میں ہے اور زکوٰۃ صرف قیمت یعنی اصل پونجی میں ہے، مثلاً اگر کسی کے پاس ایک زمین ہے جس کی قیمت ایک لاکھ روپے ہیں اور اس کی پیداوار دس کوئنٹل گندم ہے تو عشر صرف گندم میں ہوگا، اس کی قیمت میں نہیں، اور زکوٰۃ صرف اس کی قیمت میں ہوگی، گندم میں نہیں، تو یہاں دو حق ایک مال میں جمع نہیں ہوں گے، اس لیے اگر تجارت کے لیے عشری یا خراجی زمین ہے تو اس کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا :

"قال اصحابنا فیمن اشتری ارض عشر للتجارۃ او اشتری ارض خراج للتجارۃ فیہا العشر او الخراج ولا تجب زکوٰۃ التجارۃ مع احدھما ھو الروایۃ المشہورۃ منہم وروی عن محمد انہ یجب العشر والزکوٰۃ او الـ[illegible]

---

[1] بدائع ۲/۳۰ ۔

هذہ الروایۃ ان زکوٰۃ التجارۃ تجب فی الارض والعشر یجب فی الزرع وانھما مالامختلفان فلم یجتمع الحقائق فی مال واحد وجہ ظاھرالروایۃ ان سبب الوجوب فی الکل واحد وھوالارض الاتری انہ یضاف الکل الیھما یقال عشرالارض وخراج الارض وزکوٰۃ الارض وکل واحد من ذالک حق اللہ تعالیٰ وحقوق اللہ تعالیٰ المتعلقۃ بالاموال النامیۃ لایجب فیھا حقان منھا بسبب مال واحد کزکوٰۃ السائمۃ مع التجارۃ[1]"

علامہ شامی نے بھی اسی عبارت کو نقل کیا ہے[2]۔

نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں وجوب اور ادائیگی دونوں میں ان کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا، یعنی اگر صرف سونا ہے تو جب تک ۷½ تولہ نہیں ہوگا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً اگر صرف ساٹھ تولہ ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے اس کی قیمت سات سو تولہ چاندی کے برابر کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے ہی اگر صرف چاندی ہے تو ۵۲½ تولہ ہوگی تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں:

"فان کان لہ فضۃ مفردۃ فلا زکوٰۃ فیھا حتی تبلغ مائتی درھم وزنا وزن سبعۃ[3]۔ فاما اذا کان ذھب مفرد فلا شئ فیہ حتی یبلغ عشرین مثقالاً[4] والمعتبر وزنھما اداءً وجوبا لاقیمتھما[5]۔

اگر تجارت کا مال ہے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر چاندی سے خریدا ہے تو چاندی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر سونا سے خریدا ہے تو سونا سے دام لگایا جائے گا۔ ورنہ جو سکہ شہر میں زیادہ رائج ہوگا، اس سے دام لگایا جائے گا، امام محمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بہر دو صورت شہر میں غالب رائج سکہ سے دام لگایا جائے گا، لیکن آج کے دور میں جب کہ چاندی اور سونے کا سکہ معدوم ہے

---

[1] بدائع الصنائع ۲/۵۷ [2] شامی ۲/۵۰ [3] بدائع ۲/۱۶

[4] بدائع ۲/۱۸ [5] شامی ۲/۲۹۷۔

صاحبین کا قول قابل عمل نہیں ہے، اس لیے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے قول پر عمل ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ انفع للفقراء کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر سونا کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر چاندی کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا۔

"ذکر القدوری فی شرحہ مختصر الکرخی انہ یقوم باوفی القیمتین من الدراھم والدنانیر حتی انہا اذا بلغت بالتقویم بہا الدراھم نصاباً ...... وجہ قول ابی حنیفۃ ان الدراھم والدنانیر وان کانا فی الثمنیۃ والتقویم بہما سواء لکنا رجحنا احدھما بمرجح وھو النظر للفقراء والاخذ بالاحتیاط اولیٰ"[1] "ولو بلغ باحدھما نصاباً دون الآخر تعین ما یبلغ بہ"[2] "یقومہا بما ھو انفع للمساکین احتیاطاً"[3]

شیئرز اور باونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر وہ نصاب کے برابر ہو، لیکن شیئر کا جو حصہ عمارات وآلات میں لگا ہوگا، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور جو حصہ تجارت میں لگے گا اس پر اور اس کے نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر وہ شیئر زیادہ میں فروخت ہوتا ہے تو اس حصہ کے بقدر جو تجارت میں لگا ہے اور نفع ہوا ہے اس میں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور باقی حصہ عمارات وآلات کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً ایک شیئر سو روپے کا تھا، اس میں سے بیس روپے عمارات وآلات میں لگا، اور باقی اسی روپے تجارت میں لگا، اور پندرہ روپے نفع ہوا، تو اب تجارت والی پونجی ۹۵ روپے ہو گئی اور اسی میں زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، اب اگر وہ شیئر مثلاً دو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو ۹۵ روپے تو ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ایک سو پانچ روپے عمارات وآلات کے مقا[بلہ می]ں ہوگا اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ شیئر ایک سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو بھی ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ۹۵ روپے ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور پانچ روپے عمارات وآلات

---

[1] بدائع ۲/ ۲۱ [2] شامی ۲/ ۲۹۹ [3] ھدایۃ ۱/ ۱۸۵۔

کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی [۱]

بونڈس کی رقم دین قوی ہے، اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ قبضہ سے پہلے ادائیگی ضروری نہیں ہوگی، کیش کرانے کے بعد گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی۔

مصارف زکوٰۃ

۱ ــــــ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رقم طالب علم کے حوالہ کر دی جائے پھر وہ کھانے کی قیمت، مکان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات ادا کرے گا، جس طرح مستطیع طلباء ادا کرتے ہیں، از خود مکان کے کرایہ اور اساتذہ کی تنخواہ میں خرچ کر دینا صحیح نہیں ہوگا، مدرسہ کا مہتمم زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے نہ کہ طلباء کا۔

۲ ــــــ مدرسہ کے محصلین کو زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور مدارس میں کمیشن پر وصولی کرانا جائز ہے یا نہیں یہ دوسری بحث ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہا، لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں وہی عامل ہیں، اور ان کو زکوٰۃ کی مد سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے، اسلامی مدارس اور انجمنوں کے سفراء ان میں داخل نہیں ہیں، اور ان کو زکوٰۃ سے تنخواہ دینا جائز نہیں ہے [۲]۔

کمیشن پر وصولی کو فقہاء نے اجرت کے مجہول ہونے کی وجہ حرام کہا ہے، جواز کے لیے یہ وجہ دکھانا کہ تنخواہ پر وصولی کم ہوتی ہے اور کمیشن پر زیادہ یہ عذر لنگ ہے۔ وصولی میں کمی ذمہ داران مدرسہ کی آپسی چپقلس کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ خرابی کمیشن کا طریقہ اختیار کیے بغیر بھی دور کی جاسکتی ہے، مثلاً تنخواہ مقرر کیے جانے کے ساتھ وصولی کی ایک حد بھی مقرر کی جائے اور اس میں معمولی کمی زیادتی کو نظر انداز کر دیا جائے، غیر معمولی کمی کی صورت میں تنخواہ کم کر دی جائے یا ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے، کمیشن میں بھی

---

[۱] مستفاد از امداد الفتاوی جدید مبوب ۲/۲۱ [۲] معارف القرآن، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ ۴/۳۹۹۔

خرابیاں ہیں، اگر کوئی شخص یکمشت ایک بڑی رقم مثلاً دس ہزار روپے کسی محصل کو حوالہ کر دے تو ذمہ داران مدرسہ اس میں کمیشن دینا نہیں چاہتے ہیں، اور آپس میں بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کا مقصد غریبوں کی کفالت ہے، مالداروں سے ان کے مال کا ایک حصہ لیا جائے اور غریبوں پر خرچ کیا جائے:

"فی اموالہم حق معلوم للسائل والمحروم"۔

یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ جہاں کے مالداروں سے لی جائے وہیں کے فقراء پر خرچ بھی ہونی چاہیے، الا یہ کہ دوسری جگہ بھیجنے کے وجوہات قوی ہوں، زکوٰۃ کا مقصد مسلمانوں کی عمومی مصالح کی رعایت ہرگز نہیں ہے، آیت میں فقیر و مسکین کے ساتھ بعض دوسرے مصارف کا ذکر ہے تو اس لیے کہ وہ بظاہر فقیر محسوس نہیں ہوتے، مثلاً مسافر جس کے گھر پر دولت کی ریل پیل ہے، لیکن حالت سفر میں وہ کسی وجہ سے محتاج ہو گیا، تو اس کو زکوٰۃ دی جائے گی، حالانکہ وہ حقیقت میں فقیر نہیں ہے اس لیے اگر صرف فقیر و مسکین کا لفظ استعمال کیا جاتا، تو ایسے مسافر کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں تامل ہو سکتا تھا، ورنہ اگر فقر کی قید نہ ہو تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی لاکھوں کی دولت کے ساتھ سو کیلو میٹر اپنے وطن سے دور ہے اس کو زکوٰۃ کی رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسافر ہے اور مصرف زکوٰۃ ہے۔

اس لیے اگر احناف نے عاملین کے علاوہ تمام مصارف میں فقر کی بنیادی شرط لگائی ہے تو یہ انتہائی معقول ہونے کے ساتھ ضروری بھی ہے۔

فی سبیل اللہ کی تعیین میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اس سے کیا سمجھا، ہم لوگ اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ اگر قرآن کی تفسیر لغت کی مدد سے ہونے لگے، اور صحابہ وائمہ کرام کی تشریحات کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر قرآن کو تحریف سے بچانا مشکل ہو جائے گا، جو لوگ لغت کا سہارا لیکر فی سبیل اللہ میں ہر قسم کے کار خیر کو شامل کرنا چاہتے ہیں، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب مرحوم نے ان کو غلط کہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی بحث جو فی سبیل اللہ کے متعلق ہے نقل کر دی جائے:

ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے، یہاں پھر حرف فی کا اعادہ کیا گیا ہے، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیوں کہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو، مگر اس کے پاس اب مال نہ رہا ہو، جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اس لیے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لیے لیتے ہیں، اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ ان کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم و تبلیغ اور اس کے لیے نشر و اشاعت کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کر دی جائے مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جا سکتا"

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو فی سبیل اللہ کی تفسیر میں مذکور ہیں، فقر و حاجتمندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحب نصاب کا اس مد میں بھی حصہ نہیں بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لیے در پیش ہے۔ تو اگر چہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جب کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے مگر وہ بھی اس عبارت سے فقیر و حاجتمند ہی ہو گیا کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لیے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں۔

فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصرف ذکر کیے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجتمندی کی بنیاد پر مستحق ہیں، لفظ فقیر، مسکین میں تو یہ ظاہر ہی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بنا پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضہ خدمت دیا جاتا ہے، اس لیے اس میں غنی

وفقیر برابر ہیں، جیسے غارمین کے مصرف میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، کیوں کہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ

فی سبیل اللہ کے لفظی معنیٰ بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں، یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفاخانوں، مسافرخانوں وغیرہ کی تعمیر کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات، ان سب کو انہوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو سراسر غلط ہے اور اجماع امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے، ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں، ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو۔[1]

امام ابن جریر، ابن کثیر قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کیلئے مخصوص کیا ہے، جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو اور جن حضرات فقہاء نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و حاجتمند تو خود ہی مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ

---

[1] مبسوط سرخسی ۳/ ۱۰ ۔

اور فقہاء امت میں سے کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عامہ کے اداروں اور مساجد اور مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں۔ بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء احناف میں سے شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط اور شرح سیر اور فقہاء شافعیہ میں سے ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دردیر نے شرح مختصر خلیل میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفق نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

ائمہ تفسیر اور فقہاء امت کی مذکورۃ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے، تو اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات اور عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہوتو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارف صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کر سکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشاد نبویؐ بالکل غلط ٹھہرتا ہے معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے[1]۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

---

[1] معارف القرآن، مؤلفہ مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم، ۴/ ۴۰۶ تا ۴۰۹۔

سوالنامہ کا جواب

از: ـــــــ مولانا عبد الرحمٰن قاسمی، چھاپی گجرات

حامدًا ومصلّیًا ومسلّمًا۔

۱ ـــــ مال تجارت کی وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ (۱)

۲ ـــــ کرائے کے مد میں پیشگی دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ مؤجر مالک مکان پر واجب ہے اور ڈپوزٹ کی رقم مالِ مرہون ہے اور مالِ مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہے اور نہ مرتہن پر ہے، لہٰذا ڈپوزٹ رقم کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر ہوگی اور نہ مالک مکان پر، لیکن ڈپوزٹ کی رقم کرایہ دار کو واپس ملنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۳ ـــــ مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۴ ـــــ رشوت کا مال بینک کا سود وغیرہ حرام مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اور اگر اموالِ حرام حلال مال میں مخلوط ہو گئے ہوں تو اس مخلوط سے مالِ حرام کی مقدار نکال کر باقی اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

۵ ـــــ دین اگر قوی (جو قرض اور مالِ تجارت کا بدل) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر چالیس درہم کی مالیت

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۲

قبضہ میں کرنے کے وقت واجب ہے، نیز ایام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اگر متوسط (جو ایسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو جو تجارت کے واسطے نہ تھا اور نہ نقد قرض دیا تھا) اور ضعیف (جو مال کا بدل نہ) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر بعد قبضہ کے حولانِ حول پر واجب ہے۔

اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائے گی میں ٹال مٹول کر رہا ہے اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو تو اگر مدیون کے قرض کو منہا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب بچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، ورنہ نہیں۔

دین کی وصولیابی کی امید قوی یا غالب ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے، پھر اگر وہ دین قوی ہو تو اس پر عند القبض فیما مضی کی زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر دین متوسط یا ضعیف ہو تو بعد القبض حولانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو یا ضعیف امید ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۲ ـــــ پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر وصولیابی کے بعد سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دوسری شرط نما

وجوبِ زکوٰۃ کی ایک شرط نما (مال نصاب کا بڑھنے والا ہونا) ہے نما کی دو صورتیں ہیں، ایک حقیقۃً بڑھنے والا ہو، یعنی توالد و تناسل و تجارت سے بڑھنے والا ہو، دوسری صورت تقدیرًا (حکمًا) بڑھنے والا ہو، یعنی حقیقت میں تو بڑھنے والا نہ ہو، لیکن و، بڑھنے والے کے حکم میں ہو کہ اگر مالک اس کو بڑھانا چاہے تو وہ بڑھانے پر قادر ہو اس طرح پر کہ مال اس کے یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو پس جو شخص اس کے بڑھانے پر قادر نہیں، مثلاً مالِ ضمار اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ میں مشغول وہ مال شمار ہوتا ہے جو انسان کو حقیقۃً یا تقدیرًا ہلاک ہونے سے بچائے مجمع الانہر میں ہے:

" (حاجته الاصلية) اى عما يدفع عنه الهلاك تحقيقاً او تقديراً " (۱۹۴/۱)

حاجتِ اصلیہ کا تعین ہر دور اور ہر ماحول کے لحاظ سے ہوگا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

دین مانع زکوٰۃ سے وہ دین مراد ہے جس کا طلب کرنے والا کوئی بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو جیسا کہ قرض اور مول لی ہوئی چیز کی قیمت اور تلف کی ہوئی چیزوں کا ضمان یا زخمی کرنے کا تاوان ہو اور قرض چاہے نقد کی قسم سے ہو یا کیلی وزنی ہو یا کپڑے ہوں یا جانور ہوں یا خلع کے عوض ہیں واجب ہوا ہو یا عمداً قتل کرنے کے عوض میں صلح ہو کر واجب ہوا ہو اور وہ فی الحال دینا ہو یا کسی قدر مدت کے بعد دینا ہو، اور وہ قرض خواہ اصالۃً ہو یا کفالۃً ہو، اور خواہ وہ قرض اللہ کا قرض ہو، جیسا کہ زکوٰۃ اور خراج کا دین۔ بخلاف نذر اور کفارہ اور حج کے دین کے، اس لیے کہ ان قرضوں کا طلب کرنے والا کوئی بندہ نہیں اور اسی طرح صدقۃ الفطر اور حج تمتع کرنے والے کی ہدی اور قربانی کا دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین طویل الاجل جیسے زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض مانع زکوٰۃ ہے لہٰذا اموالِ زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدے ہوں یا تزئین و آرائش کے لیے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (۲)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامانِ تجارت کی مالیت کا تعین ادائے گی زکوٰۃ کے دن قوتِ خرید کے اعتبار سے کیا جائے گا، پھر جو تاجر تھوک مال کی تجارت کرتا ہے اس کے لیے تھوک بھاؤ کا اعتبار کرنا ہوگا، اور جو تاجر پھٹکر مال فروخت کرتا ہے اس کے لیے پھٹکر فروختگی کا اعتبار کرنا ہوگا۔

---

(۱) ھدایہ ۱/۱۶۶، الجوھرۃ النیرۃ ۱/۱۲۹، عالمگیری ۱/۱۷۲ - (۲) فتاویٰ ھندیہ ۱/۱۷۲

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

اراضی تجارت اگر خراجی ہیں تو ان میں خراج واجب ہے زکوٰۃ نہیں، اور اگر عشری ہیں تو ان میں عشر واجب ہے زکوٰۃ نہیں، لیکن امام محمد رح کے نزدیک عشر کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی واجب ہے (لہٰذا امام محمد رح کے قول کو اختیار کرنا مناسب ہے کیوں کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے)۔ (۱)

اراضی تجارت اگر نہ عشری ہوں اور نہ خراجی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب ادائیگی کے دن کی متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

(۱) شیرز کی خرید بغرض تجارت ہو تو تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(۲) شیرز کی مالیت کا تعین بوقت ادائیگی زکوٰۃ مارکیٹ کے نرخ سے کیا جائے گا۔

شیرز کی خرید بغرض ذریعہ آمدنی ہو تو آلات و اثاثہ کے علاوہ جو اصل و منافع ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(۳) قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بونڈ کیش کرانے کے وقت گذرے ہوئے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ (۲)

نصاب موجب زکوٰۃ

صرف سونا ہو یا بقدر نصاب سونا ہو تو اس میں سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

صرف چاندی ہو یا بقدر نصاب چاندی ہو تو اس میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

---

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۴۴ - بحر ۲/۲۰۹

(۲) درمختار علی هامش ردالمحتار ۲/۲۶۶

سونا، چاندی دونوں نصاب سے کم ہوں تو دیکھا جائے گا، دونوں کی قیمت مل کر کسی ایک نصاب کے بقدر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

اموالِ تجارت کی قیمت اگر دونوں (سونا، چاندی کے) نصاب کو پہونچ جاتی ہے تو اختیار ہے جس نصاب کا چاہے اعتبار کرے اور اگر دونوں نصابوں میں سے صرف ایک نصاب کو پہونچتی ہے تو اسی نصاب کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ (۱)

نصابِ حرمتِ زکوٰۃ

مالدار کو جو نصاب کا مالک ہو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے خواہ وہ نصاب کسی بھی قسم کے مال کا ہو بشرطیکہ اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو، پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ حرمتِ زکوٰۃ کے لیے نصابی اموال (سونا، چاندی، سائمہ) میں ان کے نصاب کی مقدار کا اعتبار ہے یا قیمت کے حساب سے نقدی کے نصاب کا اعتبار ہے۔ بعض نے نصابی اموال میں ان کے نصاب کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے قیمت کا اعتبار کیا ہے۔ نصابی اموال کے علاوہ میں بالاتفاق قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

مصارفِ زکوٰۃ

مستحقِ زکوٰۃ طلبہ کو چیک کی بجائے رقومِ زکوٰۃ دی جائے اور وہ وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردیں، یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔

سفراء و محصلین کو کمیشن پر طے کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ وہ العاملین علیہا میں داخل ہیں، اور عملہ کو ماہانہ تنخواہ مدِ زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۹

فی سبیل اللہ

(۱) سورہ توبہ کی آیت " انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفة قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضة من اللہ واللہ علیم حکیم " میں انما سے جو حصر بیان کیا گیا ہے وہ حصر حقیقی ہے۔

(۲) جی ہاں، ہم جمہور مفسرین اور فقہاء کی اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب وسنت میں مطلق طور پر ہو تو اس سے مراد غزوہ وجہاد ہی ہوتا ہے۔ (۱)

(۳) آیاتِ احکام میں سے کسی آیت کی تشریح میں قرونِ اولیٰ میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو ہمارے لیے لازم وضروری ہے کہ ان دو اقوال میں سے ایک قول کو اختیار کریں۔ ان دو اقوال کو چھوڑ کر آیت کی تفسیر وتشریح میں کوئی تیسرا یا چوتھا قول اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۴) الف :۔ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی ہے اور فی سبیل اللہ کے دائرہ میں صرف الغزاة الفقراء اور الحجاج الفقراء ہیں۔

ب :۔ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر کی شرط ہے۔

(۵) مصارفِ زکوٰۃ قیاسِ شرعی کا محل نہیں ہیں اور فی سبیل اللہ کا مصداق جہادِ عسکری پر قیاس کرتے ہوئے جہادِ قلمی، جہادِ فکری، جہادِ ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے، نیز اصولاً بھی اس کی گنجائش نہیں ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ پر قیاس کرتے ہوئے کچھ اور قسموں کو مصارفِ زکوٰۃ میں شامل کر لیا جائے۔

(۶) فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور تعمیم وتوسیع کے قول کو اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب وعلمہ اتم واکمل۔

---

(۱) ھدایہ ۱/۱۸۵

جوابات ضمیمہ سوالات

حامداً و مصلیاً و مسلماً ۔

شیئرز پر زکوٰۃ کے وجوب کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شیئرز کی خرید اگر بہ نیتِ تجارت ہو اور ابھی تک نیت تجارت میں تبدیلی نہ آئی ہو (چاہے زیادہ مدت پاس رکھا جائے یا کم مدت) تو شیئرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت اور اس سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

• شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو پھر نیتِ تجارت میں تبدیلی آگئی یعنی شیئرز کو ذریعہ آمدنی بنادیا تو شیئرز کی جو رقم آلات واثاثہ میں لگ گئی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی جو رقم آلات واثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور شیئرز سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے شیئرز چاہے کم مدت پاس رہے یا زیادہ مدت ۔

• شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو بلکہ بہ نیت ذریعہ آمدنی ہو تو شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات واثاثہ میں لگ گئی ہے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات واثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

وجوبِ زکوٰۃ صافی آمدنی پر یا غیر صافی آمدنی پر ؟

• اخراجات اگر از قبیل دیونِ شرعی ہیں تو آمدنی سے منہا کر دیے جائیں گے، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اور اگر از قبیل دیونِ شرعی نہیں ہیں، جیسے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ تو ان کو آمدنی سے

منہا نہیں کیا جائے گا۔

● ——: اخراجات اگر یوم وجوب ادا سے پہلے ادا کر دیے گئے ہیں تو بقیہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے۔

● ——: اخراجات اگر یوم وجوب ادا سے پہلے ادا نہیں کیے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔

(۱) اخراجات اگر از قبیل دیونِ شرعی ہیں، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا کر دیے جائیں گے۔

(۲) اخراجات اگر از قبیلِ دیونِ شرعی نہیں، جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا نہیں کیے جائیں گے۔

● ——: شیئرز کو مسلسل خریدا اور بیچا جاتا ہو، نفع بھی ہوتا ہو اور نقصان بھی تو یوم وجوب ادا شیئرز کی جو پوزیشن ہو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

۲——: کاروباری ادارہ میں کاروبار سے ہوئے نفع اور موجودہ اسٹاک میں جن اشیاء کی خرید بغرض تجارت ہوئی ہو، ان تمام پر شرعاً واجب ہے۔

● ——: جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت (خرید و فروخت) ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ (منافع) دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔

● ——: جانوروں کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ دودھ، انڈے فروخت کر دیے جائیں تو ان کے اثمان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

۳——تمسکات سے کیا سرکاری تمسکات مراد ہیں؟ یا اس کے علاوہ مراد ہے؟ پہلے اس کی وضاحت کی جائے، نیز اخراجات کی مکمل وضاحت کی جائے۔ اس کے بعد جواب لکھا جا سکتا ہے۔

انٹرسٹ کے متعلق

مذکورہ حالات میں حکومت کی سیکورٹیز / بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسٹ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

سوالنامہ کا جواب

از: ـــــــــ مولانا اشرف علی

جواب (۱):

اقسام اموال اور وجوب زکوٰۃ:

زکوٰۃ ان اموال میں واجب ہوتی ہے جو کچھ دنوں تک باقی رہنے والے ہیں اور ان میں خلقتاً یا عملاً نشو ونما ہے۔ اس طرح اموال چار ہیں۔

(۱) سونا، چاندی اور نقد (۲) حیوانات، سوائم (۳) زمین کی پیداوار

(۴) تجارت کا سامان جو بہ نیت تجارت خرید جائے۔

وجوب زکوٰۃ کی شرطیں

وجوبِ زکوٰۃ کی شرائط میں سے پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال پر صاحب مال کا قبضہ ہو اور وہ اس میں تصرف کرنے پر قادر ہو جسے ملکِ ید اور ملک تصرف سے تعبیر کیا جاتا ہے اس ذیل میں قائم کردہ سوالات کے جوابات بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

(۱) تجارت کی غرض سے خریدے ہوئے مال میں قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس مال کی پیشگی ادا کردہ قیمت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بحر الرائق ۲/۲۱۸) میں ہے:

"فلایجب علی المشتری فیما اشتراہ للتجارۃ قبل القبض"

اور شامی[1] میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اور شامی[2] ہی میں ہے:

قلت ینبغی لزوھما علی المشتری فقط علی القول الذی
علیہ العمل الآن من ان بیع الوفاء منزل منزلۃ الرھن"

جواب۲: کرائے کے مد میں پیشگی دی گئی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے کے بعد واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ مالک پر ہوگی۔

" اما زکوٰۃ اجرۃ المعجلۃ عن سنین فی الاجارۃ الطویلۃ........
فتجب علی الآجر لانہ ملکھا بالقبض" (۳)

لیکن بہتر یہ ہے کہ دونوں زکوٰۃ ادا کردیں۔

" وفی الخلاصۃ الاحتیاط ان یزکی کل منھما" (۴)

جواب(۳): وہ اموال جن کا مالک معین شخص نہیں ہوتا اور وہ رفاہ عام میں صرف ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ـــــ "فلازکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک" (۵)

جواب(۴): حرام ذریعے سے حاصل شدہ مال کل واجب التصدق ہے اس میں زکوٰۃ کا وجوب نہیں البتہ اگر کسی کی ملک میں حرام اور حلال مال اس طرح مخلوط ہوں کہ ان میں تمیز مشکل ہو تو زکوٰۃ مجموعہ مال میں واجب ہوگی، یعنی نصاب میں حرام مال بھی شامل کیا جائے گا۔ شامی[6] میں ہے:

" لازکوٰۃ فی المغصوب والمملوک شراءً فاسدًا والمراد بالمغصوب مالم یخلطہ بغیرہ لعدم الملک"

جواب (۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی۔ مدیون دین کی رقم ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہو یا تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو ان دونوں صورتوں میں دائن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس قرض کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو اس پر زکوٰۃ وصولی سے پہلے

---

(۱) شامی ۲/۷ (۲) شامی ۲/۶ (۳) فتح القدیر ۲/۱۴۱ (۴) ۲/۱۴۱
(۵) شامی ۲/۲ (۶) شامی ۲/۵

واجب نہیں ہوگی، اور جس قدر وصولی ہوگی حولانِ حول کے بعد صرف اسی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر قرض ایسے شخص کے ذمہ ہے جو انکار کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اگر گواہ مل گئے تو ان کی گواہی کی وجہ سے زکوٰۃ تو واجب ہو جائے گی، مگر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب وصولی کے بعد ہوگا اور صرف مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فتح القدیر میں ہے:

"ومن له على آخر دين فجحده سنين ثم قامت له البينة لم يزكه مالہ"۔ (۱)

جواب (۶): پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو بقدر نصاب ہو اس میں وصولی کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وجوبِ زکوٰۃ کی دوسری شرط نما ہے

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مال اضافے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ بدائع الصنائع میں ہے:

"وذلك هو المال النامي على التفسير الذي ذكرناه أن يكون المال معدًا للاستنماء و ذلك بالاعداد للإسامة وفي المواشي وللتجارة في اموال التجارة"۔ (۲)

نما کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) حقیقی (۲) تقدیری

نما حقیقی: توالد و تناسل اور تجارت سے ہوتا ہے۔

نما تقدیری: جس میں مال میں اضافہ کرنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل ہو۔

نما حقیقی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) خلقی: جیسے سونا اور چاندی۔

(۲) فعلی: سونا اور چاندی کے علاوہ، وہ سامان جس میں تجارت یا اسامت کی جہت سے اضافہ ہوتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

منها كون النصاب ناميًا حقيقة بالتوالد والتناسل والتجارة

---

(۱) فتح القدير ۲/۱۶۱ (۲) بدائع الصنائع ۲/۱۱

أو تقديرًا ان يتمكن من الاستنماء" (۱)

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ کی تعریف اوراس کا دائرہ۔

ہر وہ مال جس سے انسان کی حفاظت ہوسکتی ہو تحقیقاً یا تقدیرًا، وہ حاجتِ اصلیہ ہے، جیسے نفقہ، رہنے کے لیے مکان، آلاتِ حرب، گرمی وسردی سے بچنے کے لیے کپڑے اوراس کے لوازمات، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواری کے حیوانات، اہل علم کے لیے کتابیں، قرض۔ بحرالرائق میں ہے:

"ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً" (۲)

حالات اور ماحول کے بدلنے سے ضروریات انسانیہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لیے حاجت اصلیہ کا تعین دور اور ماحول کے حساب سے ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

مانع زکوٰۃ دین: ہر وہ دین جس کا مطالبہ من جہۃ العباد ہو، زکوٰۃ سے مانع ہے، جیسے قرض، مبیع کی قیمت اور جراحت وہلاکت کا تاوان اور دین زکوٰۃ وغیرہ۔

دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

(۱) دین قوی: جو واجب ہو مال تجارت کے بدلے مثلاً سامان تجارت کی قیمت۔

(۲) دین متوسط، جو واجب ہو بدل ایسے مال کا جو تجارت کے لیے نہیں ہے، جیسے خدمت کے لیے غلام کی قیمت۔

(۳) دین ضعیف: جو واجب ہو کسی شئ کا بدل بن کر جا ہے اس کی مداخلت کے بغیر ہو، جیسے میراث وغیرہ، یا مداخلت سے ہو، جیسے وصیت یا بدل ایسی چیز کا ہو جو مال نہیں، جیسے مہر۔

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۸۹/۱ (۲) بحرالرائق ۲۲۲/۲

احکام:

(۱) دین قوی میں حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے اور ادائے گی متاخر ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک خمس نصاب پر قبضہ ہوجائے اور اس مقبوض کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کیا جائے، اسی حساب سے بقیہ میں بھی ادا کیا جائے گا۔ طویل الاجل دین میں جس میں قرض کی ادائے گی قسط وار ہوتی ہے اس کی ادائے گی میں ہر سال اموالِ زکوٰۃ سے پورا قرض منہا کیا جائے گا، صرف واجب الادا قسط منہا نہیں کی جائے گی۔

(۲) دین متوسط میں مال پر قبضے کے بعد جب حولانِ حول ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

(۳) دین ضعیف میں جب پورا مال قبضے میں آجائے اور اس کے بعد حولانِ حول ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ (۱)

کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

جو اموال کہ نامی ہوں، فارغ عن الدین والحاجۃ الاصلیہ ہوں اور ملک میں یدًا و تصرفًا داخل ہوں ان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ کمپنی کے شرکاء میں سے جو لوگ کہ صاحبِ نصاب ہوں انھیں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کمپنیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک تو وہ ہے جو اپنے شرکاء سے رقم وصول کرنے کے بعد ایسا سامان مہیا کرتی ہے جو خود فروخت ہوتے ہیں۔ اور دوسری وہ کمپنیاں ہیں جو رقم سے ایسے سامان خریدتی ہیں کہ ان سامانوں کو اجارے پر چلاتی ہیں۔ اول الذکر کمپنی میں لگی ہوئی رقم کو نصاب میں شامل کرنا ہوگا اور مؤخر الذکر کمپنی میں جو آمدنی ہوگی وہ

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۰

نصاب میں جوڑی جائے گی، اصل رقم حاجتِ اصلیہ میں داخل ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی غرض سے نہ خریدے جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی
اسی طرح عورتوں کی تزئین اور آرائش کے سامان۔ عالمگیری میں ہے :

" وكذا طعام اهله وما يتجمل به بين الاواني اذا لم يكن من الذهب والفضة وكذا الجوهر واللؤلؤ والياقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم يكن للتجارة "(۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی زکوٰۃ کی ادائیگی، ادائیگی کے وقت کی قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگی اور تھوک تجارت کرنے والا تھوک قیمتِ فروخت کے اعتبار سے اور پھٹکر تجارت کرنے والا پھٹکر کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔

جو لوگ زمین کی خرید و فروخت تجارتاً کرتے ہیں ان کو زمین کی مالیت بھی نصاب میں شامل کرنی ہوگی اور مالیت کا اندازہ زکوۃ کے وجوب کے وقت کی قیمت سے ہوگا۔

شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص میں تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت جو نرخ مارکیٹ کا ہوگا اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

اور بونڈز میں جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ وصول ہو جائے اور گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۱/۸۸

نصابِ زکوٰۃ

سونا اور چاندی میں ہر ایک کی مستقل مالیت ہونے کی وجہ سے دونوں کا الگ الگ مستقل نصاب ہے۔ موجودہ دور میں فقہاء کی تشریح ما ھو انفع للفقراء کے ضابطے سے دیگر اشیاء میں نصابِ زکوٰۃ کا تعین چاندی کے حساب سے کیا جائے گا۔

مصارفِ زکوٰۃ

(۱) مدارس کے ذمہ داران، طلبہ کو ان کے قیام و طعام اور تعلیم پر ہونے والے اخراجات مثلاً ۲۵۰/ فی طالب علم مقرر کر کے مد زکوٰۃ سے دے دیں اور پھر خرچ کے مد میں جمع کرالیں تو یہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح اتنی رقم کا چیک طلبہ کو دے دیں اور طلبہ اس چیک کو مدرسہ میں جمع کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والے کا وکیل ہوتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن کی صورت میں معاوضہ دینا ناجائز ہے، اس لیے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا حساب کرنے والے عملہ کی تنخواہ کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے نہیں کی جا سکتی۔

مصرفِ زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصرف زکوٰۃ میں وارد آیت " انما الصدقات للفقراء والمساکین الآیۃ میں کلمۂ انما کے حصر حقیقی ہونے پر جمہور مفسرین اور فقہاء کا فیصلہ درست ہے، آیت کا موقع نزول اسی بات کی تائید کرتا ہے۔

(۲) لفظ فی سبیل اللہ کے اطلاق سے جمہور مفسرین کا فیصلہ کہ اس سے مراد غزوہ اور جہاد ہے، یہی صحیح ہے۔

(۳) فی سبیل اللہ کی تشریح میں دو قول غزوہ اور حج کے علاوہ کار خیر میں مصروف ان لوگوں کو بھی کیا جا سکتا ہے جو اپنے عمل پر اپنے کو اجرت کا مستحق نہیں سمجھتے اور دینے والا بھی حق اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہو۔

(۴) الف: مذکورہ بالا ۔۔۔ ۔ات کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ میں غازی اور حاج کے علاوہ اس کے عام معانی ہر کارِ خیر میں مصروف وہ بھی لوگ آسکتے ہیں جو بلا استحقاق اجرت عمل سمجھتے ہوئے خدمت دین میں مصروف ہیں داخل ہوں گے ۔ اور چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک بلا عوض شرط ہے اس لیے رفاہی امور فی سبیل اللہ میں داخل نہیں ہوں گے ۔

(ب): فی سبیل اللہ کے مصداق میں شامل ہونے والے لوگ بشرط فقر مستحق زکوٰۃ ہوں گے ۔

(۵) مصارفِ زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہیں لیکن قیاس کرتے ہوئے مقیس علیہ کی علت تامہ سے مقیس کی تطبیق بالکلیہ ہونی چاہیے ، اس لیے جہاد قلمی ، جہاد فکری اور جہاد ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جائے گی ۔

(۶) دورِ حاضر میں ترقیات پر جدید وسائل کے پیش نظر دینی کاموں کی ضروریات اور مصارف میں اضافہ اگرچہ بہت ہو چکا ہے اس کے باوجود فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت دی جائے گی کہ زکوٰۃ کی اصل روح باقی رہے اور زکوٰۃ کی رقم غیر مصرف میں خرچ نہ ہونے پائے ۔

(۷) جمہور نے فی سبیل اللہ کی تشریح جو غازی اور حاج سے کی ہے اس سے فی سبیل اللہ کا دائرہ اس حد تک متعین ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دین کی حفاظت اور اشاعت میں مصروف ہوں اور ان کی یہ مصروفیت للّٰہیت پر مبنی ہو اور اس عمل پر اپنے کو کسی اجرت کا امیدوار نہ سمجھتے ہوں فی سبیل اللہ کے دائرہ میں آسکتے ہیں ۔

جوابات ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

(۱) شیئرز کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت اس کی بازاری قیمت ۔۔۔ حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی ، زکوٰۃ ادا کرنے کی یہی صورت شیئرز کی مسلسل خرید و فروخت کے طریقے میں ہوگی ۔

(۲) کاروباری ادارہ اگر سامان ہی خرید و فروخت کرتا ہے تو بہ قدر نصاب ہونے کی صورت میں حولان حول کے بعد موجودہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً حیوانات کی تجارت کرنے والے حیوانات ہی کو خریدتے بیچتے ہیں تو اگر سال کے شروع میں حیوان کی قیمت بہ قدر نصاب ہو تو حولان حول کے وقت موجودہ حیوانات کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی ، اور اگر کمپنی اصل سامان

کو فروخت کرنے کی بجائے اس سے پیدا ہونے والے سامانوں کو فروخت کرتی ہے تو زکوٰۃ آمدنی پر واجب ہوگی، مثلاً گائے بھینس وغیرہ کے دودھ کی تجارت کی جائے تو گائے بھینس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ دودھ کی قیمت جو نصاب کے بقدر ہو جائے اور اس پر حولانِ حول بھی ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۳) شخصی اخراجات کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) سود کی حرمت میں تخفیف لانے کی غرض سے اس کی تشریح تعبیر میں جو بھی رد و بدل کیا جائے وہ سود کی حرمت میں تخفیف پیدا نہیں کر سکتے البتہ الفاظ کی اس ہیرا پھیری سے لوگوں کو ضرور دھوکے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس لیے سود کے لیے بہتر سے بہتر جو بھی الفاظ استعمال کیے جائیں ان سے سود کا جواز ثابت نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ہر چہار طرف حکومتی سطح پر ہونے والے کاروبار میں سود کے جزو لازم ہونے کی وجہ سے سود کے کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان بہ حیثیت مجموعی مجبور نہیں ہے، بلکہ حکومت سے اس کے لیے الگ قانون بنانے کی مانگ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اپنے مذہبی تشخص کو باقی رکھنے کے لیے مسلم پرسنل لا منظور کرا کے اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔ البتہ وہ لوگ جن کے پاس ذریعہ معاش کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ لوگ بہ درجہ مجبوری سوال میں مذکورہ کمپنیوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ زکوۃ

مفتی نسیم احمد قاسمی ——— رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی

موجودہ معاشی مسائل و مشکلات کا حل

زکوۃ اسلام کا تیسرا اہم ترین مالی فریضہ ہے۔ جس کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ اسلام کا نظامِ زکوۃ اجتماعی عدل اور تضامن وتکافل کا بہترین آئینہ دار ہے۔ اس کے اندر معاشرہ کے تمام معاشی اور اقتصادی مسائل ومشکلات کا حل موجود ہے۔ اسلام کے نظامِ زکوۃ کے نفاذ اور قیام کے ذریعہ ایک ایسے پاکیزہ اور صاف ستھرے معاشرہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے جس میں امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، صنعت کار اور مزدور ہر طبقہ کے لوگ ایک دوسرے سے سیر وشکر ہوکر اعتمادِ باہمی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ نہ امیر غریب سے نالاں ہو اور نہ غریب امیر سے شاکی۔ اسلام کے نظامِ زکوۃ کے ذریعہ دولت وثروت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور دولت وثروت سے ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو فقراء ومساکین کا استحصال ہوتا ہے اور نہ ہی امراء اور اہل ثروت پر ظلم۔ آج دنیا کا جو معاشی ڈھانچہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نظام میں ہر طبقہ کے حقوق کی یکساں طور پر رعایت نہیں کی گئی ہے۔ آج کے موجودہ نازک حالات میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کا "اجتماعی نظامِ زکوۃ" قائم کیا جائے۔ زکوۃ مالداروں سے اجتماعی طریقے پر وصول کی جائے، اور اس کے صحیح مصارف پر خرچ کی جائے۔ اس کے لئے ایک مضبوط اور منظم نظام قائم کیا جائے تاکہ زکوۃ کی رقم کا استعمال صحیح طریقے سے ہوسکے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی جو "اسلامک بینکنگ" پر قابل قدر کام کرچکی ہے اسے اس طرف بھی پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اور اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوۃ کے قیام کی راہ میں جو دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں ان کے حل کے لئے علماء، ماہرین فقہ وفتاویٰ اور قانون

دانوں کی مدد لے کر اس کا ایک عملی خاکہ امت کے سامنے پیش کرے تاکہ امت کو اس کی خوبیوں سے بہرہ ور ہونے کا زریں موقع مل سکے۔ اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ میں وہ تمام خوبیاں اور محاسن موجود ہیں جنھیں لوگ انشورنس اور اس طرح کے دیگر نظاموں میں تلاش کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

زکوٰۃ "زکا" کا مصدر ہے جو بڑھوتری اور زیادتی کے معنیٰ میں آتا ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ طہارت اور پاکیزگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قد افلح من زکاھا، کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنایا۔ اور شرعاً زکوٰۃ ایک ایسا حق ہے جو مالِ مخصوص میں واجب ہوتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

"مالِ مخصوص کے ایک حصہ کا شخص مخصوص کو مالک بنا دینا جسے اللہ نے اس کا حقدار بنایا ہے اور یہ تملیک محض رضائے الٰہی کی خاطر ہو۔"[۱]

کنز میں زکوٰۃ کی یہ تعریف کی گئی ہے:

"ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للہ تعالیٰ"[۲]

یعنی زکوٰۃ ایسے مسلمان فقیر کو مال کا مالک بنا دینے کا نام ہے جو نہ تو ہاشمی ہو اور نہ ہی اس کا غلام ہو۔ بشرطیکہ اس مال کی منفعت پوری طرح سے مالک سے ختم ہوجائے اور یہ تملیک محض اللہ کی رضا کی خاطر ہو۔

اموالِ زکوٰۃ

اموالِ زکوٰۃ جن میں شریعت نے زکوٰۃ واجب قرار دیا ہے وہ پانچ ہیں۔

(۱) نقدین ـــــ یعنی سونا اور چاندی (۲) سائمہ جانور ـــــ اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ (۳) سامانِ تجارت ـــــ (۴) معدن و رکاز ـــــ (۵) زرعی پیداوار اور پھل[۳]

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ صفحہ ۷۳۰ [۲] کنز علی ھامش البحر ج ۲ صفحہ ۲۰۱

[۳] الفقہ علی المذاھب الاربعہ ج ۱ صفحہ ۵۹۶

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں دو طرح کی ہیں، بعض شرطیں وہ ہیں جو معطی یعنی زکوٰۃ دہندہ سے متعلق ہیں، اور بعض وہ ہیں جو نفس مال سے متعلق ہیں۔

زکوٰۃ دہندہ سے متعلق شرطیں

۱ ـــــ اسلام ـــــ زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے، کافر اور مشرک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس لئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور کافر کی طرف سے عبادت کی ادائیگی درست نہیں ہوتی۔ بدائع میں ہے:

"زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے۔ کافر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور کفار عبادات کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔" [۱]

فقہ شافعی کی رو سے بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے اسلام ضروری ہے۔ غیر مسلم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے المجموع شرح المہذب للنووی میں ہے:

"ولا تجب الزکاۃ الا علی حر مسلم۔" [۲]

یعنی زکوٰۃ کا وجوب صرف آزاد مسلمان پر ہوگا۔

الفروع لابن مفلح الحنبلی میں ہے:

"هی فرض علی کل مسلم حر" [۳]

۲ ـــــ حریت ـــــ زکوٰۃ کے وجوب کی دوسری شرط آزاد ہونا ہے۔ غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ غلام کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اس کے آقا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خود غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ مکاتب

---

[۱] بدائع ج ۲ ص ۴، فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۳، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲

[۲] المجموع ج ۵ ص ۳۲۶ [۳] الفروع ج ۲ ص ۳۱۸

اور مدبر اگرچہ مالک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر چوں کہ اس کو کبھی ملک تام حاصل نہیں ہوتا ہے اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

"زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط حریت (آزاد ہونا) ہے اس لئے کہ ملکیت شرائطِ وجوب میں سے ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے) اور غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے لہٰذا غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اگرچہ وہ ماذون فی التجارہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں اگر اس کے ذمہ قرض نہیں ہوگا تو اس کی ساری کمائی مولیٰ کی ملک ہوگی اور اس کی زکوٰۃ مولیٰ پر واجب ہوگی۔ اور اگر اس کے ذمہ اتنا قرض ہو جو اس کی کمائی پر محیط ہو تو اس صورت میں اس کی کمائی کا مالک مولیٰ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زکوٰۃ نہ تو غلام پر واجب ہوگی اور نہ اس کے آقا پر" [۱]

المجموع میں ہے :

"زکوٰۃ صرف آزاد مسلمان پر واجب ہوگی اس لئے کہ غلام اور مکاتب کے مال کا مالک مولیٰ ہوتا ہے وہ دونوں کسی چیز کے خود مالک نہیں بنتے۔" [۲]

الفروع میں ہے :

"زکوٰۃ ہر آزاد مسلمان پر فرض ہے۔" [۳]

۳ ـــــ بلوغ ـــــ وجوب زکوٰۃ کے لئے بلوغ حنفیہ کے نزدیک شرط ہے۔ اس لئے نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بدائع میں ہے :

"وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ہمارے نزدیک بلوغ ہے پس نابالغ کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بلوغ وجوب زکوٰۃ کی شرط نہیں ہے۔ ان کے نزدیک نابالغ پر بھی زکوٰۃ کا وجوب ہوتا ہے جسے اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے گا۔ صحابہ میں سے حضرت عائشہ اور ابن عمرؓ کا یہی قول ہے۔" [۴]

---

[۱] بدائع ج ۲ ص ۶، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۳، الفتاویٰ التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۲۱۷

[۲] المجموع ج ۵ ص ۳۲۶ [۳] کتاب الفروع ج ۲ ص ۳۱۸ [۴] البدائع ج ۲ ص ۴

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

" بلوغ اور عقل حنفیہ کے نزدیک شرائط وجوب میں سے ہے۔ پس ان کے نزدیک نابالغ اور مجنوں (پاگل) کے مال میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ یہ دونوں ادائیگی عبادت کے مخاطب ہی نہیں ہوتے ہیں " [1]

المجموع میں فقہ شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے :

" زکوۃ نابالغ اور پاگل کے مال میں بھی واجب ہوگی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا : نابالغوں کے اموال میں زیادتی پیدا کرنے کی کوشش کرو، ایسا نہ ہو کہ اسے زکوۃ ختم کر دے اور اس لئے کہ زکوۃ کا مقصد حصولِ ثواب اور فقراء کے ساتھ ہمدردی و مواسات ہے۔ اور نابالغ اور مجنوں اہل ثواب اور اہل مواساۃ میں سے ہے " [2]

الفروع میں ہے :

" زکوۃ نابالغ اور پاگل پر بھی فرض ہے [3] نابالغ پر وجوب زکوۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے ابو عبید نے لکھا ہے : زکوۃ ہمارے نزدیک نابالغ کے مال میں بھی واجب ہے جسے اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے گا۔ جیساکہ ولی حالات صغر میں اس کے لئے خرید و فروخت کرتا ہے پس اگر ولی نے اس کے مال میں سے زکوۃ نہیں نکالی۔ اور وہ بالغ ہو گیا تو ولی کو چاہئے کہ اسے بتا دے تاکہ وہ گذشتہ سالوں کی زکوۃ نکال دے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو پھر گناہ ولی پر ہوگا۔ فقیہ طاؤس سے ایسا ہی منقول ہے " [4]

۴ ــــ عقل ــــ حنفیہ کے نزدیک وجوب زکوۃ کی چوتھی شرط عقل ہے۔ مجنوں پر ان کے نزدیک زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں۔ جنون اصلی اور جنونِ طاری۔ جنون اصلی یہ ہے کہ نابالغ کی حالت میں بھی وہ مجنون تھا اور جنون کی ہی حالت میں وہ بالغ ہوا۔ ایسے جنون کے بارے میں ہمارے ائمہ احناف کا اتفاق ہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے بالغ ہوگا۔ اور اگر چند سالوں کے بعد جنون سے افاقہ ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ افاقہ کے بعد سے جب پورا ایک سال ہو جائے گا تو

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۳۹ [2] المجموع ج ۵ ص ۳۲۹ [3] الفروع ج ۲ ص ۳۱۵
[4] کتاب الاموال ص ۵۵۵

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب کہ بالغ ہونے کی صورت میں بلوغ کے بعد سے سال کا اعتبار ہوتا ہے اور ایک سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ جنون طاری اگر پورے ایک سال تک محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا اور اگر پورے سال کو محیط نہ ہو بعض اوقات افاقہ ہو جاتا ہو تو اس سلسلہ میں امام محمد کا ایک قول یہ ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے افاقہ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر سال کے زیادہ تر حصہ میں جنون سے افاقہ ہو تو زکوٰۃ کا وجوب ہوگا ورنہ نہیں[۱]

بدائع میں ہے:

"ہمارے نزدیک زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط عاقل ہونا ہے، پس مجنوں کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں، اصلی اور طاری۔ اصلی یہ ہے کہ جنون ہی کی حالت میں بالغ ہوا ہو۔ اس کے بارے میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہے لہٰذا افاقہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ افاقہ کے بعد پورے سال کا آغاز ہوگا۔ اور سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جنون طاری اگر پورے سال کو محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہوگا اور اگر درمیانِ سال افاقہ ہو جائے تو اس مسئلہ میں نوادر میں امام محمد سے منقول ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے افاقہ ہو جائے چاہے وہ افاقہ سال کے کسی بھی حصہ میں ہو، اس پورے سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ابن سماعہ نے امام ابویوسف سے بھی ایک روایت اس کے مطابق نقل کی ہے۔ ہشام نے امام ابویوسف سے دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ اگر سال کے اکثر حصہ میں جنون سے افاقہ رہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں اور وہ شخص جس پر کبھی جنون طاری ہوتا ہو۔ پھر افاقہ ہو جاتا ہو تو ایسا شخص "مجنون" کے حکم میں نہیں ہوگا۔ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔"[۲]

جمہور ائمہ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے عاقل ہونا شرط نہیں ہے۔ پاگل کے مال میں بھی ان

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲، فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۵   [۲] بدائع ج ۲ ص ۵

حضرات کے نزدیک زکوۃ واجب ہوگی۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

" وقال الجمهور لا يشترطان ذلك وتجب الزكوة في مال الصبي والمجنون "[۱]

المجموع شرح المهذب میں ہے :

" وتجب في مال الصبي والمجنون " [۲]

۵ ــــ فراغت عن الدین : حنفیہ کے نزدیک وجوب زکوۃ کی ایک شرط فراغت عن الدین ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوۃ دہندہ کے ذمہ ایسا دین نہ ہو جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہے تو بقدر دین وہ وجوب زکوۃ کے لئے مانع ہوگا۔ چاہے دین معجل ہو یا مؤجل۔ البتہ اگر دین کی مقدار مالیت منہا کرنے کے بعد بھی بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں زکوۃ کا وجوب ہوگا۔ وہ دیون جن کا مطالبہ بندوں کی جانب سے نہ ہوتا ہو وہ مانع وجوب زکوۃ نہیں ہوں گے جیسے دیونِ کفارات ونذور۔ امام شافعی کے نزدیک دین سرے سے مانع زکوۃ نہیں ہے[۳]

۶ ــــ العلم بالفریضہ : علامہ کاسانی نے وجوب زکوۃ کی ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ نفسِ فریضۂ زکوۃ کا کسی بھی طرح سے علم حاصل ہو جائے۔ لہذا وہ شخص جو دارالحرب میں مسلمان ہوا اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی اور اسے دارالحرب میں کسی بھی ذریعہ سے زکوۃ کی فرضیت کا علم نہیں ہوسکا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کاسانی نے اسے ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد کا مسلک قرار دیا ہے۔ امام زفر کے نزدیک وجوبِ زکوۃ کے لئے فرضیت کا علم ضروری نہیں ہے لہذا وہ شخص جو دارالحرب میں مشرف باسلام ہوا اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی، سالوں دارالحرب میں مقیم رہا، اس کے پاس سائمہ جانور یا دوسری مالیت ہو اور اسے فرائض اسلام کا علم ہی نہ ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور جب وہ دارالحرب سے دارالاسلام ہجرت کرکے آئے گا تو اس سے گذشتہ سالوں کی زکوۃ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور امام زفر کے نزدیک اس پر گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ واجب ہوگی[۴]

---

[۱] الفقه الاسلامي وادلته ج ۲ ص ۷۳۹

[۲] المجموع ج ۵ ص ۳۲۹ [۳] بدائع ج ۲ ص ۶

[۴] بدائع ج ۲ ص ۴

وجوبِ زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محلِ زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے

پہلی شرط ——— ملک تام

شریعت اسلامی نے وجوب زکوٰۃ کے لئے "ملک تام" کو بنیادی شرط قرار دیا ہے، اور صرف انہیں اموال میں زکوٰۃ واجب کی گئی جن پر انسان کو "ملک تام" حاصل ہو۔ وہ اموال جن پر انسان کو ملک تام حاصل نہیں ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس چیز پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور وہ چیز اس کے قبضہ وتصرف میں بھی ہو۔ اگر اس پر ملکیت حاصل نہ ہو صرف قبضہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے مال مکاتب، کہ اس پر اگرچہ مکاتب کو قبضہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر وہ درحقیقت اس کے مولیٰ کی ملکیت ہے۔ اس لئے مکاتب پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ملکیت حاصل ہو مگر قبضہ نہ ہو، تو بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جیسے مہر کی رقم قبضہ سے پہلے۔ کہ عورت اس کی مالک تو ہوتی ہے مگر اس پر قبضہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوتی، اسی طرح مال ضمار پر بھی ملکیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر قبضہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ قبضہ سے پہلے واجب نہیں ہوتی۔

ملک تام کا وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط ہونا قرآن کریم کی آیت: "خذ من اموالهم صدقة" "وفی اموالهم حق" اور حدیث رسول: ان الله فرض علیهم فی اموالهم سے ثابت ہے۔

ملک تام کے شرط ہونے کی حکمت

ملک تام کے وجوب زکوٰۃ کی شرط ہونے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے یوسف القرضاوی نے لکھا ہے:

> "اس شرط کا اعتبار اس لئے کیا گیا ہے کہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ یہ نہ صرف حریت بلکہ انسانیت کا ثمرہ ہے۔ حیوان کو کسی چیز پر مالکانہ اختیارات اور حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ مالکانہ حقوق رکھتا ہے۔ ملکیت تملک کے فطری جذبہ کی تسکین کا سامان کرنے کے علاوہ انسان میں سیادت وقوت کا احساس بھی

پیدا کرتی ہے۔ اور ملکیت تامہ انسان کو یہ اختیار عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے مملوکہ مال سے فائدہ حاصل کرے اور اس کے اضافہ اور نشوونما کا سامان کرے نیز بذات خود یا اپنے نائب کے ذریعہ اس کو نفع بخش کاموں میں لگائے۔ ایسی عظیم نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اس لئے اگر اسلام نے اس کے مالک سے زکوۃ کی ادائیگی اور مال کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو یہ باعث تعجب نہیں ہے۔" [1]

ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام ایک فقہی اصطلاح ہے۔ فقہاء کرام ملک تام اور ملک مطلق کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ملک تام سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز پر انسان کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور اس شئی پر اس کا قبضہ بھی ہو۔ اس کی تعبیر فقہائے کرام "هو المملوك رقبة ويدا" سے کرتے ہیں یعنی وہ شئی رقبہ (ذات) اور ید (قبضہ) دونوں لحاظ سے مملوک ہو۔ ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد بن الحسن شیبانی کے نزدیک ملک تام سے ملکیت اور قبضہ مراد ہے۔ اور جب کسی چیز پر انسان کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہوگا تب اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ امام زفر بن الہذیل کے نزدیک وجوب زکوۃ کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی بھی وجوب زکوۃ کے لئے قبضہ کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضمار میں بھی زکوۃ واجب ہوگی، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔
علامہ کاسانی نے اموال سے متعلق شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "وجوب زکوۃ کی ایک شرط ملک مطلق ہے۔ ملک مطلق سے مراد یہ ہے کہ اس شئی پر انسان کو ملکیت بھی حاصل ہو اور قبضہ بھی یعنی باعتبار رقبہ و ید وہ مملوک ہو، یہ ہمارے ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کا قول ہے۔ امام زفر کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ پس ہمارے نزدیک مال ضمار میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی اور ان دونوں حضرات کے نزدیک واجب ہوگی۔" [2]

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۱
[2] بدائع ج ۲ ص ۹

البحر الرائق میں ہے :

"ھو المملوك رقبة ویدًا"[1] یعنی ملکِ مطلق سے مراد رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔

شامی میں ہے :

"ھو الملك یدًا ورقبة"[2] وہ رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔

الفقہ علی المذاھب الاربعہ میں ہے :

"حنفیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال قبضہ کے لحاظ سے مملوک ہو، پس اگر کسی چیز پر ملکیت حاصل ہو مگر اس پر قبضہ نہ ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے قبضہ سے پہلے عورت کا مہر، ایسی چیز جس پر قبضہ ہو مگر ملکیت حاصل نہ ہو، اس کی زکوۃ بھی واجب نہیں ہوگی مالکیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اپنی مملوکہ اشیاء میں تصرف کا اختیار حاصل ہو۔ پس غلام کی تمام اقسام پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ غلام کو کسی بھی صورت میں مال پر "ملک تام" حاصل نہیں ہوتی ہے۔ شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی قید سے غلام اور مکاتب کو نکالنا مقصود ہے کہ غلام کو سرے سے ملکیت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے اور مکاتب کو ناقص ملکیت حاصل ہوتی ہے اس لئے ان دونوں پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی"[3] علامہ کاسانی کی صراحت کے مطابق شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی تعریف میں قبضہ شامل نہیں ہے[4] حنابلہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اس مال پر قبضہ حاصل ہو، اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو اور اس میں اسے حسب منشاء تصرفات کا اختیار حاصل ہو، اور اس کے فوائد اسی کی طرف لوٹتے ہوں۔ لہٰذا مالِ مکاتب پر ان کے نزدیک بھی وجوبِ زکوۃ نہیں ہوگا۔"[5]

ملک تام کے ذیل میں پیدا ہونے والے سوالات حسب ذیل ہیں :

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲ [2] شامی ج ۲ ص۱۵۹

[3] الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ج ۱ ص۵۹۲ [4] بدائع ج ۱ ص۹

[5] الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ج ۱ ص۵۹۳

سوالات کے جوابات

۱ــــ مال تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوۃ

وہ مالِ تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو لیکن مال کی حصولیابی نہیں ہوسکی اور وہ مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا، توسوال یہ ہے کہ اس مال کی زکوۃ کس پر واجب ہوگی؟ مشتری پر جس نے اس کی پیشگی قیمت ادا کردی مگر مال اس کے قبضہ میں نہیں آیا، یا اس کی زکوۃ بائع پر واجب ہوگی جس نے اس کی قیمت تو وصول کرلی مگر سامان ابھی بھی اسی کے پاس ہے۔

بائع پر اس کی زکوۃ اس وجہ سے واجب نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اسے فروخت کرچکا ہے اور اس کی قیمت پر بھی قبضہ کرچکا ہے۔ اس لئے وہ مال اس کی ملکیت سے نکل چکا، پس ملکیت نہیں پائی گئی اور وجوب زکوۃ کے لئے ملکیت بنیادی شرط ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ خریدار پر اس کی زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر چند سالوں کے بعد وہ سامان اس کے قبضہ میں آیا تو گذشتہ سالوں کی زکوۃ اس پر واجب ہوگی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہائے کے دو قول ملتے ہیں!

۱ــــ پہلا قول یہ ہے کہ سامانِ تجارت قبضہ سے پہلے نصابِ شرعی نہیں بنے گا، اور اس کی زکوۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی۔ اکثر مشائخ عراق کا یہی قول ہے۔

۲ــــ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی وہ نصابِ شرعی ہوجائے گا، اور اس کی زکوۃ خریدار پر واجب ہوگی، بعض مشائخ کا اسی طرف رجحان ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"واما المشتری قبل القبض فقد قال مشائخ العراق انه لا یکون نصابا قبل القبض عندهم جمیعا قال غیرهم من المشائخ هو على الخلاف الذی ذکرنا فی الثمن وقال غیرهم من المشائخ ..... هو نصاب قبل القبض بلا خلاف" [۱]

---

[۱] فتاوی تاتارخانیہ ج ۲ ص ۳۰۳

"یعنی خریدی ہوئی چیز جس پر قبضہ نہ ہوا ہو مشائخ عراق کہتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے تمام ہی فقہائے کے نزدیک وہ نصاب شرعی نہیں ہوگی۔ دیگر مشائخ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو ثمن میں ہے۔ بعض مشائخ کہتے ہیں کہ مبیع قبضہ سے پہلے بھی بالاتفاق نصاب ہے۔"

علامہ حصکفی صاحب درمختار نے عدم وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ "ملک" پر بحث کے ذیل میں لکھا ہے:

" ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ"[1] اور مبیع قبل القبض میں بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

شامی نے اس عبارت کے تحت لکھا ہے کہ قبضہ سے پہلے تو اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی لیکن قبضہ کے بعد گزشتہ تمام سالوں کی زکوۃ اس پر واجب ہوگی:

" فیزکیہ لما مضی"[2] اور قبضہ کے بعد تمام ہی سالوں کی زکوۃ دینی پڑے گی۔

قاضی خاں نے سامانِ تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوۃ کے عدم وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔ ان کے نزدیک قبضہ کے بعد جب اس سامان پر حولانِ حول ہو جائے گا تب اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ فتاوی قاضی خان میں ہے:

" ایک شخص کے پاس سائمہ بکری تھی اس سے دوسرے شخص نے بکری خریدی مگر اس پر قبضہ نہیں کیا یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا پھر اس پر قبضہ کیا۔ تو مشتری پر گذشتہ سال کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد جب سال پورا ہوگا تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بکری اپنے بائع کے پاس ثمن کے عوض مضمون تھی۔"[3]

علامہ ابن نجیم نے بھی قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوۃ کے عدم وجوب کے قول کو ترجیح دی ہے چنانچہ "ملک تام" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

" فلا یجب علی المشتری فیما اشتراہ للتجارۃ قبل القبض"[4]

---

[1] درمختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۳   [2] شامی ج ۲ ص ۲۶۳

[3] قاضی خان ج ۱ ص ۱۲۱   [4] البحر الرائق

قبضہ کی حقیقت

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر غور کرلیا جائے کہ شرعاً قبضہ اور تسلیم کی حقیقت کیا ہے اور قبضہ کا اصل مقصد کیا ہے. تاکہ اس بات کا فیصلہ آسان ہوجائے کہ وہ سامانِ تجارت جس کی پیشگی قیمت ادا کی جاچکی اور وہ ابھی مشتری کے پاس نہیں آیا تو اس پر مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا یا نہیں ؟

فقیہ طاہر بن عبدالرشید نے خلاصۃ الفتاوی کے کتاب البیوع میں ایک باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے ! "فیما یکون قبضاً و فیما لا یکون" یعنی کسے قبضہ قرار دیا جائے گا اور کسے نہیں' اس باب کے ذیل میں انھوں نے قبضہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

"تجرید میں مبیع پر قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی یہ ہے کہ بائع مبیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کردے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور اسی طرح ثمن کی سپردگی بھی جائے گی، اجناس میں ہے کہ سپردگی کے لئے تین چیزیں معتبر ہیں (۱) بائع مشتری سے کہے کہ میں نے مبیع اور تمہارے درمیان تخلیہ کردیا ہے (۲) مبیع مشتری کے پاس اس طرح ہو کہ اگر اس میں وہ کوئی تصرف کرنا چاہے تو بلا کسی رکاوٹ کے کرسکے (۳) مبیع حقِ غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور مبیع کے درمیان تخلیہ کردیا، پس اس پر قبضہ کرلو ...... اگر کسی نے گیہوں خریدا اور وہ گیہوں کسی مکان میں ہے بائع نے اس گھر کی تالی مشتری کو دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور اس کے درمیان تخلیہ کردیا ہے، تو اسے قبضہ سمجھا جائے گا" [۱]

محقق ابن الہمام نے قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"قبضہ اور مبیع کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مشتری اور مبیع کے درمیان اس طرح تخلیہ کردیا جائے کہ مشتری کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو۔ اور یہی مفہوم ثمن کی سپردگی کا ہے

---

[۱] خلاصۃ الفتاوی ج ۳ ص۹

. . . . . اور دبری سے منقول ہے کہ اگر کسی مکان میں خریدے گئے سامانِ تجارت کے ساتھ بائع کے سامان کے علاوہ کسی دوسرے کا سامان ہو تو وہ قبضہ کے حق میں مانع ہوگا۔ پس اگر اسے سامان پر قبضہ کی اجازت دے دی جائے تو قبضہ صحیح ہو جائے گا۔ اور سامان بائع کے پاس بحکم ودیعت ہوگا . . . . . کپڑے میں قبضہ کی صورت یہ ہے کہ مشتری اسے اپنے ہاتھ میں لے لے یا اگر کپڑا زمین پر رکھا ہوا ہو اور بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور کپڑے کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے۔ پس اس پر قبضہ کر لو اور مشتری نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے قبضہ کر لیا تو شرعاً اسے قبضہ قرار دیا جائے گا۔ اور اگر کسی مکان میں رکھے ہوئے گندم کو خریدا گیا اور بائع نے مشتری کو اس مکان کی تالی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور مبیع کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے تو شرعاً یہ قبضہ قرار پائے گا۔" [1]

بحر الرائق میں ہے:

"اگر بائع نے مشتری سے مبیع کے مکمل ہونے کے بعد کہا کہ "لے لو" تو یہ قبضہ نہیں ہوگا اور اگر مبیع کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسے لے لو" پس اگر مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو یہ تخلیہ اور قبضہ ہوگا۔"

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے:

"مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر مشتری اس پر قبضہ کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش نہ آئے۔" [2]

علامہ حصکفی نے قبضہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے:

"پھر قبضہ اور مبیع کی سپردگی ایسے تخلیہ سے عمل میں آئے گی جس میں مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنا بغیر کسی رکاوٹ کے ممکن ہو۔" [3]

علامہ شامی نے صراحت کی ہے کہ تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے۔ بشرطیکہ تخلیہ کے بعد مبیع پر بغیر کسی دشواری کے قبضہ ممکن ہو۔ [4] فتح القدیر میں ہے:

---

[1] فتح القدیر لابن الہمام ج ۵ ص ۲۹۸ [2] البحر الرائق ج ۵ ص ۳۰۷
[3-4] شامی ج ۴ ص ۶۲-۵۶۱

"اور ملک تام کی قید سے مبیع قبل القبض نکل جاتی ہے۔ اگر اس پر بائع ہی کے پاس حولا ان حول ہو جائے، اور اس دوران مشتری کو اس پر ملک تصرف حاصل نہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ کمال ملک کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہو" [۱]

ان عبارات فقہیہ کا حاصل یہ ہے کہ فقہائے "تخلیہ" کو بھی حکماً "قبضہ" تسلیم کیا ہے اور سامان تجارت پر قبضہ اور اس کی سپردگی کے لئے یہ بات کافی قرار دی گئی ہے کہ سامان تجارت اور خریدار کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر خریدار سامان پر قبضہ کرنا چاہے تو اُسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے:

"وہ سامانِ تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی اور ابھی سامان تجارت بائع ہی کے پاس ہے۔ اس سامان کا مشتری شرعاً اور عرفاً مالک بن چکا ہے۔ اور اسے سامان پر حکماً قبضہ بھی حاصل ہے۔ قبضہ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کے خریدے ہوئے مال میں خریدار کو ہر طرح کے تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اور اسے اس پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں اس میں وہ جو چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ بائع کی طرف سے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ ثمن کی وصولیابی کے وقت ہی بائع سامان اور خریدار کے درمیان تخلیہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس مالِ تجارت کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ اور اگر وہ سامان تجارت چند سالوں کے بعد خریدار کے پاس آئے تو اسے گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی"

چنانچہ علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے:

"وقد منا ان المبیع قبل القبض لا تجب زکوته علی المشتری وذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین: ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصاباً لان الملک فیه ناقص بافتقاد الید والصحیح انه یکون نصاباً لانه عوض عن مالٍ کانت ید ه ثابتة علیه وقد امکنه احتواء الید

---

[۱] فتح القدیر ۱۱۳/۲

على العوض فتعتبر بيده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعًا فعلى هذا قولهم لا تجب الزكوة معناه قبل قبضه وأما بعد قبضه فتجب زكوة فيما مضى كالدين القوي"۔[1]

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی یا مشتری پر۔ اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ پیشگی ادا کی ہوئی قیمت چوں کہ مشتری کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔ اور اس پر مشتری کو نہ تو ملکیت حاصل ہے اور نہ قبضہ اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہوگی۔ البتہ بائع کو اس قیمت پر "ملک تام" حاصل ہے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔ بحرالرائق میں ہے:

"رجل اشترى عبدًا للتجارة يساوي مائتي درهم ونقد الثمن ولم يقبض العبد حتى حال الحول فمات العبد عند البائع كان على بائع العبد زكاة المائتين...... اما على البائع فلانه ملك الثمن وحال الحول عليه عند البائع..... الى قوله ولا زكوة على المشتري لان الثمن زال عن ملكه الى البائع فلم يملك المائتين حولًا كاملًا...... فلا تجب عليه الزكاة"۔[2]

"ایک شخص نے بہ نیت تجارت ایک غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم کے مساوی ہے، اس نے ثمن کی ادائیگی کر دی اور غلام پر قبضہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا۔ اور اس دوران غلام مر گیا تو بائع پر دو سو درہم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ غلام کی قیمت پر اسے ملکیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور اس پر حولانِ حول بھی ہو گیا۔ مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ثمن اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملک میں داخل ہو گیا۔ پس پورے ایک سال تک ثمن پر مشتری کی ملکیت نہیں رہی۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"۔

کرایہ کی پیشگی رقم اور ڈپوزٹ پر زکوٰۃ: کرائے کی مد میں دی جانے والی پیشگی رقم "اجرت معجلہ"

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۹
[2] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۳

ہے جس کا مالک، مالک مکان ہے۔ اس رقم پر اسے "ملک تام" حاصل ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے:

"ذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفها أهل بخاری ان الزکاۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الاجر لانہ ملکہ قبل الفسخ۔" [1]

امام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری نے اجارہ طویلہ جس کا اہل بخاری کے مابین عام رواج ہے، کے بارے میں لکھا ہے کہ اجرت معجلہ میں آجر یعنی مالک پر زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ اجارہ کے فسخ ہونے سے پہلے تک وہ اس کا مالک ہے۔

فتاوی قاضی خان میں ہے:

"اجارہ مرسومہ جس کا بخاری میں رواج ہے، اگر اس میں پیشگی رقم ادا کر دی گئی اور مال چند سالوں تک آجر یعنی مالک مکان کے پاس ہی رہا، تو شیخ ابوبکر محمد بن الفضل سے منقول ہے کہ اگر اجرت دراہم و دنانیر کے قبیل سے ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی۔ اس لئے کہ قبضہ کے ذریعہ وہ پیشگی رقم کا مالک ہو چکا ہے۔ اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر عین مقبوض کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے علاوہ دوسرے دراہم و دنانیر کی واپسی کافی ہوگی، تو گویا کہ یہ اس دین کے مثل ہوا جو حولانِ حول کے بعد لازم ہوا ہو۔" [2]

امام نووی شافعی نے لکھا ہے:

"اگر آجر کے پاس ہی کرایہ پر لگایا ہوا مکان ہو اور کرایہ دار نے ابھی اس مکان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو اور کرایہ کی رقم پر سال مکمل ہو گیا ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی۔ اس لئے کہ آجر کو اس پر ملکیت تامہ حاصل ہے۔" [3]

محقق ابن الہمام کا بیان ہے:

"طویل اجارہ جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں، اور ہر ماہ کے شروع میں تین دن کے لئے خیار شرط

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۱۳ [2] فتاوی قاضی خان ج ۱ ص ۱۱۹ ط: نول کشور لکھنو۔

[3] شرح المهذب للنووی ج ۶ ص ۲۲

لگاتے ہیں۔ اگر اس میں چند سالوں کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا جائے تو اس کی زکوۃ اجر (مالک مکان) پر واجب ہوگی۔ کیونکہ قبضہ کے ذریعہ آجر اس کا مالک ہو چکا ہے اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر بعینہٖ اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی مقدار کا لوٹانا کافی ہوگا۔ پس سمجھا جائے گا کہ یہ وہ دین ہے جو حولان حول کے بعد اس کے ذمہ آیا ہے"۔ [۱]

صاحب خلاصۃ الفتاوی نے بھی اجرت معجلہ کی زکوۃ آجر پر واجب قرار دی ہے۔ مگر لکھا ہے کہ احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں یعنی آجر اور مستاجر اس کی زکوۃ ادا کریں۔ [۲]

مگر یہاں پر محل غور و فکر پیشگی ادا کی جانے والی کرایے کی رقم نہیں ہے۔ بلکہ وہ رقم ہے جسے کرایہ دار ضمانت اور ڈپوزٹ کے طور پر ادا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں مکان / دوکان کرایہ پر لیتے وقت کرایہ کی متعینہ رقم کے علاوہ ایک بڑی رقم ڈپوزٹ / ضمانت / پگڑی کے نام پر کرایہ دار کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ رقم کرایہ دار کو درمیان میں لینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ جب وہ مکان / دوکان خالی کریگا یا اجارہ کا معاملہ ختم کیا جائے گا تو اُسے یہ رقم واپس ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمانت یا ڈپوزٹ کے طور پر دی جانے والی رقم کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ اور اس کی زکوۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی یا مالک مکان پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے۔ یہ بات تو متحقق ہے کہ مالک مکان کو اس رقم پر "ملکیت" حاصل نہیں ہے۔ صرف اس پر اس کا قبضہ ہے۔ اور وجوب زکوۃ کے لئے "ملک تام" ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی زکوۃ اس پر واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اب رہا یہ سوال کہ کرایہ دار جو اس رقم کا اصل مالک ہے اس پر اس کی زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رقم کی اصل حیثیت پر غور کر لیا جائے کہ شرعاً اس رقم کی حیثیت کیا ہے۔ اس رقم کے بارے میں چند احتمالات ہو سکتے ہیں۔

۱ــــــ اسے قرض قرار دیا جائے۔ مگر قرض ہونے کے احتمال کو عرف و تعامل رد کرتے ہیں۔ کیونکہ قرض کی صورت میں شرعاً قرض دہندہ کو اس کو اختیار رہتا ہے کہ جب وہ چاہے قرض میں دی ہوئی رقم کا مطالبہ کرے۔ مگر ڈپوزٹ کی رقم کو اجارہ کے ختم ہونے یا فسخ ہونے سے پہلے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا ہے۔

---

[۱] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۱   [۲] خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۲۳۹

اس لئے ہم اسے قرض قرار نہیں دے سکتے۔

۲ ــــ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "امانت اور ودیعت" قرار دیا جائے۔ مگر یہ احتمال بھی اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ "امانت اور ودیعت" کی صورت میں اگر سامان مودع کے پاس ہلاک ہو جائے تو اس پر تاوان واجب نہیں ہوتا ہے۔ اور ڈپوزٹ کی رقم ہر حال میں واجب الرد ہوتی ہے۔ اس لئے اسے امانت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۳ ــــ ایک احتمال یہ ہے کہ اسے "عاریت" قرار دیا جائے مگر یہ احتمال بھی اس بنا پر درست نہیں ہے کہ عاریت کی صورت میں بھی مالک کو اپنی چیز واپس لینے کا ہر وقت اختیار رہتا ہے۔ نیز عاریت حکم میں ودیعت کے ہوتی ہے۔ اور ڈپوزٹ کی رقم کو نہ تو ہر وقت واپس لینے کا اختیار رہتا ہے اور نہ ہی ہلاک ہونے کی صورت میں مالک مکان بری الذمہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ احتمال بھی درست نہیں ہے۔

۴ ــــ ایک احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "رہن" قرار دیا جائے۔ یہ احتمال درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ رہن رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دائن کی رقم مدیون کے پاس محفوظ رہے، ڈوبنے نہ پائے۔ اگر خدانخواستہ مدیون دین کی رقم لے کر فرار ہو جائے، یا اس سے انکاری ہو جائے تو دائن رہن سے اپنا دین وصول کر سکے۔ ڈپوزٹ اور ضمانت کی رقم کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کرایہ دار درمیان میں کرایہ ادا کئے بغیر مکان خالی کر کے فرار ہو جائے یا مکان میں اپنی طرف سے تغیر و تبدیلی کر دے تو مالک ڈپوزٹ کی رقم سے اپنی واجب الادا رقم وصول کر لے۔ اور نقصان کی صورت میں نقصان کی تلافی کر سکے۔ نیز جس طرح رہن میں جب تک "دین" ادا نہیں کیا جاتا ہے اس وقت تک مال رہن کی واپسی نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈپوزٹ کی صورت میں بھی جب تک مکان / دکان خالی نہ کر دی جائے یا مدت اجارہ ختم نہ ہو جائے۔ اس رقم کی واپسی نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے نزدیک اس رقم کی حیثیت مال رہن کی ہے۔ اور رہن کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اس کی زکوۃ نہ تو راہن پر واجب ہوگی اور نہ ہی مرتہن پر۔ راہن پر زکوۃ واجب نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ اگرچہ اسے مال رہن پر ملکیت حاصل ہے مگر اس پر اس کا قبضہ نہیں ہے۔ اور وجوب زکوۃ کے لئے "ملک تام" ملکاً رقبۃً اور یداً ضروری ہے جو یہاں پر مفقود ہے۔ اس لئے راہن پر اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ راہن پر اس کی زکوۃ واجب نہ ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ یہ رقم اس کی ضروریات میں مشغول ہے۔ رہائشی مکانات تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی ضرورت ہے اور وجوب زکوۃ کے لئے مال کا ضروریات اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ اور مرتہن پر عدم وجوب کی علت یہ ہے کہ مرتہن کو مال رہن پر ملکیت حاصل نہیں ہوتی ہے اگرچہ اسے قبضہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے حق میں بھی "ملک تام" کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بھی

زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حصکفی نے لکھا ہے:

"ولا فی مرھون بعد قبضہ"[1] اور مال رہن پر قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ شامی نے درمختار کے قول "ولا فی مرھون بعد قبضہ" کے تحت لکھا ہے:

"مال مرہون کی زکوۃ مرتہن پر اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ اسے صرف قبضہ حاصل ہوتا ہے ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور راہن پر اس کی زکوۃ اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ مال مرہون پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور جب مال مرہون واپس کیا جائے گا تو راہن پر گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔"[2]

اس لئے اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ:

"وہ رقم جو بطور پیشگی (ADVANCE) مالک مکان/دوکان کو دی جاتی۔ اس کی حیثیت مال رہن کی ہے۔ لہٰذا اس کی زکوۃ نہ تو کرایہ دار پر واجب ہوگی اور نہ مالک مکان پر۔ کیوں کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس رقم پر "ملک تام" حاصل نہیں ہوتا ہے۔"

مدارس اور اداروں کی رقوم پر زکوۃ

وجوب زکوۃ کے لئے شرعاً مال پر "ملک تام" حاصل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ سارے اموال جن کا کوئی متعین فرد مالک نہ ہو ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ مدارس اور اداروں میں جو رقوم جمع ہوتی ہیں ان کا مالک بھی کوئی متعین فرد نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ان رقوم پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ شامی نے درمختار کے قول "ملک نصاب" کے تحت لکھا ہے:

"فلا زکوۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک"[3]

پس وقف کے سائمہ جانور اور گھوڑے میں ملکیت کے فقدان کی وجہ سے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

---

[1] شامی ج ۲ ص ۲۶۳ [2] شامی ج ۲ ص ۲۶۳ [3] حوالہ بالا ج ۲ ص ۲۵۹

" فمنها الملك فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لان في الزكاة تمليكاً والتمليك في غير الملك لا يتصور" [۱]

وجوب زکوۃ کی ایک شرط "ملک تام" ہے۔ لہٰذا وقف کے مویشی اور گھوڑوں میں عدمِ ملک کی وجہ سے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور اس لئے کہ زکوۃ میں تملیک ہوتی ہے اور ملک غیر میں تملیک کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے :

" ولا زکوۃ فی المال الموقوف لعدم الملک فیه " [۲]

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

" فلا زکاۃ فی سوائم الوقف والخیل الموقوفة " [۳]

حضرت امام شافعی کا بھی یہی مشہور قول ہے کہ وقف اور مدارس کے اموال میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ المجموع میں ہے :

" اس باغ کے پھل اور زمین کے غلہ پر جو جہت عامہ پر وقف ہو، جیسے مدارس، مساجد، فقراء، مجاہدین وغیرہ۔ زکوۃ واجب نہیں ہوگی، امام شافعی کا یہی مشہور قول ہے اور شوافع کے نزدیک اسی قول پر عمل ہوتا ہے۔" [۴]

فقہ حنبلی کے مطابق بھی مدارس اور اداروں کے اموال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ الفروع میں ہے :

" ولا زکوۃ فی وقفٍ علی غیر معینٍ أو علی المساجد والمدارس والربط ونحوها " [۵]

مالِ حرام پر زکوۃ کا حکم

کسی شخص کے پاس مال حرام کے جمع ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں :۔

---

[۱] بدائع ج ۲ ص ۹ [۲] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۹۲

[۳] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۴۲ [۴] المجموع شرح المہذب ج ۵ ص ۵۷۵

[۵] کتاب الفروع لابن مفلح ج ۲ ص ۳۳۶

(الف) : اس شخص کے پاس سارا مال حرام ہی ہو۔ جو اس نے ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کر کے جمع کر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا حلال وطیب مال نہ ہو۔ اس صورت میں اس شخص کو مالِ حرام پر ملکیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ سارا ہی مال ناپاک اور خبیث ہونے کی بناء پر واجب التصدق ہے۔ یا اگر جن لوگوں سے ناجائز طور پر مال حاصل کیا گیا تھا وہ معلوم ومتعین ہیں تو ان تک اس مال کی واپسی لازم اور ضروری ہے۔ اس صورت میں چوں کہ سارا ہی مال واجب التصدق یا واجب الرد ہے، اس لئے اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مال خبیث پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور وجوب زکوۃ کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہے۔ شامی میں ہے :

" لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمہ الزکاۃ لان الکل واجب التصدق فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ " [۱]

اگر کسی شخص کے پاس مال خبیث بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ پوری رقم واجب التصدق ہے۔ پس صرف زکوۃ کی مقدار صدقہ کو واجب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کتاب البیوع میں شامی نے مال حرام کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

الحاصل انہ ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیھم والا فان علم عین الحرام لا یحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ " [۲]

حاصل یہ ہے کہ اگر ارباب اموال معلوم ہوں تو ان تک مال کا لوٹانا واجب ہوگا۔ ورنہ اگر عین حرام کا علم ہو تو وہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور صاحب مال کی نیت سے اس کا تصدق ضروری ہوگا۔

بحرالرائق میں ہے :

" ملکہ ملکاً خبیثاً فسبیلہ التصدق بہ " [۳]

علامہ یوسف القرضاوی نے مال حرام پر زکوۃ کے عدمِ وجوب کی علت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

---

[۱] شامی ج ۲ ص ۲۵ [۲] بحوالہ بالا ج ۴ ص ۱۸۰ [۳] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۳۶

"وجوب زکوۃ کے لئے ملکیت کی جو شرط لگائی گئی ہے۔ اس سے وہ مال خارج ہو جاتا ہے جسے ناپاک اور حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ جیسے غصب، چوری، رشوت، سود اور فریب دہی کے ذریعہ حاصل کئے گئے اموال ..... صحیح بات یہ ہے کہ لوگ اس قسم کے اموال کے مالک نہیں ہوتے ہیں اگرچہ انھوں نے اپنے جائز مال کے ساتھ اسے اس طرح ملالیا ہو کہ دونوں کو علحدہ کرنا مشکل ہو۔ علماء کہتے ہیں کہ اگر مال خبیث بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مال کی ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کردے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اس کا حقدار معلوم ہو تو اس کو اس کا حق پہنچائے یا اس کے ورثہ کے حوالہ کرے۔ بصورت دیگر فقراء پر صدقہ کردے۔ اور دریں صورت پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا صرف اس کے ایک حصہ (یعنی زکوۃ کی حد تک) صدقہ کرنے کا حکم دینا مفید نہیں ہوگا"[1]

(ب) : دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ حلال وطیب مال بھی ہو۔ اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی :

۱ــــ مال حلال اور مال حرام علیحدہ علیحدہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ممتاز و ممیز ہوں تو اس صورت میں بھی مال حرام پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مال حرام واجب التصدق ہوگا یا اصحاب اموال معلوم ہوں تو ان تک واپسی ضروری ہوگی۔

۲ــــ مال حرام اور مال طیب کو اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مال میں زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں ؟ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین امام ابویوسف، امام محمد کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دراہم ودنانیر (موجودہ دور میں کرنسی نوٹ بھی دراہم ودنانیر کے حکم میں ہیں) کا اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان کے درمیان تمییز ممکن نہ ہو، استہلاک ہے۔ لہٰذا اس استہلاک کی وجہ سے وہ شخص پورے مال کا مالک بن جائے گا البتہ مال حرام کی مقدار کا وہ ضامن قرار پائے گا اور اس پورے مخلوط مال میں زکوۃ واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

صاحب ولوالجیہ نے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ بہت کم ایسے

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۳

لوگ ہیں جن کے پاس صرف مال حلال وطیب ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر لوگوں کے مال میں غصب وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ :

"اگرچہ امام صاحب کے قول کے مطابق "خلط" اور "استہلاک" کے ذریعہ وہ مال حرام کا مالک بن جائے گا۔ مگر وہ اس مقدار مال کا ضامن ہوگا تو گویا وہ مال مشغول بالدین ہوا۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا امام صاحب کے قول کے مطابق بھی اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اسی لئے مجتبیٰ میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کردیں۔ تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ ابرار سے قبل وہ رقم مشغول بالدین ہوگی۔ یہ قید بہت مناسب ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔"[1]

فتاویٰ تاتارخانیہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خلط کی صورت میں بھی امام صاحب کے قول کے مطابق صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ اس کے پاس مال مخلوط کے علاوہ دوسرا طیب وحلال مال بقدر نصاب موجود ہو۔ اگر دوسرا نصاب نہ ہو تو چاہے مال مخلوط جس مقدار میں بھی ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چنانچہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے :

"ومن ملك اموالاً غير طيبة او غصب اموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن سواها نصاب فلا زكوة عليه في تلك الاموال وان بلغت نصابًا لانه مديون ومال المديون لا ينعقد سببًا لوجوب الزكاة عندنا"[2]

اور درمختار میں ہے :

"وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكوة عليه"

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی صرف اس صورت میں مال مخلوط پر وجوب زکوٰۃ ہوگا جب کہ مال حرام کا مالک اسے بری الذمہ کردے۔ یا یہ شخص اس کے اصل

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۵ [2] فتاوی التاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۸۹

مالک سے کچھ مال کے بدلے مصالحت کرے تو اس صورت میں چوں کہ اس مال کا خبث زائل ہو جائیگا اس لئے اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔

"لکن علمت انه لا تجب زکاته الا اذا استبرأ من صاحبه او صالح منه فیزول خبثه" [1]

صاحبین فرماتے ہیں کہ مال حرام کو مال حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے وجوب ضمان نہیں ہوتا ہے۔ اور چوں کہ ضمان ہی کی فرع ملکیت ہے، اس لئے اس مال پر اسے ملکیت بھی حاصل نہیں ہوگی۔ لہذا اس مال پر نہ تو زکوۃ واجب ہوگی اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی کیونکہ وہ مال مشترک ہے، لہذا جتنا اس میں میت کا حصہ تھا صرف اسی میں وراثت جاری ہوگی۔

علامہ ابن نجیم مصری نے مالِ حرام پر وجوب زکوۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ولهذا قالوا لو ان سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملكاً له حتى وجبت عليه الزكاة وورث عنه على قول ابي حنيفة لان خلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهلاك اما على قولهما فلا يضمن فلا يثبت الملك لانه فرع الضمان فلا يورث عنه لانه مال مشترك فانما يورث حصة الميت منه وفي الولوالجية وقوله ارفق بالناس اذ قلّما يخلو مال عن غصب۔ هكذا ذكروا وهو مشكل لانه وان كان ملكه عند ابي حنيفة بالخلط فهو مشغول بالدين والشرط الفراغ فينبغي ان لا تجب الزكاة فيه على قوله ايضاً ولهذا شرط في المبتغى بالمعجمة ان يبرء منه اصحاب الاموال لانه قبل الابراء مشغول بالدين وهو قيد حسن يجب حفظه" [2]

اور اسی بنیاد پر فقہائے کہا ہے کہ اگر بادشاہ نے مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو وہ مال اس کی ملک ہو جائے گا۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق اس مال پر زکوۃ بھی واجب ہوگی۔ اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اس لئے کہ ان

---

[1] شامی ج ۲ ص ۳۰۱   [2] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۵

کے نزدیک اپنے دراہم کو دوسرے کے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے۔ لیکن صاحبین کے قول کی بنیاد پر وہ ضامن نہیں ہوگا۔ اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ملکیت ضمان کی فرع ہے۔ لہٰذا اس مال میں وراثت بھی جاری نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔ ولوالجیہ میں امام صاحب کے قول کو "ارفق بالناس" قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ بہت کم مال غصب وغیرہ سے پاک ہوتا ہے۔ فقہائے نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے قول کے مطابق زکوٰۃ کا وجوب مشکل ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ خلط کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو جائیگی لیکن وہ مال مشغول بالدین ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہیئے اسی بنیاد پر منتقی میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کر دیں اس لئے کہ ابراء سے قبل وہ رقم مشغول بالدین ہوگی۔ یہ قید بہتر ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

علامہ ابن الہمام نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور اسی بنیاد پر فقہاء نے کہا کہ اگر سلطان نے کسی کا مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو اس پر اسے ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک دوسرے کے دراہم کو اپنے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے۔ لیکن صاحبین کے قول کے مطابق یہ استہلاک نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس مال کا ضامن نہیں ہوگا اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔ کیونکہ ملکیت ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ ہی اس پورے مال میں وراثت جاری ہوگی۔ اس لئے کہ وہ مال مشترک ہے۔ پس صرف میت ہی کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔"[1]

---

[1] فتح القدیر ج ۲ ص۱۱۳

علامہ حصکفی نے مالِ مخلوط پر زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" اگر سلطان نے مالِ مغصوب کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور وراثت جاری ہوگی۔ اس لئے کہ دوسرے کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو امام ابو حنیفہ کے نزدیک استہلاک ہے۔ امام صاحب کا قول " ارفق بالناس " ہے اس لئے کہ بہت کم ہی مال ایسا ہوتا ہے جو غصب وغیرہ سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہوگا جب کہ اس کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہو جس سے وہ دین ادا کر سکے۔ ورنہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ شامی میں ہے : صاحبین کے قول کے مطابق وجوبِ ضمان نہیں ہوگا۔ لہذا ملکیت بھی ثابت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ اس مال میں وراثت جاری ہوگی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی "۔[۱]

ان تفصیلات کی روشنی میں مالِ حرام جو مخلوط ہو اس کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ :

" اس مال پر حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کی بنیاد پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیوں کہ مالِ حرام کو مالِ حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے بوجہ استہلاک اگرچہ اسے اس مال پر " ملکیت " حاصل ہو جائے گی۔ مگر چوں کہ وہ اس مقدار کا ضامن ہوگا۔ اور اس پر واجب ہوگا کہ مالِ حرام کی جتنی مقدار اس نے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ اسے صاحبِ مال تک لوٹا دے۔ یا اگر صاحبِ مال کا علم نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے "۔

اس طرح سے وہ رقم مشغول بالدین ہوئی۔ حالاں کہ وجوبِ زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس مال پر وجوبِ زکوٰۃ کی یہ صورتیں ہیں :

(الف) اس شخص کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے ذمہ واجب دین کو ادا کر دے تو بھی اس کے پاس بقدرِ نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ درمختار میں ہے :

---

[۱] شامی ج ۲ ص ۲۹۰

"وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه
والا فلا زكوة" [1]

(ب) جن لوگوں سے اس نے حرام طریقے سے حاصل کیا تھا وہ لوگ اپنی اپنی رقم سے اسے بری الذمہ کردیں، یا وہ شخص صاحب اموال سے کچھ مال دے کر مصالحت کرلے تو اس صورت میں چوں کہ مال حرام کا خبث دور ہو جائے گا اور وہ شخص پورے طور پر اس مال کا مالک بن جائے گا۔ اس لئے اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ شامی میں ہے:

"الا اذا استبرأ من صاحبه او صالح عنه فيزول خبثه" [2]

۵ ــــ دیون کی زکوۃ

ملک تام کی شرط کے ذیل میں دیون کی زکوۃ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زکوۃ شرعاً کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک تو ہے لیکن قبضہ نہیں۔ یا مدیون پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے، لیکن اس کی ملک میں نہیں یا دین کی زکوۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔

دیون کی زکوۃ کے بارے میں امام ابوعبید (م ۲۲۴ھ) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الاموال" میں ائمہ سلف کے پانچ اقوال ذکر کئے ہیں:۔

۱ ــــ اگر دین کسی مالدار شخص کے ذمہ ہو تو اپنے دیگر اموال کے ساتھ دین کی بھی زکوۃ ادا کی جائے گی۔

۲ ــــ اگر دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو، پھر وہ وصول ہو جائے تو قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوۃ دینی پڑے گی۔

۳ ــــ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوۃ واجب ہوگی چاہے اس مال پر جتنا بھی سال گزرا ہو۔

۴ ــــ دین کی زکوۃ صرف قرض لینے والے پر واجب ہوگی، قرض دینے والے پر نہیں۔

۵ ــــ دین کی زکوۃ نہ تو دائن پر واجب ہوگی اور نہ مدیون پر۔ چاہے مدیون ثقہ اور مالدار ہو۔

[1-2] شامی ج ۲ ص ۲۹۱

ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ سفیان ثوری اور فقہاء عراق کی رائے ہے کہ اگر دین کے وصول ہونے کی امید ہو تو اس صورت میں گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ اور اگر دین کے وصولیابی کی امید نہ ہو تو اہل عراق کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی [۱]

تابعین میں سے حضرت عکرمہ، اور عطا بن ابی رباح اس بات کے قائل ہیں کہ دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی [۲]۔ ابن حزم نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ: لیس فی الدین زکاۃ۔ دین میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ظاہریہ کا یہی مسلک ہے [۳]۔

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک دیون کی دو قسم ہے:

۱۔۔۔۔ ایک قرض وہ ہے جس کی وصولیابی متوقع ہو یعنی قرض ایسے شخص پر ہو جو اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔ ایسے دین کی زکوٰۃ اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ہر سال ادا کی جائے گی۔ ابو عبید نے صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"تابعین میں سے حسن بصری، ابراہیم، جابر بن زید، مجاہد اور میمون بن مہران کا یہی فتوی ہے [۴]"

۲۔۔۔۔ دوسرا قرض وہ ہے جس کی وصولیابی کی توقع نہ ہو۔ یعنی دین ایسے کسی شخص پر ہو تو تنگدست ہو۔ اور اس کے خوشحال ہونے کی امید نہ ہو۔ یا دین ایسے شخص پر ہو جو اس کا انکار کر رہا ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو اس صورت کا حکم مختلف فیہ ہے۔ اس کے بارے میں فقہائے کے دو اقوال ہیں:

۱۔۔۔۔ پہلا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔۔۔۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ حسن، عمر بن عبدالعزیز کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک کے نزدیک دیون کی تمام اقسام کا یہی حکم ہے۔

۳۔۔۔۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس مال پر نہ تو ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ گذشتہ سالوں کی

---

[۱] کتاب الاموال ص۵۲۶-۵۲۷ — [۲] بحوالہ بالا ص۵۳۳
[۳] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص۱۳۵ — [۴] کتاب الاموال ص۵۳۱

بلکہ قبضہ کے بعد جب حولان حول ہوجائے گا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد کا یہی مذہب ہے۔[۱]

حنفیہ کے نزدیک وہ دین جس کی وصولیابی کی امید نہ ہو پھر اتفاق سے وہ وصول ہوجائے تو اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ یہ قول حضرت علی مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ ابن الہمام نے حضرت حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کا بھی یہی مسلک ذکر کیا ہے۔[۲]

دین کے قابل وصول ہونے کی اور ناقابل وصول ہونے کے لحاظ سے فقہاء احناف نے دین کے اندر یہ تفصیل کی ہے:

۱۔ ایسا مقروض جو قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور وہ قرض کا اقرار بھی کرتا ہو تو اس کے ذمہ واجب الاداء دین کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی پڑے گی۔ اگر مقروض تنگدست ہو تو بھی مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی لیکن حسن بن زیاد کی روایت یہ ہے کہ تنگدست پر دین ہونے کی صورت میں اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

۲۔ ایسا شخص جس کا دیوالیہ ہوگیا ہو اور اسلامی حکومت نے اس کے دیوالیہ پن کی وجہ سے اُسے "مفلس" قرار دے دیا ہو، صاحبین کے قول کے مطابق ایسے شخص کے ذمہ جو دین ہوگا اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حکومت اور عدالت کی رائے کسی شخص کے دیوالیہ اور تفلیس کی بابت معتبر نہیں ہے، لہٰذا اس کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی ہوگی۔ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی صاحبین کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔[۳]

اسی طرح اگر مدیون دین سے انکاری ہو اور اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو تو مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی۔ مگر عدالت کی پیروی اور قاضی کے فیصلہ حاصل کرنے میں جو دشواریاں ہیں ان کے پیش نظر علماء نے اس صورت میں دائن پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے، کیونکہ

---

[۱] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۶-۱۳۷ [۲] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۳

[۳] ھدایہ مع فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۳

گواہی کے لئے گواہوں کو عدالت کے سامنے پیش کرنا اور قاضی سے انصاف کی توقع رکھنا مشکل ہے۔[1]

لیکن اس سلسلہ میں حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وہ دین جس سے مدیون انکاری ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ آئندہ اگر خلاف توقع وہ دین وصول بھی ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔[2]

دیون کی اقسام اور ان کا حکم

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے :۔

۱ ـــــ **دین قوی** : ـــــ وہ دین جو مال تجارت کے بدلے میں واجب ہوا جیسے سامان تجارت کی قیمت، تجارت کے غلام اور مال تجارت کے غلہ کی قیمت، قرض بھی اسی حکم میں ہے، اسے "دین قوی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دین قوی کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے مابین زکوٰۃ کے وجوب کی بابت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جب دین کا ایک خمس چالیس درہم وصول ہو جائے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اور چالیس میں سے ایک درہم ادا کرنا پڑے گا۔ صاحبین کہتے ہیں کہ جتنا جتنا دین وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔[3]

۲ ـــــ **دین متوسط** : ـــــ وہ دین جو کسی مالی عوض کے طور پر واجب ہو مگر وہ سامان تجارت کی قیمت نہ ہو بلکہ ایسے مال کے بدلے میں واجب ہو جس میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑوں اور رہائشی مکان کی قیمت، خدمت کے غلام کی قیمت۔ ایسے دین کو "دین متوسط" کہا جاتا ہے۔ دین متوسط کے بارے میں امام ابوحنیفہ سے دو روایت ہے۔ ایک روایت کے مطابق "دین متوسط" ان کے نزدیک "دین قوی" کے حکم میں ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق "دین ضعیف" کے حکم میں۔ کتاب الاصل میں امام صاحب کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا۔ البتہ ادائیگی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب اس پر قبضہ ہو جائے۔[4]

---

[1] عنایہ علی ہامش الهدایہ ج ۲ ص۲۲۲ [2] ہدایہ علی ہامش الفتح ج ۲ ص۱۲۱

[3] بدائع ج ۲ ص۱۰، البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲، المبسوط ج ۲ ص۱۹۵ [4] حوالہ بالا

ابن نجیم نے لکھا ہے :

"صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کے نزدیک" دین وسط" پر اس وقت زکوۃ واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب دین پر قبضہ ہو جائے۔ البتہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ دینی پڑے گی۔ اور قول ضعیف کے مطابق گذشتہ سالوں کی زکوۃ نہیں دینی پڑے گی"[۱]

ابن سماعۃ نے امام ابو یوسف کے واسطے سے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ دین کی صرف دو قسم ہے اور انھوں نے" دین وسط" کو" دین ضعیف" قرار دیا ہے۔ کرخی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[۲]

صحیح قول کے مطابق دین قوی اور دین متوسط میں صرف اتنا فرق ہے کہ دین قوی کے ایک خمس کی وصولیابی پر زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، جب کہ دین متوسط کی صورت میں بقدر نصاب مال پر قبضہ ضروری ہوتا ہے۔ صاحبین کے نزدیک سارے دیون برابر ہیں۔ قبضہ سے پہلے ان کی زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ جتنی مقدار پر قبضہ ہوتا جائے گا اس کی زکوۃ ادا کرنی پڑے گی۔[۳]

۳ ـــــ **دینِ ضعیف** ـــــ وہ دین جو کسی مالی عوض کے بدلے میں واجب نہیں ہوتا ہے۔ جیسے مہر کی رقم، خلع، اور صلح عن القصاص کی رقم۔ اس دین کا حکم یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ وصولیابی کے بعد جب اس رقم پر مکمل ایک سال گزر جائے گا تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے :

" ولا زکوۃ فیہ مالم یقبض ویحول علیہ الحول بعد القبض "[۴]

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک دیون کی مذکورہ تمام قسموں پر زکوۃ واجب ہوگی لیکن ادائیگی قبضہ کے بعد ہوگی۔ دین قوی میں خمس نصاب یعنی کم سے کم چالیس درہم کی وصولیابی کے بعد زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی اور دین متوسط اور دین ضعیف میں نصاب کی مالیت کے بقدر قبضہ میں آنے کے بعد زکوۃ کی ادائیگی کا حکم ہوگا۔ البتہ دین متوسط میں گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ دینی پڑیگی جب کہ دین ضعیف میں حولان حول کے بعد زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

مالکیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں :۔

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۳   [۲] المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۱۹۵

[۳] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۳، بدائع ج ۲ ص ۱۰، مبسوط ج ۲ ص ۱۹۵   [۴] بدائع ج ۲ ص ۱۰

۱۔۔۔۔ دین کی ایک قسم وہ ہے جس پر قبضہ کے بعد مکمل ایک سال گزرنے کے بعد زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے وراثت، ہبہ، وقف، صدقہ، عورت کا مہر اور خلع کا عوض، اسی قبیل کے دین سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تمام دیون میں قبضہ سے پہلے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سے جب ایک سال اس پر گزر جائے گا تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔

۲۔۔۔۔ دوسرے وہ دین ہے جس میں صرف ایک سال کی زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ جیسے دین قرض اور دین تجارت۔ جسے حنفیہ کے نزدیک "دین قوی" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح کے دین میں مالکیہ کے نزدیک حسب ذیل چار شرطوں کے ساتھ وجوبِ زکوۃ ہوگا۔

۱۔۔۔ قرض کی اصل سونا، چاندی ہو۔ یا جمع کئے گئے سامان تجارت کی قیمت ہو۔ مثلاً تجارتی کپڑوں کی قیمت۔

۲۔۔۔ اس دین کے ایک حصہ پر دائن کا قبضہ ہو چکا ہو۔ اگر دین کا کچھ بھی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

۳۔۔۔ قبضہ کی ہوئی شئی نقد سونے چاندی کے قبیل سے ہو۔ اگر اس نے سامانِ تجارت مثلاً کپڑے یا گیہوں پر قبضہ کیا تو اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

۴۔۔۔ جتنے مال دین پر اس کا قبضہ ہوا ہے وہ کم سے کم بقدر نصاب ہو۔ یا اگر نصاب سے کم ہو مگر اس کے پاس دوسری مالیت ہو جس کے ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

۳۔۔۔۔ تیسرے دین مدیر ہے: دین مدیر سے اس تاجر کا دین مراد ہے جو موجودہ قیمت کے ساتھ خرید و فروخت کرتا ہے۔ پس اگر دین کی اصل سامان تجارت ہو تو وہ ہر سال دین کی زکوۃ ادا کریگا۔[1] شوافع کے نزدیک اگر دین درہم و دینار یا سامانِ تجارت کی قیمت کے قبیل سے ہو تو جب دائن اپنے دین پر قبضہ کرلے گا یا اپنے دین کے حاصل کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو جائے گی تو گذشتہ تمام سالوں کی اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ اگر دین مویشی اور مطعوم کے قبیل سے ہو تو اس پر زکوۃ واجب

---

[1] الشرح الکبیر ج ۱ ص ۴۵۸، بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۴۳، الشرح الصغیر ج ۱ ص ۶۲۴، الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۷۰-۷۷۹

نہیں ہوگی۔[۱]

دین کے بارے میں حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے دین معجل ہو یا مؤجل اور چاہے مقروض دین کا اقرار کرنے والا ہو یا اس سے انکاری ہو۔ اور چاہے وہ تنگدست ہو یا خوشحال یا ٹال مٹول کرنے والا۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد واجب ہوگی۔ اور گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔[۲]

۴۔۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

"ملک تام" ہی کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں سرکاری محکموں مختلف پرائیویٹ کمپنیز اور اداروں میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں۔ ان کی ماہانہ تنخواہ میں سے ایک متعین حصہ وضع کرکے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکار یا کمپنی اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ریٹائرمنٹ .... کے وقت وہ پوری رقم مع بونس کے ملازم کو دے دی جاتی ہے۔ دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ (P.F) کہلاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے بعد واجب ہوگی تو گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ یا قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ پراویڈنٹ فنڈ (P.F) پر زکوٰۃ کا حکم لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کی حیثیت کی تعیین کر لی جائے کہ دین کی کس قسم میں اس کا شمار ہے، پھر اس پر حکم لگانا آسان ہوگا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے:

دین قوی: ۔۔۔۔ وہ ہے جو سامان تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذمہ واجب ہو۔ (اس کی تفصیل دیون کی بحث کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

دین متوسط: ۔۔۔۔ جو مالی معاوضہ کے طور پر ذمہ میں واجب ہو مگر وہ ایسے سامان کی قیمت ہو جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑے اور رہائشی مکان کی قیمت۔

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۷۰   [۲] المغنی ج ۳ ص ۴۶

دین ضعیف :۔ جو مالی معاوضہ کے بغیر واجب ہو۔ جیسے عورت کا دین مہر، خلع اور صلح کی رقم۔

ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کو "دین قوی" قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کسی سامان تجارت کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اور خدمت مال تجارت ہے یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ:

"غلام اور مکان اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ جو غلام اور مکان تجارت کے لئے ہو اس کی خدمت و اجرت کو "مال تجارت" قرار دیا گیا ہے[۱] تو جب غلام کی خدمت کو علی الاطلاق مالِ تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ صرف تجارت کے غلام کی خدمت کو مالِ تجارت قرار دیا گیا تو آزاد شخص کی خدمت کو بدرجہ اولیٰ "مال تجارت" قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔"

اب صرف دو احتمال باقی رہ جاتا ہے :۔

۱۔ اگر خدمت کو مال تجارت قرار دیا جائے تو وہ "دین متوسط" میں داخل ہوگا۔

۲۔ اور اگر اسے مال ہی قرار نہ دیا جائے تو وہ "دین ضعیف" میں داخل ہوگا۔

خدمت و اجرت کے بارے امام ابوحنیفہ سے دو قول منقول ہے :۔

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ "دین متوسط" کے حکم میں ہے اور قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ مبسوط جامع اور امالی میں امام صاحب سے یہی قول منقول ہے۔ علامہ شمس الدین سرخسی نے اس قول کو "اصح" قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منفعت عقد کے ذریعہ "مالیت" کا حکم لے لیتی ہے۔ اس قول کے مطابق اس پر زکوۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہے۔

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ جب تک دو سو درہم (بقدر نصاب) پر قبضہ نہ ہو جائے زکوۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس درہم پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خدمت و اجرت "دین ضعیف" کے حکم میں ہے، اور وہ مہر کی طرح ہے۔

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲

امام ابویوسف نے اسے امام صاحب سے نقل کیا ہے۔ اس قول کے مطابق اس کی وصولیابی کے بعد جب حولان حول ہو جائیگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہو گی[۱]

اجرت و خدمت کے بارے میں تیسری روایت یہ ہے کہ اجرت و خدمت علی الاطلاق نہ تو مال ہے اور نہ غیر مال۔ بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا مکان تجارت کی اجرت ہے تو وہ مال ہے، ورنہ مال نہیں ہے۔ صاحب مبسوط نے اس روایت کو "اصح" قرار دیا ہے[۲]

مگر یہ سب مباحث اور روایات کا اختلاف غلام کی خدمت کے بارے میں ہے، جو من وجہ مال ہے۔ آزاد کی خدمت کے مال ہونے کی صراحت کسی فقیہ نے نہیں کی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں پراویڈنٹ کی رقم "دین قوی" میں داخل نہیں ہو سکتی اور اسے "دین متوسط" میں بھی داخل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ مل جائے۔ اور اگر بالفرض اسے "دین متوسط" میں داخل بھی کر دیا جائے تو صحیح قول کے مطابق اس کا حکم بھی "دین ضعیف" کی طرح یہی ہے کہ اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔

لہذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ البتہ جب وہ رقم قبضہ میں آجائے گی تو سال مکمل ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہو گی۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے (P.F) پر زکوٰۃ کا عدم وجوب ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس جمع شدہ روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ وصول کے بعد سے اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اس تفصیل سے کہ اگر اس کے پاس پہلے سے کوئی نصاب نہیں تب تو بعد حولان حول کے اور اگر کوئی نصاب ہو تو اس نصاب کی زکوٰۃ کے ساتھ"[۳]

مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے لکھا ہے:

> "روایات فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے احقر کو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں"[۴]

---

[۱] المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۴۳ [۲] بحوالہ بالا

[۳-۴] امداد الفتاوی ج ۲ ص ۴۵

۲ــــ دوسری شرط نما

نما کی تعریف اور اس کی حقیقت

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا "نامی" ہونا ہے۔ نما، بالمد لغت میں زیادتی اور بڑھوتری کے معنی میں آتا ہے۔ جدید اصطلاح میں نما یا نمو کے معنی ہیں وہ مال جو صاحب مال کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں:۔

نما حقیقی اور نما تقدیری ـــــ حقیقی کا اطلاق مویشیوں کی نسل بڑھنے اور کاروبار میں اضافہ ہونے پر ہوتا ہے۔ اور تقدیری کا اطلاق ایسے مال پر ہوتا ہے جس کو بڑھایا جانا ممکن ہو، یعنی اضافہ پذیری کی صلاحیت رکھنے والا مال، صاحب مال یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔ [۱]

لہٰذا وہ مال جس میں صاحب مال اپنے ذریعہ یا اپنے نائب کے ذریعہ اضافہ اور بڑھانے پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس مال پر اسے ملکیت حاصل ہو۔ جیسے مال ضمار، اور اسی وصف نما کے فوت ہونے کی وجہ سے مالِ مفقود، عبد آبق، دریا میں گرے ہوئے مال، صحرا میں دفن کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی گئی ہے۔ [۲]

حیوانات میں نمو اور افزائش نسل کے ذریعہ ہوتی ہے اور حیوانات کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ، سونے اور چاندی میں خلقی طور پر نما پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہر حال میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ شریعت نے وجوب زکوٰۃ کے لئے حقیقت نما کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، کیونکہ نما ایک امر خفی ہے۔ اور اس میں لوگوں کے طریقے اور ان کی عادتیں باہم مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے حیوانات کے اندر "اسامہ" کو حصول نسل کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ اور حیوانات، اور سونے چاندی کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کی نیت سے اسے اپنے پاس مکمل ایک سال روک کر رکھنے کو حصول نما کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ [۳]

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۲، شامی ج ۲ ص ۲۶۳، بدائع ج ۲ ص ۱۱ [۲] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۹

[۳] بدائع ج ۲ ص ۱۱، الفتاوی التاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۴۷

نمو کے شرط ہونے کی حکمت

محقق ابن الہمام نے "نمو" کے شرط لگانے کی حکمت ومصلحت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" اگرچہ زکوۃ کا مقصد ابتلاء ہے تاہم اس سے مقصود فقرائ کے ساتھ مواساۃ اور ہمدردی ہے اس طور سے کہ وہ خود فقیر نہ بن جائے ۔ اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ وہ اپنے کثیر مال میں سے تھوڑا سا مال ان پر خرچ کرے ۔ لہذا اگر اموال غیر نامیہ میں زکوۃ واجب کی جاتی تو چند سال گزر جانے کے بعد اس کے برعکس صورت پیدا ہوسکتی ہے ۔" [1]

وہ اموال جن کی نشوونما رک گئی ہو ان پر زکوۃ

نمو کے ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اموال جن کی نشوونما اور افزائش رک گئی ہو ۔ ان زکوۃ واجب ہو گی یا نہیں ؟ اگر اس پر زکوۃ واجب کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ وہ مال ہی ختم ہو جائیگا ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مال کے نمو میں رکاوٹ کی دو صورتیں ہیں :

۱ ـــــ ایک وہ رکاوٹ ہے جو نفس مال کی طرف سے ہو ۔

۲ ـــــ دوسری وہ ہے جو صاحب مال کی طرف سے ہو ۔

جو رکاوٹ مال کی طرف سے ہو مثلاً مال غصب کر لیا گیا ہو اور مال مغصوب کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو یا ایسا قرض جس کے واپس ملنے کی کوئی امید نہ ہو ۔ یا مال دریا میں گر گیا ہو ، یا مال صحرا میں دفن کیا گیا اور دفن کی جگہ بھول گیا ہو تو ان صورتوں میں اصحاب اموال شرعاً معذور قرار پائیں گے اور قبضہ سے پہلے ان اموال کی زکوۃ واجب نہیں ہو گی ۔

رہی وہ رکاوٹ جو خود صاحب مال کی طرف سے ہو تو عدم افزائش کے معاملے میں شریعت نے اس عذر کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے ۔ اور رکاوٹ کے اسباب کی تفصیلات میں گئے بغیر اس پر زکوۃ واجب قرار دی گئی ہے ۔ کیوں کہ ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال کو نفع بخش

---

[1] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۳

بنانے کی کوشش کرے اور ہر جائز ذریعہ سے اس میں اضافہ کی کوشش کرے[1]

۳ ـــ تیسری شرط ـ حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا "حاجت اصلیہ" سے فارغ ہونا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہے اور اسے اس مال پر "ملک تام" بھی حاصل ہے اور وہ مال نامی بھی ہے مگر وہ مال اس کی حاجت اصلیہ میں مشغول ہے، تو شرعاً اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مال کے حاجت اصلیہ سے فارغ ہونے کو وجوب زکوٰۃ کی شرط اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر غنا (مالداری) اور نعمت کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیہ کا محتاج ہوتا ہے اسے عرفاً مالدار ہی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور نہ وہ شخص برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ علامہ کاسانی نے اس کے شرط ہونے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> "مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ غنا درحقیقت اسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیہ کا محتاج ہوگا وہ غنی نہیں کہا جاسکتا۔ اور نہ اس صورت میں تنعم کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے شکر کے طور پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔ اور نہ ہی اس صورت میں برضا و رغبت زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش دلی اور برضا و رغبت اپنے اموال کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔"[2]

فقہاء کی اصطلاح میں حقیقۃً حاجت اصلیہ میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کا انسان اپنی بقاء و تحفظ کے لئے محتاج ہو، مثلاً اشیاء خورد و نوش، ہر موسم کے لحاظ سے لباس، رہائشی مکان، فرنیچر، اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں، اہل حرفت کے لئے آلات حرفت، اور وہ ساری چیزیں حاجت اصلیہ کے دائرہ میں آتی ہیں جنھیں عرفاً ضروریات زندگی سمجھا جاتا ہے۔ علامہ ابن نجیم اور ابن عابدین شامی نے ابن الملک کے حوالہ سے حاجت اصلیہ کی یہ تعریف کی ہے:

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۴۳ [2] بدائع ج ۲ ص ۱۱

"بمایدفع الهلاك عن الانسان تحقیقاً کالنفقه ودورالسکنی وآلات الحرب والثیاب المحتاج لدفع الحر اوالبرد اوتقدیراً کالدین فان المدیون محتاج الی تضائه بمافی یده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذی هوکالهلاك وکآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الرکوب وکتب العلم لاهلهافان الجهل عندهم کالهلاك" [1]

"حاجت اصلیہ وہ چیزیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کر دیں۔ تحقیقاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلات حرب، گرمی اور سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے۔ یا تقدیراً جیسے قرض کیوں کہ قرضدار ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کو قید سے بچانے کے لئے جو ہلاکت کے مترادف ہے نصاب کے مال میں سے قرض ادا کرے۔ اسی طرح آلات حرفت گھریلو سامان، سواری کے جانور، اور اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک جہالت بھی ہلاکت ہی کے مثل ہے:"

حاجت اصلیہ کا مفہوم، زمان و مکان کے تغیر سے بدلتا رہے گا

حاجت اصلیہ کا تعلق دراصل انسان کی شخصی اور انفرادی ضروریات سے ہے، جس میں زمان و مکان، عرف و تعامل اور ماحول کے لحاظ سے تبدیلی عین فطرت ہے۔ حالات و زمانے اور مکان و ماحول کے تغیر سے انسان کی بنیادی حاجتیں بھی بدلتی رہتی ہیں اس لئے حاجت اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین کرنا مشکل ہے۔ اسے مبتلی بہ کے حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حاجت اصلیہ کی تعریف سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ بہت ہی مختصر، محدود اور تنگ ہے۔ اور اس کے اندر صرف وہی چیزیں داخل ہیں، جو انسان کو ہلاکت سے یقینی طور پر بچاتی ہیں۔ مگر حاجت اصلیہ کے ذیل میں جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ کافی حد تک وسیع اور تمام ہی ضروریات زندگی کو شامل ہے۔ فقہاء کرام نے جس طرح ہلاکت جسمانی کا لحاظ کر کے اس سے تحفظ دینے والی اشیاء کو اس کے دائرہ میں شمار کیا ہے۔

---

[1] شامی ج ۲ ص۲۶۲، بحر ج ۲ ص۲۰۶

اسی طرح انھوں نے ہلاکت معنوی اور روحانی کا بھی اعتبار کیا ہے۔ اور اس سے بچانے والی چیزوں کو "حاجت اصلیہ" کا عنوان دیا ہے۔ چنانچہ اہل علم کے لئے اس کے موضوع سے متعلق علمی و فنی کتابوں کو "حاجت اصلیہ" کا درجہ دیتے ہوئے اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ جہالت ان کے لئے ہلاکت و تباہی کے درجہ میں ہے۔ "فان الجهل عندهم كالهلاك" [1]

علامہ کاسانی نے حاجت اصلیہ کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کی انسان کو اپنی بقاء و تحفظ کے لئے ضرورت پڑتی ہے :

" لانه من ضرورات حاجة البقاء وقيام البدن " [2]

غور کیا جائے فقہاء نے حاجت اصلیہ کے ذیل میں رہائشی مکانات، سردی اور گرمی سے تحفظ دینے والے لباس پیشہ ورانہ آلات، اور آلات حرب وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ جن کا تعلق شخصی ضروریات و حاجات سے ہے جن میں زمان و مکان اور حالات کے تغیر سے تبدیلی عین ممکن ہے۔ اس لئے حاجت اصلیہ کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حاجت اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔ بلکہ حالات و زمانہ اور عرف و ماحول کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی۔ لباس و پوشاک کا معیار زمانہ اور مسلک و تمدن کے لحاظ سے بدلے گا، سواری میں فرق آئے گا، کھانے پینے کی اشیاء میں تبدیلی ہوگی، رہائشی مکانات اور گھریلو سامان میں فرق ہوگا اور یہ چیزیں حاجت اصلیہ کے زمرہ میں آئیں گی۔ البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ حضرات فقہاء کرام نے حاجت اور تحسین و زینت کے درمیان جو فرق کیا ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔ اور جو چیزیں تحسین و زینت کے دائرہ میں آتی ہیں انہیں حاجت کے دائرہ میں نہیں رکھا جائے۔

واضح رہے کہ حاجت اصلیہ سے مراد مکلف بالزکاۃ کی، اس کے اہل و عیال اور ان افراد کی حاجت اصلیہ ہے جن کا نفقہ شرعاً اس پر واجب ہوتا ہے جیسے بیوی بچے۔

" والمعتبر هنا الحاجات الاصلية للمكلف بالزكاة ومن يعوله من الزوجة والاولاد " [3]

---

[1] شامی ج ۲ ص۲۶۳　　[2] بدائع ج ۲ ص۱۱

[3] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص۱۵۳

۴ــــ چوتھی شرط ـــ دین سے محفوظ ہونا

وجوب زکوۃ کی چوتھی شرط مال کا دین سے محفوظ ہونا ہے۔ اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہو مگر وہ مقروض ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد صاحب نصاب نہ رہتا ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہو گی۔ مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار کی مالیت ہے مگر وہ چالیس ہزار کا مقروض ہے تو اس شخص پر صرف دس ہزار جو فارغ عن الدین ہے۔ اس پر زکوۃ واجب ہو گی۔

کون سا دین مانع زکوۃ ہے

دین کی بحث کے ذیل میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

۱ــــ کن اموال میں دیون مانع زکوۃ ہیں۔

۲ــــ کس قسم کے دیون مانع زکوۃ ہیں۔

۳ــــ دیون کی اقسام

۴ــــ طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

اب ہم ان پر ترتیب وار گفتگو کرتے ہیں۔

۱ــــ کن اموال میں دیون مانع زکوۃ ہیں

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دین اموال باطنہ (سونا، چاندی اور سامان تجارت) میں مانع زکوۃ ہے یعنی دین کی مقدار مال منہا کرنے کے بعد بقیہ مال میں زکوۃ واجب ہو گی۔ عطاء، سلیمان بن یسار، حسن، نخعی، لیث، مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابو ثور، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کی یہی رائے ہے۔ امام مالک کے استاذ ربیعۃ الرائی، حماد بن سلمان اور امام شافعی کا قول جدید اس کے خلاف ہے۔

اموال ظاہرہ، حیوانات اور کھیتوں کے بارے میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس میں دین مانع زکوۃ نہیں ہے۔ امام مالک، اوزاعی، شافعی اور امام احمد کی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔ [1]

[1] المغنی ج ۳ ص ۴۲-۴۳

ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ سوائے کھیتی اور پھل کے تمام ہی اموال میں دین مانع زکوٰۃ ہے۔[1]

۲-۳ — کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں

دیون کی قسمیں : حنفیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں۔

۱ —— وہ دیون جن کا تعلق خالص بندوں سے ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں :

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ جیسے قرض اور سامانِ تجارت کی قیمت ...... اجرت وغیرہ۔

(ب) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔ جیسے وہ مال حرام، جس کے مالک کا پتہ نہ ہو۔

۲ —— وہ دیون جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، ان کی بھی دو صورتیں ہیں :

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ جیسے زکوٰۃ، عشر اور خراج۔ گویہ چیزیں حق اللہ کے قبیل سے ہیں، مگر بندوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اموال ظاہرہ، مویشی اور زرعی پیداوار میں امام وقت کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے اور اموال باطنہ، سونا چاندی اور سامان تجارت میں بھی امام یا اس کے نائب کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو، جیسے دیون، نذور و کفارات، ان دیون میں سے دین عبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی موجود ہو وہ وجوب زکوٰۃ کے باب میں مانع ہے اور صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ دین کی مقدار مالیت نکالنے کے بعد باقی ماندہ مالیت بقدر نصاب ہو جائے۔

دین عبد کی وہ قسم جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہ ہوتا ہو، جیسے مال حرام، صحیح قول کے مطابق وہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا۔

وہ دین جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ اس میں صرف وہ دین وجوب زکوٰۃ اور وجوب

---

[1] المغنی ج ۳ ص ۴۳-۴۲

صدقۃ الفطر میں مانع ہوگا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ مگر یہ دین بھی عشر خراج کے وجوب میں مانع نہیں ہوگا۔ بحر میں ہے :

" لان الدين لا يمنع وجوب العشر والخراج ويمنع صدقة الفطر" [1]

باقی وہ سارے دیون جن کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہیں ہوتا ہے جیسے دیون نذور کفارات تو وہ مانع نہیں ہوں گے۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

" وجوب زکوۃ کی ایک شرط مال کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ اور دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہو تو وہ بقدر دین مانع زکوۃ ہوگا۔ چاہے وہ دین معجل ہو یا مؤجل۔ امام شافعی کے نزدیک دین چاہے جس قسم کا ہو وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ کاسانی نے دین کے مانع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت عثمان کا یہ قول پیش کیا ہے کہ انھوں نے رمضان المبارک میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا :

" لوگو! تمہارے زکوۃ دینے کا مہینہ سایہ فگن ہوگیا ہے۔ پس جس شخص کے پاس مال ہو اور مقروض ہو تو وہ مقدار دین کو منہا کرنے کے بعد اپنے باقی مال کی زکوۃ ادا کرے گا۔"

بحر الرائق میں ہے :

" مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ لہٰذا نذور و کفارہ کا دین وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہوگا۔" [2]

عورت کا مہر مانع وجوب زکوۃ ہے یا نہیں

یہ سوال کہ عورت کا دین مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہوگا یا نہیں ؟ یعنی جس طرح دوسرے دیون مانع وجوب ہیں مہر کی رقم بھی مانع ہے یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں :

۱ــــــ ایک قول یہ ہے کہ مطلقاً عورت کا مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہے۔

۲ــــــ دوسرا قول یہ ہے کہ مہر معجل مانع ہے، مؤجل مانع نہیں ہے۔

---

[1] بدائع ج ۲ ص۶ [2] بحر ج ۲ ص۲۰۳

۳ــــ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مہر کی ادائیگی کا فوری ارادہ ہو تو مانع ہے اور اگر ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو مانع نہیں ہے۔ علامہ کاسانی نے قہستانی کے حوالے سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

"زاد القہستانی عن الجواهر والصحیح انہ غیر مانع" [1]

بحر الرائق میں ہے:

"ولو صداق زوجته المؤجل الی الطلاق أو الموت وقیل المهر المؤجل لا یمنع لانه غیر مطالب به عادة بخلاف المعجل وقیل ان کان الزوج علی عزم الاداء یمنع والا فلا لانه لا یعد دینا" [2]

مولانا اشرف علی تھانوی نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ [3]

پس حاصل یہ ہے کہ اگر بیوی کا مہر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں عورت کا مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہوگا اس کی ادائیگی کے بعد اگر مال بقدر نصاب رہ جائے تو اس پر وجوب زکوۃ ہوگا۔ اور اگر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پھر مہر مانع وجوب زکوۃ نہیں ہوگا اور اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

دیون کی بحث کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لئے قرض اور اس قسم کے مختلف ترقیاتی قرضے سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کی ادائیگی کے لئے ۵ سال سے لے کر ۳۰/۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے۔ اس مدت کے دوران قسطوار قرض کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے۔ مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لئے ۵ کروڑ روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپیہ ادا کرنا ہے۔ یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لئے ایک لاکھ روپے قرض لیا جسے دس سال میں دس ھزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے۔ ان صورتوں میں وجوب زکوۃ کے لئے اموال زکوۃ میں پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کرکے باقی اموال پر زکوۃ واجب قرار دی جائے گی؟

---

[1] شامی ج ۲ ص۵   [2] البحر الرائق ج ۲   [3] امداد الفتاوی ج ۲

اس سلسلہ میں اگرچہ عام طور پر علماء یہی تحریر فرماتے ہیں کہ دین معجل ہو یا مؤجل۔ دونوں ہی وجوب زکوۃ میں مانع ہوگا۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"فانه يمنع وجوب الزكاة بقدره حالاً كان اومؤجلاً"

تاہم بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ دین مؤجل وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ خود کاسانی نے بعض مشائخ سے یہ نقل کیا ہے:

"وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا يمنع لانه غير مطالب به عادةً"[1]

شامی نے شرح الطحاوی کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب ایسے دین کو مانع زکوۃ قرار نہیں دیتے تھے۔ شامی ہی نے قہستانی کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ایسا دین وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہے[2]

فتاوی تاتارخانیہ میں مجد الائمہ السرخکی کے حوالہ سے ان کے بعض مشائخ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین مؤجل وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہے۔

"ذكر مجد الائمة السرخكي عن مشائخه انه لا يمنع"[3]

ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے طویل الاجل ترقیاتی قرضوں میں صرف سالانہ واجب الاداء قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوۃ واجب ہوگی۔

کمپنیوں کی مجموعی مالیت پر زکوۃ کا حکم

زکوۃ کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء اور حصہ دار ہوتے ہیں جو اپنے اپنے حصہ کے بقدر مالیت کے مالک ہوتے ہیں۔ بعض صورتیں ایسی ممکن ہیں کہ کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت نصاب زکوۃ سے زائد ہو مگر شرکاء کے حصص کو علیحدہ کرنے کی صورت میں کوئی بھی صاحب نصاب نہ ہوتا ہو۔ یا بعض صاحب نصاب ہوتو اس صورت میں زکوۃ کا وجوب کمپنی کی مجموعی مالیت کے لحاظ سے ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ اس سلسلہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ کمپنیز کی مجموعی مالیت اور اس کے

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۶ [2] شامی ج ۲ ص ۲۶ [3] فتاوی تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۹۳

اثاثے میں وجوب زکوۃ نہیں ہوگا بلکہ کمپنی کے شرکاء کی انفرادی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت ہوگی جس کے ملانے سے وہ صاحب نصاب ہوجاتا ہو تو صرف اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ مثلاً کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ ہے جو بلاشبہ نصاب شرعی سے کافی زائد مالیت ہے۔ کمپنی کے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ ہے تو وجوب زکوۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر ہر شریک کی انفرادی حیثیت کو دیکھا جائے گا اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت پہلے سے موجود ہو جس کو ملانے سے وہ صاحب نصاب ہوجاتا ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اور جس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہوگا اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر سائمہ جانور دو یا دو سے زائد افراد کے مابین مشترک ہو یا سامانِ تجارت تو وجوب زکوۃ میں شرکاء کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر ہر شریک کی انفرادی حالت معتبر ہوگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ان کے درمیان معاملۂ شرکت درست اور صحیح ہوگا تو پھر زکوۃ کا وجوب "مجموعی مالیت" پر ہوگا۔ فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"قال اصحابنا واذا كان النصاب بين خليطين لا تجب فيه الزكاة وقال الشافعي تجب عند وجود شرائط الخلط ۔۔۔۔ ولو كانت السوائم بين اثنين فبلغ نصيب واحدٍ نصابًا دون الآخر تجب عليه دون صاحبه ولو لم يبلغ نصيب كل واحدٍ نصابًا لا يجب شئ وفي شرح الطحاوي فان كان نصيب كل واحدٍ منهما على الانفراد يبلغ نصابًا كاملًا تجب الزكاة والا فلا" [۱]

درمختار میں ہے:

"ولا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فيه" [۲]

ہیرے اور جواہرات کی زکوۃ: جن اموال میں زکوۃ واجب ہوتی ہے وہ شرعاً منصوص ہیں۔ اموال زکوۃ

[۱] فتاوی تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۹۸-۲۹۷ [۲] درمختار علی ھامش الشامی ج ۲ ص ۳۰

قیاسی نہیں ہیں۔ لہذا قیاس وظن کے ذریعہ کسی ایسی چیز پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جاسکتی جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ معدنیات میں سے صرف سونے اور چاندی پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔ باقی معدنیات چاہے جتنی بھی قیمتی اور مالیت رکھنے والی ہوں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں کی گئی ہے۔ لہذا ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی چاہے جتنی بھی مالیت کے ہیرے، جواہرات اپنے پاس محفوظ کئے جائیں یا زیورات کی شکل میں محفوظ کئے جائیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص ہیرے اور جواہرات کی تجارت شروع کردے تو پھر ان کا حکم سامانِ تجارت کا ہوگا اور سامانِ تجارت کی حیثیت سے ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ درمختار میں ہے:

"لا زکوۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفًا اتفاقًا الّا ان تکون للتجارۃ والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ بشرط عدم المانع"[1]

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"ولیس فیما یشتری للتجمل والزینۃ من خادم ومتاع ولؤلؤ وجوهر وفلوس للنفقۃ شئ خزانۃ الفقہ، ولیس فی الیواقیت وفی المضمرات وان کان حدیًا الّا ان تکون للتجارۃ"[2]

اموال تجارت میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا

مال تجارت کی زکوٰۃ میں قوت خرید کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ سامانِ تجارت کی موجودہ قیمت ومالیت معتبر ہوگی اور اسی لحاظ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس سلسلہ میں علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے کہ کس دن کی قیمت معتبر ہوگی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ جس دن اس مال پر سال گزرا اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوئی اس دن اس سامان کی جو قیمت ومالیت رہی ہوگی اسی کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک جس دن زکوٰۃ ادا کی جائیگی

---

[1] درمختار علی هامش الشامی ج۲ ص۲۷۳ [2] تاتارخانیہ ج۲ ص۲۴۵-۲۴۴

اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"ولو اراد ان یودی القیمۃ جاز عندنا خلافاً للشافعی لکن عند ابی حنیفۃ فی الزیادۃ والنقصان جمیعًا ان یودی قیمتہا یوم الحول ۔ ۔ ۔ ۔ وعندھما فی الفصلین جمیعًا یودی قیمتہا یوم الاداء" [1]

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"وان ادّی من قیمتہ یعتبر یوم الوجوب وھو تمام الحول عند الامام وقالا یوم الاداء لمصرفھا" [2]

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"وان ادی من القیمۃ ادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمتھا یوم حولان الحول الذی ھو یوم الوجوب عند ابی حنیفۃ وعندھما یودی قیمتہا یوم الاداء" [3]

زکوۃ کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ جس مال میں زکوۃ واجب ہوئی ہے، اسی مال سے زکوۃ بھی ادا کی جائے مگر فقہاء کرام نے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ اصل سامان کے بجائے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے تو بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قیمت اصل کا بدل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے صاحبین کا مسلک زیادہ راجح اور قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ جس دن زکوۃ ادا کی جا رہی ہے، اس دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ کیوں کہ وہی قیمت اصل کا بدل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا چھٹکر فروختگی کا۔ تو ظاہر ہے کہ اگر تھوک کے حساب سے مال فروخت کیا جاتا ہے تو تھوک کے بھاؤ کا لحاظ ہوگا۔ اور اگر چھٹکر فروخت کیا جاتا ہے تو چھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص دونوں طرح سے فروخت کرتا ہو تو پھر انفع للفقراء کے اصول کے پیش نظر چھٹکر فروختگی کے لحاظ سے ادا کرے۔ ہدایہ میں ہے:

"یقومھا بما ھو انفع للمساکین احتیاطًا لحق الفقراء" [4]

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۲۳ [2] فتاوی ھندیہ ج ۱ ص ۱۸۰

[3] تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۲۳ [4] ھدایہ علی ھامش الفتح ج ۲ ص ۱۶۷

اگراراضی کی خرید و فروخت تجارتی کاروبار کے نقطۂ نظر سے کی جائے تو وہ سامان تجارت ہونے کی وجہ سے اموال تجارت میں شامل ہیں۔ اور سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں ان کی موجودہ معروف قیمت کے لحاظ سے زکوۃ واجب ہوگی۔ وجوب زکوۃ میں اراضی کی موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ آئندہ متوقع قیمت فروخت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

شیئرز اور بونڈس کی زکوۃ

شیئرز چوں کہ ایک تجارتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں۔ لہذا شرعاً ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ شیئرز کی زکوۃ میں تفصیل یہ ہے:

"جو کمپنی تجارت کرتی ہے اور خود سامان تیار کر کے فروخت کرتی ہے جیسے ریشم اور کپڑے کے کارخانے۔ تو اس صورت میں کمپنی کی مالیت کی حیثیت سامانِ تجارت کی ہوگی اور راس المال اور اس کے منافع دونوں پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ آلات حرفت اور مشنری اشیاء کی مالیت اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے صرف کرایہ وصول کرتی ہے۔ کرایہ پر مکانات، دکانات دیتی ہے، تو ایسی کمپنی کے صرف منافع پر وجوب زکوۃ ہوگا۔"

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

"شیئرز پر زکوۃ ہے شیئرز جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے، لوہا اور سامان بنا کر تجارت کرنے والے کارخانے اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصل رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوۃ واجب ہے۔ اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے محض کرایہ وصول کرتی ہے تو زکوۃ نفع پر واجب ہے۔ اصل رقم پر زکوۃ فرض نہیں ہے۔"[1]

یوسف القرضاوی نے شیئرز کی زکوۃ کے بارے میں لکھا ہے:

"صنعتی اور اس جیسی کمپنیاں جن کا سرمایہ مشینوں اور عمارتوں وغیرہ میں لگا رہتا ہے جیسے پریس، فیکٹریاں، کرایہ پر چلنے والی موٹریں۔ تو ان کی زکوۃ ان کے حصص سے نہیں بلکہ ان کی خالص آمدنی اور

---

[1] فتاوی رحیمیہ ج ۳ ص ۱۱۱

منافع سے لی جائے گی۔ ایسی تجارتی کمپنیاں جن کا بیشتر سرمایہ منقولات میں لگا رہتا ہے اور جن کی تجارت کی جاتی ہے اور جو اصلاً باقی نہیں رہتیں تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے بازار کی قیمت کے مطابق وصول کی جائے گی۔ اس قیمت میں منافع کو شامل کرکے اور غیر منقولہ سامان کی قیمت کو حصص میں سے منہا کرکے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا پڑے گا۔" [1]

واضح رہے کہ شیرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت دمالیت کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ بوقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ اور مالیت ہوگی اس کا اعتبار کرکے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈز کی زکوٰۃ

بونڈز (BONDS) درحقیقت بنک، کمپنی یا حکومت کے قرض دار ہونے کا وثیقہ اور تمسک ہے جن کا حامل متعینہ رقم مع منافع پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ گویا بونڈ کا مالک دین مؤجل کا مالک ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ "دین قوی" کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کیش کرانے کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

محورِ ثانی — نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں سے کسے معیار قرار دیا جائے

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے سونے اور چاندی کو مستقل نصاب کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر اصل اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت سونے اور چاندی کے نرخ میں غیر معمولی تفاوت اور فرق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اموالِ تجارت میں نصاب وجوب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے یا سونے کے نصاب سے؟ اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لئے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) کا معیار کسے قرار دیا جائے؟

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۵۲۸-۵۲۷

اس سلسلہ میں علمائے کے خیالات ورجحانات مختلف ہیں کہ وجوب زکوۃ کے لئے دونوں میں سے کسے اصل اور معیار قرار دیا جائے۔ علامہ یوسف القرضاوی کا رجحان اس طرف ہے کہ سونے کو معیار قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔ مگر خود قرضاوی نے علماء معاصرین کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اکثریت چاندی کو معیار قرار دیتی ہے۔ لکھتے ہیں :

"البتہ اس وقت ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نقدین سونے چاندی میں سے کس کے ذریعہ نصاب شرعی کی تحدید وتعیین کریں گے یعنی غنا کی وہ آخری حد کیا ہوگی جس پر وجوب زکوۃ کا حکم ہوگا۔ اس گفتگو کی ضرورت اس بنا پر پڑی کہ شارع نے سونے، چاندی کو علیحدہ علیحدہ نصاب مقرر کیا تھا۔ ایک کا نصاب دوسرے کے مخالف تھا تو کیا ہم چاندی کو وجوب زکوۃ کا معیار قرار دیں گے۔ بہت سے علماء معاصرین کا اسی طرف میلان ہے اور اس میلان کی دو وجہ ہے :

۱۔ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے۔ اس کا ثبوت احادیث صحیحہ مشہورہ سے ہے۔

۲۔ چاندی کو معیار قرار دینے اور اس کے ذریعہ تقدیر کی صورت میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے کیوں کہ چاندی کو معیار قرار دینے کی صورت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوۃ واجب ہوگی۔"[1]

راقم الحروف کا بھی اسی طرف رجحان ہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے نصاب چاندی کو معیار قرار دیا جائے۔ لہٰذا اس دور میں اگر کسی کے پاس سامانِ تجارت یا کوئی دوسری مالیت نصاب چاندی کے بقدر ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اور وہ غنی قرار پائے گا۔ اس کے لئے زکوۃ لینا حرام ہوگا۔ زکوۃ کے باب میں ہمیشہ فقراء ومساکین کی منفعت کے پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کیوں کہ زکوۃ کی مشروعیت ہی فقراء کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتی ہے۔

محور ثالث — مصارف زکوۃ

اہل مدارس کے لئے ایک آسان راہ

اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوۃ ہے ادارہ اس کے قیام

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱

وطعام تعلیم اور دوسری ضروریات کے انتظام پر آنے والے اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو روپئے کا چیک، اس کے حوالے کرے۔ چیک پر طالب علم کا قبضہ اصل رقم پر قبضہ تصور کیا جائے گا اور اس طرح سے وہ اس رقم کا مالک ہوجانے کے بعد جب وہ چیک مدرسہ کو واپس کرے گا تو مدرسہ والے کو اس رقم کو مدرسین کی تنخواہ اور تعمیرات میں خرچ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کے لئے یہ آسان اور قابل عمل طریقہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بہت ساری برائیوں سے حفاظت ہوگی۔

مہتمم مدرسہ زکوۃ دہندہ کا وکیل اور طلبہ کا نائب ہے

مہتمم مدرسہ زکوۃ دہندہ کا وکیل ہے۔ کیوں کہ معطی نے اسی کو زکوۃ صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے وکیل بنایا ہے۔ اس لئے قبضۂ مہتمم من کل الوجوہ قبضۂ مستحق زکوۃ نہیں ہوگا اور تملیک طلبہ اور تملیک مستحق زکوۃ ضروری ہوگی۔ اور محض مہتمم مدرسہ کو زکوۃ دے دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ نیز مہتمم مدرسہ طلبہ کا بھی نائب ہے۔ واضح رہے کہ طلبہ کے نائب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہے زکوۃ کی رقم صرف کردے بلکہ وہ جس کا نائب ہے اور جس کی نیابت کے طور پر اس نے زکوۃ وصدقات واجبہ کی رقوم وصول کی ہے اسی پر صرف کرنا متعین ہے۔ اگر وہ غیر مصرف میں اسے صرف کردیتا ہے تو زکوۃ دہندہ کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

> "مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے۔ پس جو شئ کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے۔ اس کے قبضہ سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا اگرچہ وہ مجہول الکمیہ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے۔" [۱]

کمیشن پر زکوۃ: مدارس اسلامیہ کے سفراء ومحصلین عاملین زکوۃ کے حکم میں نہیں ہیں جن کا مستحق زکوۃ ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ کیوں کہ عامل زکوۃ جو مصرف زکوۃ ہے وہ شخص ہے جسے امیر المسلمین نے لوگوں کی زکوۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی تحصیل کے لئے مامور کیا ہو۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

[۱] فتاوی رشیدیہ

"العامل هو الذی یبعثه الامام لجبایة الصدقات" [1]

الفقه علی المذاھب الاربعہ میں ہے کہ "عامل زکوۃ صرف اس صورت میں زکوۃ لینے کا حقدار ہوگا جب کہ امام وقت نے زکوۃ کی وصولی پر اسے مامور کیا ہو وانما یاخذ العامل منھا اذ افرتھا الامام" [2]

امام المسلمین کو تمام مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے اور اس بنیاد پر اسے زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا شرعاً حق ملتا ہے اور زکوۃ کی وصولی کے لئے اس کا متعین کیا ہوا عملہ مستحق زکوۃ قرار پاتا ہے۔ مگر مدارس کے مہتمم کو ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے اس لئے اس کے محصلین وسفراء کو عاملین زکوۃ کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عامل صدقات کو زکوۃ کی رقم بطور معاوضہ واجرت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اپنے اوقات کو امور مسلمین کے لئے فارغ کر دیتا ہے اور ہمہ وقت اس میں مشغول رہتا ہے اس لئے جزاء احتباس کے طور پر بقدر کفایت (جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے گذارے کے لئے کافی ہو) اسے مال زکوۃ میں سے دیا جاتا ہے۔ عنایہ میں ہے :

"فیعطیه مایسعه ای یکفیه .... لأنه فرغ نفسه لهذا العمل وکل من فرغ نفسه لعمل من امور المسلمین یستحق علی ذالك رزقًا کالقضاة والمقاتلة ولیس ذالك علی وجه الاجارة لانها لاتکون الا علی عمل معلوم اومدة معلومة واجرة معلومة" [3]

الاختیار لتعلیل المختار میں ہے :

"ولیس ذالك بالاجارة لأنه عمل غیر معلوم" [4]

مدارس کے سفراء کو زکوۃ کی رقم بطور اجرت ومعاوضہ دیجاتی ہے اور زکوۃ کی رقم کو اجرت ومعاوضہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

---

[1] عنایه علی هامش الفتح ج ۲ ص۲۰۱ [2] الفقه علی المذاهب الاربعة ج ۱ ص۶۲۵
[3] عنایه ج ۲ ص۲۰۱ [4] الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص۱۱۸

کمیشن پر چندہ کرانے میں کئی طرح کی خرابیاں ہیں ۔

۱ـــــــ اس میں اجرت مجہول ہوتی ہے ۔ عمل و مدّت کی بھی تعیین نہیں ہوتی حالانکہ عقد اجارہ کی صحت کے لئے اجرت کی تعیین، عمل اور مدّت کا معلوم ہونا ضروری ہے ۔

۲ـــــــ زکوٰۃ کی رقم کا زیادہ تر حصہ خود محصلین و سفراء پر خرچ ہو جاتا ہے جو مشروعیت زکوٰۃ کے خلاف ہے ۔ زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کو نفع پہنچانے کے لئے ہوئی ہے اور اس صورت میں ان تک زکوٰۃ کی رقم کا بہت کم حصہ پہنچ پاتا ہے ۔

۳ـــــــ مدارس کے ذمہ داران کے لئے زکوٰۃ کی رقم کو اس کے مصرف میں صرف کرنا ضروری ہے اور جب تک وہ رقم اپنے مصرف میں صرف نہیں ہوگی زکوٰۃ دہندگان بری الذمہ نہیں ہوں گے ۔ اس لئے ان وجوہات کی بنا پر کمیشن پر چندہ کرانا شرعًا ممنوع اور ناجائز ہے ۔ البتہ اگر کمیشن کی رقم زکوٰۃ و صدقات واجبہ کے علاوہ غیر واجب التملیک رقم سے ادا کی جائے تو اس صورت میں صرف ایک خرابی لازم آئے گی اور وہ ہے اجرت کا مجہول ہونا جسے بعض مجبوریوں کے تحت گوارہ کر لیا جا سکتا ہے ۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب ۔

مسائل زکوٰۃ

از: مولانا مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی ———— مفتی امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف، پٹنہ

الحمد للہ رب العلمین وبہ نستعین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اما بعد

زکوۃ ———— اسلام کے بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم ترین رکن ہے جس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے اور اس کا منکر کافر ہے قرآن و احادیث نبویہ میں اس کی ادائیگی کی بہت تاکید اور عدم ادائیگی پر بہت سخت وعیدیں بھی آئی ہیں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی کتاب مقدس قرآن عظیم میں اقامت صلوۃ کے ساتھ ادائیگی زکوۃ کا متعدد جگہوں میں حکم دیا ہے زکوۃ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ماقبل کی شریعتوں میں بھی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

زکوۃ کی ادائیگی میں کمزوروں، پریشان حال لوگوں یتیموں، بیواؤں اور عاجز ولاچار لوگوں کی اعانت ومدد ہے جو اسلام کا اہم ترین معاشرتی اور سماجی دشواریوں کے حل کا اصول وضابطہ اور بے مثال نظام حیات ہے اور اللہ رب العزت کی خوشنودی ورضا کے حصول کا سبب اور حکم خداوندی کی بجاآوری ہے۔ زکوۃ دینے سے گناہ دھلتے ہیں ایمانی اور روحانی قوت حاصل ہوتی ہے اخلاق وعادات میں جلا پیدا ہوتی ہے اور انسانی قلب وجگر عرفان الٰہی کی مقدس روشنی سے منور ودرخشاں ہوتا ہے۔ لالچ، حرص بغض وعداوت، جیسے اخلاق رذیلہ سے انسان کو دور رکھتی ہے۔ اخوت وبھائی چارگی، ایثار وقربانی اور جود وسخا سے کریمانہ وصف اور خصائل حمیدہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے مال ودولت سے نواز کر جو فارغ البالی عطا کی ہے اس کا تقاضہ اور حق ہے کہ انسان اپنے رب کا شکریہ ادا کرے۔ اللہ کی عنایت کردہ مال ودولت سے غرباء ومساکین کا حق ادا کرے جس کی عملی صورت ادائیگی زکوۃ اور فرضیت کی شکل میں یہ ذمہ صاحب مال پر ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ رب العزت نے اس حقیقت کو بھی واضح فرمادیا ہے کہ زکوۃ ادا کرنے

اور صدقہ دینے سے مال میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اس قدر اضافہ ہوتا ہے کہ انسانی فکر و ادراک اس کی گہرائیوں اور نزاکتوں کا تصور نہیں کرسکتی ہے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مسائل معلوم کرکے اپنے ان اموال کی جن پر زکوۃ فرض ہے پوری ایمانداری اور دیانت کے ساتھ زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرکے اللہ کے فرمان اور حکم کی بجاآوری کریں۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ تمام اموال میں زکوۃ فرض نہیں ہے بلکہ خاص اصناف میں مخصوص شرائط کے ساتھ زکوۃ فرض ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

اموالِ زکوۃ

جن اموال میں زکوۃ واجب ہوتی ہے وہ دو طرح کے ہیں :

(الف) اموال ظاہرہ

(ب) اموال باطنہ

اموال ظاہرہ درج ذیل ہیں :

۱ــــــ سائمہ جانور یعنی وہ جانور جو پورا سال، یا سال کا بیشتر حصہ چرنے پر اکتفا کرتے ہوں اور مالک کو ان کا چارہ دینا نہ پڑتا ہو۔ اس طرح سائمہ جانور جن پر زکوۃ فرض ہے وہ تین طرح کے ہیں :

(الف) ابل۔ اونٹ۔ اس میں ہر نوع کے اونٹ داخل ہیں

(ب) بقر۔ گائے، بیل، بھینس وغیرہ نر و مادہ

(ج) غنم۔ خصی، بکری، دنبہ اور بھیڑ[1]

۲ــــــ کھیت کی ہر طرح کی پیداوار خواہ غلے ہوں یا سبزیاں ہوں یا پھل۔ عشر، یا نصف عشر واجب ہے یعنی اگر کھاد، پانی وغیرہ کے ذریعہ سے فصل تیار ہوئی ہے تو بیسواں حصہ ورنہ دسواں حصہ واجب ہے۔

۳ــــــ اموالِ باطنہ میں نقود اور عروض التجارۃ آتے ہیں۔

نقود یعنی خواہ اثمان خلقیہ ہوں مثلاً سونا، چاندی یا اثمان عرفیہ یعنی مختلف ممالک کی کرنسیاں جو ثمن عرفی کی حیثیت سے رائج ہوں مثلاً ہندوستانی نوٹ یا سکّے یا ریال پونڈ وغیرہ۔

اثمان خلقیہ خواہ سکّے ہوں یا زیورات بنائے گئے ہوں۔ اور عروض التجارہ وہ سامان جو تجارت کی نیت سے خرید

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۶

کر رکھا گیا ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے خواہ فی الحال تجارت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

"وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام"

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں ایک شرط ملک تام بھی ہے۔ اگر کسی شئی کا مالک متعین نہیں ہے تو اس شئی پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے جانوروں میں ملک نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک مستحقین شرط ہے اور غیر ملک میں تملیک متصور نہیں۔

اما الشرائط التی ترجع الی المال فمنها الملك فلا تجب الزكوٰة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك وهذا لان فی الزكوٰة تمليكا والتمليك فی غير الملك لا يتصور [1]

ملک تام پر وجوب زکوٰۃ کی حکمت

ملک تام پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں:

"ملکیت بڑی نعمت ہے کیونکہ یہ آزادی اور انسانیت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس سے غلام اور جانور محروم ہوتے ہیں ملکیت سے آدمی کی قائدانہ حیثیت معلوم ہوتی ہے اور ملک تام کے ذریعہ انسان اپنے مال سے منتفع ہوتا ہے اور از خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کے بڑھانے پر قادر ہوتا ہے۔ اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا انسان پر لازم ہے کہ جب اس کو یہ نعمت نصیب ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ [2]

ملک تام سے مراد

ملک تام سے مراد ملک رقبہ اور ملک ید ہے۔ ملک رقبہ یہ ہے کہ اس شئی پر مکمل ملکیت حاصل ہو اور ملک ید یہ ہے کہ وہ چیز اپنے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اگر ملکیت حاصل نہیں ہے جیساکہ غلام کو اپنے مال پر ملکیت حاصل نہیں ہے اس کا جو بھی مال ہے اس کے آقا کا ہے یا مدیون (جس پر قرض ہے) کے پاس جو مال ہے اس پر اس کا قبضہ تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ یا ملکیت تو حاصل ہے لیکن قبضہ و تصرف میں نہیں ہے، یا اس سے انتفاع پر

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۲۳ [2] فقه الزكوٰة ج ۱ ص ۱۳۱

قدرت نہیں ہے جیسا کہ مہر کی رقم ہے۔ قبضہ سے قبل ملکیت تو ہے لیکن قبضہ و تصرف میں نہیں۔ غرض یہ کہ ملکیت رقبہ یا ملکیت ید دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد وأما اذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكوٰة كذا في السراج الوهاج۔ [1]

ملک تام کی مراد میں اختلاف

سیدنا حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام مالکؒ تو یہی فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک رقبہ اور ملک ید دونوں ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ حضرت امام زفرؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید شرط نہیں ہے۔ اگر کسی شئ پر مکمل ملکیت ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی خواہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو۔

ومنها الملك المطلق وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويدا وهذا قول اصحابنا الثلاثه وقال زفر اليد ليس بشرط وهو قول الشافعیؒ [2]

مال ضمار میں زکوٰۃ

چوں کہ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ملک ید وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط نہیں ہے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ امام ابویوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چوں کہ مال ضمار میں ملک رقبہ تو حاصل ہے لیکن ملک ید مفقود ہے۔

مال ضمار کی تفسیر

مال ضمار ہر وہ مال ہے جس پر اصل ملکیت تو قائم ہو لیکن انتفاع پر قدرت نہ ہو جیسا کہ بھاگا ہوا غلام، گم شدہ چیز، مال مفقود، سمندر میں ضائع شدہ مال۔ اسی طرح وہ مال جس کو کسی نے ظلماً لے لیا۔ اسی طرح وہ مال جو جنگل یا بہت پرانے مکان میں دفن کر دیا ہوا ور جگہ یاد نہ ہو یہ سب مال ایسے ہیں کہ ملکیت تو قائم ہے لیکن انتفاع پر قدرت نہیں ہے [3]

---

[1] الفتاوی الهندیہ کتاب الزکوٰۃ ج۱ ص۱۷۲ مطبوعہ بیروت۔ [2] بدائع الصنائع کتاب الزکوٰۃ ج۲ ص۸۲۲۔ [3] " ج۲ ص۸۲۲

حضرت امام زفرؒ اور حضرت امام شافعیؒ ان تمام روایات سے استدلال کرتے ہیں جو اس باب میں عام ہیں۔ ان میں ملکِ رقبہ اور ملکِ یدکی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے اگر کسی مال کا مالک متعین ہے تو اس پر شرعًا زکوٰۃ واجب ہے۔ خواہ وہ قبضہ وتصرف میں ہو یا نہ ہو جس کی دلیل مسافر کے مال پر وجوب زکوٰۃ ہے اگر مال گھر میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح قرض پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب ہے باوجودیکہ ان تینوں صورتوں میں ملکیت تو قائم ہے لیکن مال قبضہ وتصرف میں نہیں ہے ـــــ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے۔ لہٰذا مال ضمار میں زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ ملکیت ثابت ہے۔

فریق اول کی ایک دلیل تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم لازکوٰۃ فی مال الضمار ہے یعنی مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے ـــــ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ مال جس سے مالک انتفاع نہ کر سکتا ہو وہ مالک کے حق میں معدوم ہے اس کے ذریعہ غنی (صاحب نصاب) نہیں سمجھا جائے گا، اور جو صاحب نصاب نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مسافر کے مال میں وجوبِ زکوٰۃ کا تعلق ہے تو چوں کہ مسافر اپنے نائب کے ذریعہ اپنے مال میں انتفاع پر قدرت رکھتا ہے اور جو مال گھر میں مدفون ہے اس سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ پورے گھر کو کھود کر مال مدفون کی جگہ معلوم کی جا سکتی ہے اسی طرح قرض سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ دائن جب چاہے مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے اس لئے ان تینوں صورتوں میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ملک ید نہیں ہے [۱]

خلاصہ کلام یہ کہ حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ قول کے مطابق وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملک ید اور ملک رقبہ دونوں ضروری ہے اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جواب ۲: سوال سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خرید وفروخت کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور خریدار نے پیشگی ثمن بھی ادا کر دیا ہے لیکن بائع (فروخت کرنے والے) نے ابھی تک مبیع خریدار کے حوالہ نہیں کیا ہے ایسی صورت میں پیشگی ثمن اور مبیع دونوں پر وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث ہے کہ ان دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں۔ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر۔

ثمن پر زکوٰۃ: بیع مکمل ہو جانے کے بعد ثمن پر بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو بہر دو صورت بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعًا

---

[۱] بدائع الصنائع ج ۲، ص ۶۲۵–۶۲۴

اختیار ہوتا ہے۔ اور جب بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً اختیار ہے تو بائع کے ذمہ ثمن پر زکوۃ واجب ہوگی۔ خواہ بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو کیونکہ وجوب زکوۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جارہی ہے۔ (جاز التصرف فی الثمن) بھبۃ او بیع او غیرھما لو عینا ای مشارا الیہ (قبل قبضہ) لہ نیز ثمن کی حیثیت دین قوی کی ہوتی ہے اور دین قوی پر دائن (قرض خواہ) کے ذمہ زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ لہذا مذکورہ صورت میں جب کہ ثمن بائع کے قبضہ و تصرف میں آچکا ہے تو بائع کے ذمہ زکوۃ واجب ہوگی۔

شبہ۔ یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر بائع کے پاس مبیع ہلاک ہو جائے یا کسی دوسری وجہ سے بیع ختم کرنا پڑے تو بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے۔ اور جب بیع فسخ ہو جانے کی صورت میں بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے تو وہ اس ثمن کا مالک کہاں ہوا کہ اس پر وجوب زکوۃ کا حکم لگے۔

شبہ کا ازالہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بائع تو اس ثمن کا مکمل مالک ہو گیا اور جہاں تک بیع کے فسخ ہونے کی صورت میں ثمن کی واپسی کا سوال ہے تو ثمن کی واپسی بائع کے ذمہ میں ہے عین ثمن کی واپسی ضروری نہیں ہے۔ ثمن کے مثل یا اس کے بقدر کوئی دوسری چیز بھی واپس کر سکتا ہے۔ اگر ثمن پر بائع کو ملکیت حاصل نہ ہوتی تو عین ثمن کی واپسی بائع پر ضروری ہوتی ـــــ اس کی نظیر اجارہ طویلہ میں چند سالوں کی پیشگی اجرت پر زکوۃ کی ہے یعنی کسی نے مکان یا دوکان ایک لمبی مدت کے لئے کرایہ لیا اور چند سالوں کا پیشگی کرایہ مالک مکان و دوکان کو ادا کر دیا تو اس پیشگی کرایہ کی رقم پر زکوۃ مالک مکان و دوکان کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ کرایہ کی رقم پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا۔ اور اگر بالفرض اجارہ فسخ کرنے کی صورت میں کرایہ کی رقم واپس بھی کرنی پڑے تو عین اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ جو کرایہ میں دی گئی تھی بلکہ اس کی واپسی ذمہ میں ہوگی۔ اس کے بقدر کوئی دوسری مالیت بھی واپس کر سکتا ہے۔

واما زکوۃ الاجرۃ المعجلۃ عن سنین فی الاجارۃ الطویلۃ التی یفعلھا بعض الناس عقوداً و یشترطون الخیار ثلاثۃ ایام فی رأس کل شھر فتجب علی الآجر لانہ ملکھا بالقبض وعند الانفساخ لایجب علیہ رد عین المقبوض بل قدرہ فکان کدین لحقہ بعد الحول۔ ٢ہ

لہ الدر المختار علی ھامش رد المختار مطلب فی بیان الثمن والمبیع والدین۔ ج ۴ ص ۱۶۵

٢ہ شرح فتح القدیر کتاب الزکوۃ مطبوعہ مصر۔ ج ۲ ص ۱۲۵

مبیع پر قبضے سے قبل زکوۃ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ خرید و فروخت مکمل ہو چکی لیکن مبیع پر خریدار کا قبضہ نہیں ہوا تو مبیع پر قبضے سے قبل زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر؟ اس کی تفصیل درجہ ذیل ہے

(الف) اصولاً اور شرعاً فروخت کرنے والے کے ذمہ مبیع کی زکوۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ مبیع فروخت کرنے والے کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔

(ب) البتہ خریدار کے ذمہ واجب ہے یا نہیں اس سلسلہ میں کتب فقہ کی عبارتیں مختلف نظر آتی ہیں ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ شرح فتح القدیر، درمختار، یوسف القرضاوی کی فقہ الزکوۃ کی عبارت اس سلسلہ میں صریح ہے کہ مشتری (خریدار) پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ خریدار کو قبضہ سے قبل مبیع پر ملک تام حاصل نہیں ہے کیونکہ خریدار قبضہ سے قبل مبیع میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا ہے شرح فتح القدیر میں ہے :

ویخرج ایضا المشتری للتجارۃ اذا لم یقبض حتی حال حول لازکوۃ فیہ اذ لم یستفد ملک التصرف وکمال الملک بکونہ مطلقا للتصرف وحقیقتہ مع کونہ حاجزاً۔[1]

فقہ الزکوۃ میں ہے :

ولہذا قالوا : لا تجب الزکوۃ علی المشتری فیما اشتراہ للتجارۃ قبل القبض لعدم الید[2]

حضرت علامہ علاء الدین الحصکفی درمختار میں تحریر فرماتے ہیں :

ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ[3]

حضرت علامہ شامی اس سلسلہ میں مطمئن نظر نہیں آتے ہیں چنانچہ درمختار کی عبارت قبل قبضہ کے تحت لکھتے ہیں کہ :

"قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوۃ تو قبضہ سے قبل

---

[1] شرح فتح القدیر۔ ج ۲ ص۱۵۱ [2] فقہ الزکوۃ مطبوعہ بیروت۔ ج ۱ ص۱۳۱

[3] الدر المختار علی ھامش رد المحتار۔ ج ۲ ص۷

ہی واجب ہوگی لیکن اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی (قولہ قبل قبضہ) امابعدہ فیزکیہ عمامضی کما نبہ علیہ فی البحر عن المحیط [1]

لیکن حضرت علامہ شامی نے فتاوی خانیہ کے حوالے سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنی جو رائے دی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔ ملاحظہ ہو شامی کی عبارت :

لکن فی الخانیۃ رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسیامۃ ولم یقبضھا حتی حال الحول ثم قبضھا لازکوۃ علی المشتری فیما مضی لانھا کانت مضمونۃ علی البائع۔ بالثمن الخ۔ ومقتضی التعلیل عدم الفرق بین ما اشتراھا للسیامۃ او للتجارۃ فتامل [2]

لیکن خانیہ میں ہے کہ ایک شخص کے پاس سائمہ جانور (وہ جانور جو پورا سال یا سال کا بیشتر حصہ جنگل میں چرنے پر اکتفا کرتا ہو) ہے اور دوسرے شخص نے اس کو سائمہ بنانے کے لئے خریدا اور سال گزرنے کے بعد اس پر قبضہ کیا تو خریدار پر گذشتہ سال کی زکوۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ وہ بائع پر مضمون بالثمن ہے یعنی اگر سائمہ جانور ہلاک ہو جائے تو بائع پر اس کے ثمن کی واپسی ضروری ہوگی۔ اس علت کا تقاضہ یہ ہے کہ جانور خواہ سائمہ بنانے کے لئے خریدا ہو یا تجارت کے لئے دونوں کے حکم میں فرق نہ ہو۔ علامہ شامی نے فتامل ___ کہہ کر اس مسئلہ میں مزید غور و فکر کی دعوت دے دی اور اپنے عدم اطمینان کا اظہار بھی کر دیا۔

مسئلہ کا فقہی جائزہ چونکہ کتب فقہ کی ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے اس لئے ہم پہلے اس کا فقہی جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں وجوب زکوۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جاتی ہے یا نہیں اس کے بعد اپنی رائے قائم کریں گے۔

مذکورہ صورت میں غور کرنے کے بعد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے مبیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو ملک رقبہ تو حاصل ہے اس لئے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد ہی مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے خواہ مبیع پر خریدار کا

---

[1] شامی ج ۲ ص
[2] شامی ج ۲ ص

قبضہ ہو یا نہ ہو۔

البیع ینعقد بالایجاب والقبول [1] البتہ چوں کہ مبیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہے اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خریدار کو مبیع پر قبضہ سے قبل ملک ید حاصل نہیں ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں خریدار پر بھی مبیع کی زکوۃ واجب نہ ہو۔

قال فی الفتح الاصل ان کل عقد ینفسخ بهلاک العوض قبل القبض لم یجز التصرف فی ذالک العوض قبل قبضہ اذا کان عیناً لا یجوز بیع شئ من ذلک ولا ان یشرک فیہ غیرہ [2]

لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خریدار کو ملک رقبہ کے ساتھ ملک ید بھی حاصل ہے اس لئے کہ جب بیع مکمل ہو چکی ہے اور خریدار نے ثمن بھی ادا کر دیا ہے تو اس کو شرعاً مبیع سے انتفاع پر قدرت حاصل ہے کیوں کہ وہ جس وقت چاہے فروخت کرنے والے سے مبیع کا مطالبہ کر کے مبیع سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا اس کی حیثیت دین قوی کی ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آئے۔ علامہ ابن نجیم نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح البحر الرائق میں محیط السرخسی کے حوالے ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو نقل کیا ہے ــــــ محیط السرخسی نے دوسری رائے (قبضہ سے قبل خریدار پر مبیع کی زکوۃ واجب ہو) کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وقد منا ان المبیع لا تجب زکوتہ علی المشتری وذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصاباً لان الملک فیہ ناقص بافتقاد الید والصحیح انہ یکون نصاباً لانہ عوض عن مال کانت یدہ ثابتۃ علیہ وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعاً [3]

علامہ ابن نجیم نے محیط السرخسی کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد بہت ہی بہتر اور عمدہ فیصلہ فرمایا ہے کہ زکوۃ تو قبضہ کے

---

[1] ھدایہ ج ۳ ص ۲ [2] شامی فصل فی التصرف فی المبیع والثمن ج ۴ ص ۱۶۲

[3] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۹-۲۰۸

قبل ہی واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور دین قوی کی طرح گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ فعلی ھذا قولھم لاتجب الزکوۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ نتجب زکوتہ فیما مضی کالدین القوی۔ [1]

خلاصۂ جواب — راقم الحروف علامہ ابن نجیم کے مذکورہ فیصلہ سے متفق ہے اور مذکورہ بحثوں کی روشنی میں اپنی رائے بھی یہی رکھتا ہے کہ قبضہ سے قبل مبیع کی زکوۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور دین قوی کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

عقد اجارہ میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوۃ

جواب -۲- کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کر دی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت رہن کی ہوتی ہے۔ اور شئ مرہون پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہے، نہ ہی راہن پر اور نہ ہی مرتہن پر ——— راہن پر اس لئے زکوۃ واجب نہیں ہے کہ شئ مرہون اس کے قبضہ وتصرف میں نہیں ہے اور شئ مرہون سے اس وقت تک انتفاع بھی نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ مرتہن کے قبضہ میں رہے۔ اور مرتہن پر اس لئے زکوۃ واجب نہیں ہے کہ اس کے قبضہ اور تصرف میں تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ گویا کہ راہن اور مرتہن دونوں کی ملکیت ناقص ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں سے کسی پر شئ مرہون کی زکوۃ واجب نہیں ہے۔

لہٰذا کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوۃ نہ تو کرایہ دار کے ذمہ واجب ہوگی نہ ہی مالک کے ذمہ واجب ہوگی ——— البتہ کرایہ دار کو وہ رقم جب واپس مل جائے تو پھر اس پر سال گزر جائے یا پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس دوسری مالیت ہو تو اس کے ساتھ ضم کرکے کرایہ دار کو اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی

ولا فی مرھون بعد قبضہ (درمختار) وقولہ ای لاعلی المرتھن بعدم ملک الرقبۃ ولاعلی الراھن لعدم الید الیہ واذا استردہ علی الراھن لایزکی عن السنین الماضیۃ وھو معنی قول الشارح بعد قبضہ ویدل علیہ قول البحر ومن

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۲

موانع الوجوب الرهن الخ وظاهره ولو كان الرهن أزيد من الدين الخ [1]

مدارس اور اداروں میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

جواب[۲۲]: مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔

۱ــــــ چندہ دہندگان نے چندہ کی رقم کسی خاص مد، مثلاً مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر صرف کرنے کے لئے دیا ہو۔

۲ــــــ ھدایا، عطیات اور صدقاتِ نافلہ کی رقم جو عام مد میں صرف کرنے کے لئے دی گئی ہو۔

۳ــــــ زکوٰۃ، صدقۂ فطر، چرم قربانی یا دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقمیں۔

پہلی صورت میں چونکہ مدرسہ یا ادارہ کے منتظم و مہتمم چندہ دہندگان کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے جب تک وہ رقم جس مد پر صرف کرنے کے لئے چندہ دہندگان نے دی ہے اس مد پر صرف نہ کر دی جائے چندہ دہندگان ہی اس کے مالک رہیں گے۔ وہ جب چاہیں اس رقم کو واپس لے سکتے ہیں اور دوسرے مد میں صرف کر سکتے ہیں۔ یا صرف کرنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مدرسہ یا دینی ادارہ میں جمع شدہ رقوم پر ملکیت کے تمام احکام جاری ہوں گے۔ اور سال گزرنے پر چندہ دینے والوں کے ذمہ ان رقوم کی زکوٰۃ بھی واجب الادا ہوگی۔

دوسری اور تیسری صورت میں مہتمم و منتظم رقم دینے والوں کے بھی وکیل ہوتے ہیں اور مدارس میں پڑھنے والے طلبہ یا دیگر تمام فقراء و مساکین کے بھی وکیل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذکورہ دونوں طرح کی رقوم کے شرعاً حقدار وہ تمام طلباء و فقراء و مساکین ہوتے ہیں جو متعین نہیں ہیں اور جس مال کا مالک متعین نہ ہو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیساکہ وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے گھوڑے یا اسلامی خزانہ بیت المال میں جمع شدہ رقوم زکوٰۃ، و صدقاتِ واجبہ، یا صدقاتِ نافلہ، مال فیٔ، مال غنیمت کا خمس وغیرہ۔ اس طرح عام فقراء، مساجد، مجاہدین، یتامیٰ، رباط یا دیگر ابواب خیر پر وقف شدہ اشیاء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں مال کا مالک متعین نہیں ہے۔ لہٰذا مدارس اور دینی اداروں میں جمع شدہ دونوں طرح کی رقوم پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں مالک متعین ہے ــــــ علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں

وعلی هذا اذا كان هناك مال لا مالك له واعني بالمالك المالك المعين

---

[1] شامی کتاب الزکوٰۃ ج ۲ ص۶

فلا زکوٰۃ فیہ وذلک کاموال الحکومۃ التی تجمعھا من الزکوٰت او الضرائب
او غیرھا من الموارد فلا زکوٰۃ فیھا لعدم المالک المعین فی ملک جمیع الأمۃ
ومنھا الفقراء...... ولذا قالوا لاتجب الزکوٰۃ فی مال فئ ولا فی خمس غنیمۃ لانہ
یرجع الی الصرف فی مصالح المسلمین وکذلک کل مایملک ملکیۃ عامۃ الارض
الموقوفۃ ونحوھا۔
وکذلک الموقوف علی جھۃ عامۃ کالفقراء او المساجد او المجاھدین او الیتامیٰ
او الرباط او المدارس او غیر ذلک من ابواب الخیر فالصحیح ان لا زکوٰۃ فیھا [1]

خلاصۂ جواب

(الف) پہلی صورت میں جب کہ مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں کسی خاص مد پر صرف کرنے کے لئے دی گئی ہوں چندہ دہندگان کے ذمہ اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگر سال گزر گیا اور وہ رقم محفوظ ہے تو چندہ دہندگان اس کی زکوٰۃ ادا کریں گے۔

(ب) دوسری اور تیسری صورت میں جب کہ صدقاتِ واجبہ کی رقم ہو یا ھدایا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم ہو مالک متعین نہ ہونے کی وجہ سے ان رقوم پر کسی کے ذمہ بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

مال حرام پر زکوٰۃ کا حکم

جوابے: کسی کے قبضہ میں مال حرام ہونے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) پورا کا پورا مال حرام اور مال خبیث ہو ــــــ حلال اور طیب مال کچھ بھی نہ ہو۔

(ب) حرام و حلال دونوں مال ہوں لیکن ایک دوسرے سے علحدہ ہوں۔ باہم مخلوط نہ ہوں۔

(ج) حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہوں کہ ان دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہو۔

چوں کہ پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں جب کہ کل مال حرام ہو یا حلال و حرام دونوں ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے

---

[1] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ صـ ۱۳۱-۱۳۲

علیحدہ ہوں مال حرام پر قبضہ کرنے والے کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے "قنیہ" کے حوالے سے نقل کیا ہے :

"وفی القنیۃ الرشوۃ یجب ردھا ولا تملك" ¹

اس لئے ان دونوں صورتوں میں "مال حرام" پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ وجوب زکوۃ کے لئے ملکیت شرط ہے

"وفی القنیہ لوکان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ" ²

اس مال کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم ومتعین ہو تو وہ مال اس کے حوالہ کیا جائے۔ مالک کے حوالہ خواہ براہِ راست ہو اور یہ کہہ کر دیا جائے کہ تمہارا فلاں مال ہے۔ یا اگر اس طرح حوالہ کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ ہو یا جان و مال کے نقصان یا عزت کی پامالی کا قوی اندیشہ ہو تو بغیر کہے ہوئے بھی کسی بھی ذریعہ سے اس کی ملک تک پہنچا دینا ضروری ہوگا یا اگر مالک معلوم ومتعین نہ ہو تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مالک کی طرف سے اس کا تصدق واجب ہوگا۔

"والحاصل أنہ إن علم أرباب الأموال وجب ردہ وإلا فان علم عین الحرام لایحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ" ³

اس مال حرام کو فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ البتہ رفاہ عام پر بھی صرف کرنے کی گنجائش ہے۔ ⁴

مخلوط مال حرام وحلال پر زکوۃ کا حکم

تیسری صورت جب کہ مال حرام وحلال باہم اس طرح مخلوط ہو چکے ہوں کہ ان کے درمیان تمیز مشکل ہو اس پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں ؟

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ مال حرام وحلال دونوں کے باہم مخلوط ہو جانے

---

¹ شامی کتاب القضاء ج ۴ ص ۳۰۴ ² ردالمحتار کتاب الزکوۃ ج ۲ ص ۲۵

³ شامی مطلب فیمن ورث مالاً حراماً ج ۴ ص ۱۳۰ ⁴ اس کی پوری تفصیل تیسرے مجلہ فقہ اسلامی میں مذکور ہے۔ وہاں پر بحث دیکھی جا سکتی ہے۔

کی وجہ سے استہلاک پایا گیا اس لئے وہ مال جس کے قبضہ میں ہے وہ اس کا مالک ہے ـــــ اس میں وراثت بھی جاری ہوگی اور اس پر زکوۃ بھی واجب ہوگی۔

جہاں تک ضمان کا تعلق ہے کہ مالک کے آنے پر اس مال کی واپسی ضروری ہے تو اس سلسلہ میں امام صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ضمان اس کے ذمہ میں ہے، عین اسی مال کی واپسی ضروری نہیں ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قبضہ کرنے والا "مال حرام" کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ مال اس کے پاس بطور امانت ہے۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک ملکیت کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے۔ نہ وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں اور علامہ علاء الدین الحصکفی نے درمختار میں "الولوالجیۃ" کے حوالہ سے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا مال کم ہے جو حرام مال سے خالی ہو۔ اگر اس طرح کے اموال میں وراثت جاری نہ ہو اور زکوۃ واجب قرار نہ دی جائے تو وارثین اور فقراء و مساکین کا حق مارا جائے گا۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق مذکورہ مخلوط مال پر زکوۃ واجب ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اور امام صاحب اور صاحبین کے مابین اختلاف صرف وراثت کے جاری ہونے میں ہے، نہ کہ وجوب زکوۃ میں۔ امام صاحب کے نزدیک ملکیت کی وجہ سے وراثت جاری ہوگی اور صاحبین کے نزدیک وراثت جاری نہیں ہوگی۔ لیکن تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ مال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اگر امام صاحب کا یہ قول کہ ملکیت ثابت ہو جائے گی تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے قول کے مطابق زکوۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ وہ مال مضمون بالدین ہے۔ اگر مالک کا پتہ ہو تو وہ مال مالک کے حوالہ کیا جائے گا ورنہ بلا نیت ثواب اس کا تصدق واجب ہوگا۔ اور وجوب زکوۃ کے لئے مال کا دیون سے فارغ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں یہی اشکال کیا ہے۔ اور امام صاحب کے قول کے مطابق وجوب کی ایک شرط "المبتغی" کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ:

> "زکوۃ اس شرط کے ساتھ واجب ہے کہ مالکان نے اس مال کی ادائیگی سے بری کر دیا ہو کیونکہ بری کرنے سے قبل وہ مال مضمون بالدین ہے اس لئے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔"

علامہ ابن نجیم نے اس قید کو حسن اور اس کو محفوظ کر لینا واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق کی پوری عبارت:

" ولذا قالوا لو أن سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملكاً له حتى وجبت عليه الزكوة وورث عنه على قول أبي حنيفة لأن خلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهلاك اما على قولهما فلا يضمن فلا يثبت الملك لأنه فرع الضمان ولا يورث عنه لأنه مال مشترك فانما يورث حصة الميت منه وفي الولوالجية وقوله أرفق بالناس إذ قلما يخلو مال عن غصب الخ هكذا ذكروا وهو مشكل لأنه وإن كان ملكه عند أبي حنيفة بالخلط فهو مشغول بالدين والشرط الفراغ عنه وينبغي أن لا تجب الزكوة فيه على قوله أيضاً ولذا اشترط في المبتغى بالغين المعجمة أن يبرئه أصحاب الأموال لأنه قبل الابراء مشغول بالدين وهو قيد حسن يجب حفظه " ؎

علامہ شامی نے اس موقع سے جو بحث کی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ علامہ شامی نے فتاوی تاتارخانیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(الف) مال حرام وحلال کے مخلوط ہونے کی صورت میں اس پر قبضہ کرنے والا شخص اس مال کا مالک تو ہوجائے گا لیکن وہ اس مال کا ضامن ہوگا۔

(ب) اگر ال مخلوط کے علاوہ بقدر نصاب حلال وطیب مال نہیں ہے تو مال مخلوط پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہوگی اس لئے کہ وہ مشغول بالدین ہے۔

(ج) اگر مال مخلوط کے علاوہ دوسرا جائز مال بقدر نصاب موجود ہے تو اس مال میں زکوۃ واجب ہوگی۔

البتہ اس صورت میں یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ زکوۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی جو بقدر نصاب ہے یا مال مخلوط میں بھی واجب ہوگی۔ اگر مال مخلوط میں زکوۃ واجب ہوگی تو پورے مال میں یا صرف جائز و پاک مال میں؟

علامہ شامی کی عبارت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی۔ مال مخلوط میں زکوۃ واجب ہی نہیں ہوگی۔

"وفي الفصل العاشر من التتارخانية عن فتاوى الحجة من ملك أموالاً غير ...

؎ البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۵

طيبة أو غصب اموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامناً وان لم يكن له سواها نصاب فلا زكوٰة عليه فيها وإن بلغت نصاباً لأنه مديون ومال المديون لا ينعقد سبباً لوجوب للزكوٰة عندنا الخ فأفاد بقوله وان لم يكن له سواها نصاب الخ أن وجوب الزكوٰة مقيد بما اذا كان له نصاب سواها.......

لكن لا يخفى إن الزكوٰة حينئذٍ إنما تجب فيما زاد عليها لا فيها" له

لیکن اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مال حرام کی مقدار معلوم ومتعین ہو تو حرام مال کی مقدار کے علاوہ جو جائز مال کی مقدار ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور حرام مال کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔ اور اگر حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی مقدار معلوم نہیں ہے تو پورے مال مخلوط پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ پورے مال کو صدقہ کرنا ہوگا۔

مال حرام کا مالک معلوم ہونے اور نہ ہونے پر زکوٰۃ کا حکم

اس موقع سے یہ بحث بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مال حرام کا مالک معلوم ومتعین ہو تو کیا حکم ہے اور اگر معلوم ومتعین نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے یا کوئی فرق بھی ہے ؟

علامہ شامی نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ان کی بحث سے دو رائیں سامنے آتی ہیں۔

۱ ــــــ اگر مالک معلوم ومتعین نہ ہو تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ اور جب مالک کا پتہ ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اس دین کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ رہا نہیں ــــــ علامہ شامی نے اپنے شیخ کی یہی رائے نقل کی ہے۔

۲ ــــــ مال حرام کا مالک معلوم ومتعین ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ کل مال کا تصدق واجب ہوگا ــــــ علامہ شامی کا رجحان بھی یہی ہے۔

"كما افاده شيخنا بأن المراد ما اذا لم يعلم اصحاب المال المغصوب لأن الدين انما يمنع وجوب الزكوٰة اذا كان له مطالب من جهة العباد وجهل

له شامی کتاب الزکوٰۃ ج ۲ ص۲۵

اصحابه لا يبقى له مطالب فلا يمنع وجوبها قلت لكن قدمنا عن القنية والبزازية
ان ما وجب التصدق بكله لا يفيد التصدق ببعضه لأن المغصوب ان علمت
أصحابه أو ورثتهم وجب رده عليهم والا وجب التصدق به" له

خلاصۂ جواب

(الف) اگر مال مخلوط میں مال حلال وحرام کے درمیان تمیز مشکل ہو اور مال حرام وحلال کی مقدار بھی معلوم ومتعین نہ ہو تو کل مال کا تصدق واجب ہوگا۔ اس طرح کے مال پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

(ب) اگر مال مخلوط کے علاوہ جائز وطیب مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس زائد مال پر زکوۃ واجب ہوگی۔

(ج) مال مخلوط میں اگر حلال وحرام دونوں کی مقدار معلوم ومتعین ہو تو مال مخلوط کے حلال مال کی مقدار پر بھی زکوۃ واجب ہوگی۔ اور مال حرام کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔

دین پر زکوۃ

جواب ۵: دین پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو دائن اور مدیون دونوں پر یا کسی ایک پر؟ اس سلسلہ میں درج ذیل تفصیل ہے:

۱ ـــــــ دائن اور مدیون دونوں پر زکوۃ واجب ہو۔ اس کا قائل کوئی بھی فقیہ نہیں ہے۔

۲ ـــــــ دائن اور مدیون دونوں میں سے کسی پر بھی دین کی زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اس کے قائل حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء ہیں۔ ابن حزم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اصحاب ظواہر کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام مالک کا مسلک بجز چند استثنائی صورتوں کے تقریباً یہی ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ دین میں وجوب زکوۃ کی بنیادی شرط "ملک تام" نہیں پائی جارہی ہے۔ نہ تو دائن کی ملکیت تام ہے اور نہ ہی مدیون کی۔ مدیون کے قبضہ وتصرف میں ہے، لیکن اصل ملکیت حاصل نہیں ہے اور دائن کو اصل ملکیت حاصل ہے۔ لیکن اس کے قبضہ وتصرف میں نہیں ہے۔ لہذا ملک تام نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

له حوالہ مذکور ج ۲ ص۲۶

۳ـــــ دورِ صحابہ سے لے کر ان کے بعد تک کے جمہور فقہائے کے نزدیک مدیون پر تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دائن پر کچھ تفصیل کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

دین کی قسمیں

یہ حضرات دین کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(الف)ـــــ **دین غیر مرجو** ـ وہ دین جس کے ملنے کی امید نہ ہو مثلاً ایسے نادار اور مفلس پر دین ہو جس کی مالداری کی امید نہ ہو۔ یا ایسے شخص پر دین ہو جو دین کا انکار کرتا ہو اور کوئی شرعی شہادت موجود نہ ہو۔

(ب) **دین مرجو** ـ وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو مثلاً کسی ایسے صاحب مال پر دین ہو جو اس دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔

جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ :

"جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ اس کی ادائگی اس پر قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔"

حضرت امام شافعی اور حضرت امام زفر بھی یہی فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک "ملک تام" سے مراد اس مال کا مکمل مالک ہونا ہے۔ خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک مالِ ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جیساکہ اوپر گزر چکا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس مال میں ملکیت باقی ہے تو جو حق اللہ ہے یعنی زکوٰۃ وہ کیسے ساقط ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک اس طرح کے دین کا حکم "مال ضمار" کا ہے۔ مال ضمار (وہ مال جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو) کی طرح قبضہ سے قبل اس دین پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس دین کے ملنے کی امید نہیں ہے اور نہ اس سے انتفاع پر قدرت ہے تو اس مال کی وجہ سے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔ اور زکوٰۃ غنی (صاحب نصاب) پر واجب ہے نہ کہ غیر صاحب نصاب پر۔

علامہ یوسف القرضاوی نے "فقہ الزکوۃ" میں اس مسئلہ پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی ہے اور
اور اخیر میں امام صاحب کی رائے سے مکمل موافقت کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ونحن نوافق أباحنيفة في اعتبار هذا النوع من الدين المجحود او الميئوس منه والمال الضمار بصفة عامة إذا قبضه صاحبه كالمال الجديد المستفاد" [1]

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس پر زکوۃ کا حکم

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی دو رائیں ہیں۔

۱۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جس دین کے ملنے کی امید ہو وہ "دین قوی" ہے۔ ہر سال اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ زکوۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنی ہوگی لیکن مقتول کی دیت اور بدل کتابت پر قبضہ سے قبل زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوگی۔

یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ:

"بدل کتابت اور مقتول کی دیت کے علاوہ اس طرح کے تمام دیون پر صاحب دین کو "ملک تام" حاصل ہے اس لئے کہ وہ دین کی وصولیابی پر قادر ہے۔ جب چاہے وہ اس کا بدل وصول کرسکتا ہے لہذا اس طرح کے تمام دیون پر "ملک تام" پائے جانے کی وجہ سے قبضہ سے قبل بھی زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ دیت اور بدل کتابت پر دائن کی ملکیت ناقص ہے اس لئے ان دونوں میں قبضہ سے قبل زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ دیت پر اس لئے ملکیت ناقص ہے کہ اگر قاتل کے عاقلہ میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو اس پر جو دیت ہے وہ ساقط ہوجائیگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیت پر مقتول کے وارثین کی ملکیت ناقص ہے۔ ورنہ مرنے والے کے ذمہ دین کے ساقط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور "بدل کتابت" درحقیقت دین ہی نہیں ہے اس لئے کہ مکاتب پر جب تک ایک درہم بھی باقی ہو وہ غلام ہے اور غلام پر آقا کا دین واجب نہیں ہوتا ہے۔

---

[1] پوری تفصیل کے لئے دیکھئے فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۳۵ تا ۱۳۸

مکاتب جو کچھ بھی کماتا ہے اس پر من وجہ آقا کی ملکیت بھی رہتی ہے اور من وجہ مکاتب کی بھی۔ آقا کی ملکیت تو اس لئے رہتی ہے کہ غلام کا جو بھی مال ہے وہ آقا کا ہے اور مکاتب کی ملکیت اس لئے رہتی ہے کہ مکاتب اپنی کمائی میں آزاد ہے۔"

۲ ـــــ امام صاحب اس طرح کے دیون کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ دین قوی۔ دین متوسط اور دین ضعیف۔

دین قوی کسی کا قرض کسی کے ذمہ ہو یا تاجر نے سامان تجارت فروخت کیا اور خریدنے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی ہے، اس کو دین قوی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ نصاب زکوۃ کے ۱/۵ کے برابر یعنی چالیس درہم یا اس کی مالیت کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ اس سے قبل زکوۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی لیکن ادائیگی کے وقت گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی حساب کر کے ادا کرنا ہوگی۔

واضح رہے کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ اور ۱/۵ رتی چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ آٹھ رتی برابر ایک ماشہ اور بارہ ماشہ برابر ایک تولہ ہوتا ہے۔ اس طرح چالیس درہم کا وزن دس تولہ چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوا۔ گویا کہ "دین قوی" میں زکوۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دس تولہ اور چھ ماشہ چاندی یا اس کی قیمت کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

دین متوسط وہ قرض جو کسی سامان کی قیمت ہو لیکن وہ سامانِ تجارت کی قیمت نہ ہو۔ اس کو "دین وسط" کہتے ہیں۔ اس دین پر زکوۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا حکم دین قوی کی طرح ہے کہ "دین قوی" کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ البتہ اس میں زکوۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دو سو درہم یعنی ساڑھے باون (۵۲ ۱/۲) تولہ چاندی یا اس کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

امام صاحب سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس میں دین ضعیف کی طرح گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو زکوۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع وغیرہ نے اسی دوسرے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع ج ۲ ص [illegible]

<u>دین ضعیف</u> وہ قرض جو کسی مال کے عوض مدیون پر عائد نہ ہو خواہ وہ کسی چیز کا معاوضہ ہی نہ ہو جیسے حصۂ میراث یا وصیت کا مال جو کسی پر قرض ہو یا کسی چیز کا معاوضہ تو ہو لیکن مال کا معاوضہ نہ ہو مثلاً مہر، یہ معاوضہ تو ہے لیکن مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ ملک بضعہ کا معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ اس کو دین ضعیف کہتے ہیں۔ دین ضعیف پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دیون کی مذکورہ بالا تقسیم اور "دین قوی" پر زکوٰۃ واجب ہونے اور "دین متوسط" اور "دین ضعیف" پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے سلسلہ میں امام صاحب کے دو نقطۂ نظر ہیں۔

۱۔۔۔ پہلا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین درحقیقت مال نہیں ہے بلکہ صاحب دین کو مال کا مالک بنا دینے اور مال اس کے حوالہ کر دینے کا ایک واجبی اور ضروری عمل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل مال نہیں ہے۔ لہذا جب دین مال نہیں تو اصولاً تمام دیون میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہوتی ہے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو وہ مال کے حکم میں ہے کیونکہ کسی چیز کا بدل اس کے قائم مقام ہوا کرتا ہے گویا کہ خود مال تجارت اس کے قبضہ میں ہے جس پر سال گزر رہا ہے لہذا اصولاً و شرعاً "دین قوی" میں تو زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔ دوسرے دیون میں نہیں۔

۲ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر دین کو مال مملوک تسلیم کر لیا جائے تب بھی چوں کہ یہ قبضہ و تصرف میں نہیں ہے اور نہ ہی اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیوں کہ دین ذمہ میں واجب ہے۔ حقیقۃً مال نہیں ہے اور جو چیز ذمہ میں واجب ہو اس پر قبضہ کا احتمال نہیں رہتا ہے اس لئے مال مملوک تسلیم کر لینے کی صورت میں بھی تمام دیون پر اصولاً زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو اس کو مال تجارت کے قائم مقام دیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیونکہ کسی شئی کا بدل اس شئی کے قائم مقام ہوتا ہے لہذا اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔

دیون کی اس تقسیم اور عدم تقسیم کے سلسلہ میں فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔ اسی قول کو عام مشائخ نے اختیار کیا ہے۔ <u>البتہ صاحبین کا قول اختیار کرنا احوط ہے۔</u> ؎

؎ دیون کی اس پوری تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع ج ۲ ص ۸۲۹ تا ۸۲۸ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۷ اور فتاوی خانیہ علی ھامش الفتاوی الھندیہ ج ۱ ص ۲۵۲

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوۃ سرکاری محکمے یا پرائیویٹ کمپنیز یا ادارے اپنے اپنے ملازمین کی تنخواہ جو رقم قانوناً اور جبراً ہر ماہ وضع کرکے اس میں اضافہ کے ساتھ ملازمین کے محفوظ کھاتے میں رکھ دیتے ہیں۔ اور ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کو یا ان کے انتقال کے بعد ان کے وارثین کو اضافہ شدہ رقم کے ساتھ پوری رقم واپس کردیتے ہیں جس کو آج کی اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہا جاتا ہے۔ اس پوری رقم کے حقدار وہ ملازمین ہوتے ہیں۔ یا ان کا واجبی حق ہے جو ان کو یا ان کے وارثین کو ملنا ہی ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت ایسے دین کی ہوگی جس کے ملنے کی امید ہو۔

چوں کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو وہ دین قوی ہے اور اس پر ہر سال زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنا ہوتی ہے اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوۃ واجب ہوگی اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنا ہوگی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے بھی "فقہ الزکوۃ" میں یہی بات لکھی ہے۔ اور ان کی رائے بھی صاحبین کی رائے کے موافق ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

"فالذی أرجحه أن ملکه فی هذه الحال ملك تام وهو کالدین المرجو الذی قال فیه ابوعبید انه بمنزلة المال الذی فی یده فحینئذ تجب فیها الزکوة فی کل حول اذا بلغت نصابًا وتوفرت الشروط الاخری من السلامة من الدین ونحوه" [1]

البتہ امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق غور کرنا ہوگا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دیون کی کس قسم میں داخل ہے؟ آیا "دین قوی" میں یا "دین متوسط" میں یا "دین ضعیف" میں یا "مال ضمار" میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ "دین قوی" ہو نہیں سکتا ہے اس لئے کہ "دین قوی" مال تجارت کا معاوضہ ہوتا ہے یا دیا ہوا قرض ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ان میں سے نہ تو مال تجارت کا معاوضہ ہے اور نہ ہی دیا ہوا قرض۔ یہ "دین متوسط" بھی نہیں اس لئے کہ "دین متوسط" کسی غیر تجارتی مال کا معاوضہ ہوتا ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ خدمت کا

---

[1] فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۳۹

معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ خدمت مال ہے یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں حسب تصریحات فقہاء "عبد تجارت" (وہ غلام جو تجارت کے لئے ہو) کی خدمت تو مال ہے لیکن کوئی بھی فقیہ آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار نہیں دیتا ہے۔ اس رقم کو "مال ضمار" میں بھی شامل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس دین کے ملنے کی امید ہے۔ اب لامحالہ اس کو "دین ضعیف" میں شامل کرنا ہوگا جس پر قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ اوپر دیون کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے امام ابوحنیفہؒ کا قول راجح اور مفتی بہ ہے اور صاحبین کا قول احوط ہے لہٰذا مفتی بہ قول کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل زکوۃ واجب نہیں ہے۔ بلکہ قبضہ کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو زکوۃ واجب ہوگی یا اگر پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس مال موجود ہو جس پر سال گزر رہا ہو تو مال مستفاد کی طرح اس رقم کو بھی سابق نصاب کے ساتھ ضم کر کے زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔

وجوب زکوۃ کی دوسری شرط نماء

وجوب زکوۃ کی دوسری شرط مال کا "نامی" ہونا ہے۔ مال غیر نامی میں زکوۃ شرعاً واجب نہیں ہے۔ وجوب زکوۃ کے لئے "مال نامی" کی شرط کیوں ہے۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں :

"زکوۃ کی مشروعیت اس لئے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس کو مال و دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہ اپنے مال کا کچھ حصہ نکال کر فقراء و مساکین کو دے جس سے ان کی غمخواری ہوگی۔ زکوۃ میں اتنا مال نہ دے جس سے وہ خود فقیر ہو جائے۔ اگر ایسے مال میں زکوۃ واجب قرار دی جائے جس میں "نمو" کی صلاحیت نہ ہو تو زکوۃ دینے والا خود ہی فقیر ہو جائے گا جو اسلامی روح کے خلاف ہے"[1]

نماء کی حقیقت نماء کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ جب مال میں اضافہ ہو تو "نمی المال" کہا جاتا ہے اور جب کسی کے مال میں زیادتی کی دعا دینی ہو تو اس وقت "انماء اللہ تعالیٰ" کہا جاتا ہے۔ نماء کے لغوی معنی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "مال نامی" وہ مال کہلائے گا جس میں حقیقۃً زیادتی ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے اور نہ ہی یہ مقصود ہے۔

---

[1] فتح القدیر ج ۲ ص۱۵۳

بلکہ زیادتی خواہ حقیقۃً ہو یا مال کو زیادتی کے لئے تیار کیا گیا ہو یعنی تجارت یا سائمہ بنانے کے ذریعہ اس میں زیادتی ہو سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر ہر وہ مال "مال نامی" کہلائے گا جس میں اضافہ پر قدرت ہو۔ خواہ براہ راست یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی لکھتے ہیں :

"(ومنها) کون المال نامیًا لان معنی الزکوۃ وھو النما، لا یحصل الامن المال النامی ولسنا نعنی به حقیقة النما لان ذلك غیر معتبر وانما نعنی به کون المال معدًا للاستنما، بالتجارة او بالاسامة" [1]

نمار کی قسمیں

نمار کی شرعًا دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور تقدیری۔

نمار حقیقی سے مراد یہ ہے کہ تجارت یا سائمہ جانوروں کے ذریعہ حقیقۃً یعنی بالفعل زیادتی حاصل کی جائے۔

نمار تقدیری سے مقصود یہ ہے کہ زیادتی پر قدرت ہو خواہ براہ راست اضافہ پر قادر ہو یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ علامہ شامی البحر الرائق کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

" وفی الشرع ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنه من الزیادة بکون المال فی یده او نائبه بحر" [2]

علامہ زیلعی نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح "تبیین الحقائق" میں نمار کی حقیقت اور اس کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے "نمار" کی دوسری قسم بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

" نمار حقیقی اور نمار تقدیری دونوں میں سے ہر ایک کی دو، دو قسمیں ہیں۔ خلقی اور فعلی"

نمار خلقی سے مراد سونا اور چاندی ہے کہ یہ دونوں تجارت کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں میں تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوۃ واجب ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر خرچ کرنے کے لئے رکھے گئے ہوں تب بھی شرعًا ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔

نمار فعلی سے مقصود یہ ہے کہ اس مال کی خلقت تو نمار کے لئے نہ ہو لیکن بندہ نے اس کو نمار کے لئے تیار کر دیا ہو مثلاً مال کو تجارت کی نیت سے یا جانور کو سائمہ بنانے کی غرض سے خریدا تو ان دونوں صورتوں میں نمار

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص۱۱ [2] رد المحتار ج ۲ ص۷ والبحر الرائق ج ۲ ص۲۰۶

فعلاً پائی جائے گی۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق کی عبارت:

"وینقسم کل واحد منهما إلی قسمین الی خلقی وفعلی فالخلقی الذهب والفضة لأنهما خلقا للتجارة فلا یشترط فیهما النیة والفعلی ما یکون باعداد العبد وهو العمل بنیة التجارة" ا ھ [1]

سونا اور چاندی کی خلقت تجارت کے لئے ہوئی ہے۔ اس کا مطلب شیخ شبلی نے تبیین الحقائق کے حاشیہ پر علامہ کمال کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ ان دونوں کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ ان کے ذریعہ دوسری چیزیں حاصل کی جائیں تاکہ ان سے کھانے، پینے، پہننے اور رہائش وغیرہ کی ضرورت پوری ہوسکے۔ اس طرح گویا کہ ان کی تخلیق تجارت کے لئے ہوئی ہے۔

"قال الکمال رحمه الله وقولهم فی النقدین خلقا للتجارة معناه انهما خلقا للتوسل بهما الی تحصیل غیرهما وهذا لان الضرورة ماسة فی دفع الحاجة والحاجة فی المأکل والمشرب والملبس والمسکن وهذه غیر نفس النقدین وفی اخذهما علی التغالب ما لا یخفی فخلق النقد ان لیغرض ان یستبدل بهما ما تندفع الحاجة بعینه بعد خلق الرغبة فیهما فکانا للتجارة خلقة" [2]

نماء عرفی مال نامی کی ایک قسم "عرفی" کی بھی ہے۔ یعنی وہ مال جس کو اللہ تعالیٰ نے نمو کے لئے پیدا نہیں فرمایا لیکن لوگوں نے اس کو "مال نامی خلقی" کے قائم مقام قرار دے دیا۔ اس طرح وہ مال "عرفاً" مال نامی قرار پایا۔ مثلاً سونا، چاندی کے علاوہ مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں۔ جیسے کاغذی نوٹ، سکے، ڈالر اور ریال وغیرہ۔

اس طرح نماء کی کل چھ قسمیں ہو جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ نماء حقیقی خلقی ۲۔ نماء حقیقی عملی ۳۔ نماء حقیقی عرفی ۴۔ نماء تقدیری خلقی ۵۔ نماء تقدیری عملی ۶۔ نماء تقدیری عرفی۔

---

[1] تبیین الحقائق ج ۱ ص۲۵۶ [2] حاشیہ چلپی علی تبیین الحقائق ج ۱ ص۲۵۶

مال غیر نامی پر زکوۃ واجب نہیں ہے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وجوب زکوۃ کے لئے نمو شرط ہے تو اس مال پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہے جس میں سرے سے "نمو" کی صلاحیت ہی نہیں ہے یا نمو کی صلاحیت تو ہے لیکن مالک کو کسی طرح بھی "نمو" پر قدرت نہیں ہے، نہ براہِ راست اور نہ ہی اپنے نائب کے ذریعہ۔ اسی وجہ سے مال ضمار، مال مفقود، مال مغصوب یا اس طرح کے دیگر اموال پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح ضروریات کے سامان پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح کے اموال "مال نامی" سے خارج ہیں۔ علامہ ابن نجیم نما، اور اس کی قسموں کو بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

" فلا زکوۃ علی من لم یتمکن منہا فی مالہ کمال الضمار الخ " [1]

نمو سے عجز کی دو صورتیں ہیں

اس موقع سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک ہے مال کا "نمو" سے عاجز ہونا مثلاً مال ضمار وغیرہ۔ دوسری صورت ہے مالک کا عاجز ہونا مثلاً مال قبضہ میں ہے لیکن مالک تجارت وغیرہ کے ذریعہ نما پر قادر نہیں ہے۔ پہلی صورت میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دوسری صورت میں زکوۃ واجب ہے اس لئے کہ مالک کا عجز شرعاً معتبر نہیں ہے کیونکہ وہ ایسا حیلہ اختیار کر سکتا ہے جس سے مال میں اضافہ ہو مثلاً شرکت، مضاربت وغیرہ کا معاملہ کرے۔ بہرحال! اسباب کے مہیا کرنے سے وہ عاجز نہیں ہے۔ لہذا مالک کے عاجز ہونے کے باوجود "مال نامی" پر زکوۃ واجب ہو گی۔ [2]

مال نامی کا دائرہ

مال نامی سے متعلق ایک اہم بحث یہ آتی ہے کہ "مال نامی" کا دائرہ محدود و مخصوص ہے یا غیر محدود اور عام؟ اس سلسلہ میں دو نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ابن حزم، شوکانی اور صدیق حسن خان وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ "مال نامی" کا دائرہ محدود ہے

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۶ [2] فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۳۳ – ۱۳۵

اور انھیں خاص اصناف پر زکوۃ واجب ہے جن پر زکوۃ لینے کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ابن حزم نے اپنی مشہور کتاب "محلی" میں ان کی تعداد آٹھ بتلائی ہے۔

۱۔ابل ۲۔بقر ۳۔غنم ۴۔قمح ۵۔شعیر ۶۔تمر ۷۔فضہ ۸۔ذہب

ان کے علاوہ دوسرے اصناف پر جن پر زکوۃ لینے کا ثبوت احادیث سے نہیں ہے زکوۃ واجب قرار نہیں دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس سلسلہ میں دو باتیں فرماتے ہیں:-

(الف) مسلمان کا مال محترم ہے جس کا ثبوت نصوص سے ہے لہذا بغیر نص کے مسلمان کے مال سے کچھ لینا جائز نہیں ہے

(ب) زکوۃ تکلیف شرعی ہے اس میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۲ ـــــ جمہور صحابہ، تابعین، محدثین اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور عام ہے۔ جس مال میں بھی "نمو" کی صلاحیت موجود ہو اس پر زکوۃ واجب ہوگی گرچہ نصوص سے اس مال پر زکوۃ لینے کا ثبوت نہ ہو۔ جمہور کے نظریہ کی بنیاد چند اصولوں پر قائم ہے جو درج ذیل ہیں:

(الف) قرآن کریم کی جن آیات اور احادیث نبویہ کی جن روایات سے زکوۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے وہ عام ہیں۔ ان میں کوئی قید نہیں کہ فلاں مال میں زکوۃ واجب ہے اور فلاں میں نہیں۔ البتہ روایات سے یہ واضح ہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے "مال نامی" ہونا ضروری ہے اس لئے "مال نامی" کی قید لگائی جاتی ہے۔

(ب) ہر مالدار (صاحب نصاب) پر ضروری ہے کہ وہ اخلاق رذیلہ بخل اور لالچ وغیرہ سے پاک صاف ہو اور مال کی محبت اس کے دل سے نکل جائے اور یہ طہارت مال میں زکوۃ نکالنے کے ذریعہ ہوسکتی ہے جو کسی بھی مال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس مال سے بھی وہ زکوۃ دے گا اس کا تزکیہ ہوگا۔

(ج) مال کی طہارت بھی ضروری ہے تاکہ کمائی کے دوران کچھ شبہات پیدا ہوتے ہوں وہ دور ہوسکیں اور مال کی طہارت اس کی زکوۃ دینا ہے۔ جو صرف مذکورہ آٹھ قسموں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر "مال نامی" کی طہارت ضروری ہے۔

(د) زکوۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے اور ان کی ضرورت صرف مذکورہ اموال سے پوری نہیں ہوگی بلکہ ہر "مال نامی" سے ان کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اموال غیر نامیہ میں بھی زکوۃ واجب ہو لیکن چوں کہ روایات میں "اموال نامیہ" کی قید لگائی گئی ہے اس لئے اموال غیر نامیہ پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مال مسلم کے احترام کا تعلق ہے تو وہ خاص اس کی ملکیت میں ہے۔ زکوٰۃ تو حق اللہ یا بالفاظ دیگر حق الجماعۃ ہے۔ اس کی وصولیابی تو بہرحال ضروری ہے۔ اور جہاں تک ان اموال سے زکوٰۃ وصول نہ کرنے کا تعلق ہے تو یا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اموال میں "نمو" کی صلاحیت کمزور تھی اس لئے ان کے مالکان کی رعایت کرتے ہوئے زکوٰۃ معاف کر دیا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اموال کے مالکان کو اپنا نائب بنا کر زکوٰۃ دینے کا حکم دے دیا ہو۔ بہرحال ! جمہور کا مسلک صحیح ہے۔ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور عام ہے [۱]

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط — حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ایک بنیادی شرط "اموال نامیہ" کا حوائج اصلیہ سے زائد ہونا ہے جو مال حوائج اصلیہ میں شامل ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس مال کے ذریعہ غنیٰ کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ شرعاً غنی پر واجب ہے۔ نیز حوائج اصلیہ میں شامل اموال پر زکوٰۃ کی ادائیگی خوش دلی سے نہیں ہو سکتی ہے جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ادوا زکوۃ اموالکم طیبۃ بھا انفسکم" یعنی اپنے اموال کی زکوٰۃ خوش دلی سے نکالو [۲]

حاجت کے ساتھ اصلیہ کی قید کیوں لگائی گئی ہے اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ :

> "چوں کہ انسان کی حاجتیں بیشمار اور لامحدود ہیں۔ خاص طور سے اس زمانہ میں جب کہ تعیش و کمال، حاجت کا اور حاجت، ضرورت کا درجہ اختیار کر چکی ہے اس لئے ہر وہ چیز جس کی خواہش انسان رکھتا ہے اس کو حاجت اصلیہ میں شمار کر کے وجوب زکوٰۃ سے خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ انسان حریص ہے اگر اس کو سونے کی دو وادی مل جائے تو خواہش کرے گا کہ تیسری بھی مل جائے۔"

ملاحظہ ہو عبارت :

" وانما قلنا : الحاجۃ الاصلیہ؛ لان حاجات الانسان کثیرۃ ولا تکاد

---

[۱] پوری تفصیل کے لئے دیکھئے فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۴۵ تا ۱۴۹ [۲] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۸۲۸

تتناهى، وخاصة فى عصرنا الذى تكاد تصبح فيه الكماليات حاجيات والحاجيات ضروريات فليس كل مايرغب فيه الانسان يُعدّ حاجة اصلية لان ابن آدم لوكان له واديان من ذهب لابتغى ثالثاً۔" [1]

حاجت اصلیہ کی تعریف

حاجت اصلیہ کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف علامہ یوسف القرضاوی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"ولكن الحاجات الاصلية مالاغنى للانسان عنه فى بقائه كمأكله وملبسه ومشربه ومسكنه ومايعينه على ذلك من كتب علمه وفنه وادوات حرفته ونحو ذلك۔"

یعنی حاجت اصلیہ ہر وہ چیز ہے جو انسان کی بقا کے لئے ضروری اور معین و مددگار ہو جیسے کہ کھانا، کپڑا، پانی یا رہائشی مکان یا جس علم وفن کو حاصل کرنے والا ہے اس علم وفن کی کتابیں۔ یا جس پیشہ کو اختیار کرنے والا ہو اس پیشہ کے آلات وغیرہ [2]

فقہاء احناف نے حاجت اصلیہ کی نہایت ہی علمی اور دقیق تفسیر بیان کی ہے۔ چنانچہ علامہ شامی ابن ملک کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

"وهى مايدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد اوتقديراً كالدين فان المديون محتاج الى قضائه بما فى يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك۔" [3]

یعنی حاجت اصلیہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو ہلاکت سے محفوظ رکھے خواہ وہ ہلاکت حقیقی ہو

---

[1] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص۱۵۲ — [2] حوالہ مذکور

[3] رد المحتار ج ۲ ص۷

یا تقدیری حقیقی کی مثال نفقہ، رہائشی مکان، آلات حرب، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے ضروری کپڑے ہیں اور تقدیری کی مثال "دین" ہے اس لئے کہ مدیون اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ اس کو دے کر قرض کی ادائیگی کر دے تاکہ قید وغیرہ سے محفوظ رہ سکے کیوں کہ قید ایک طرح سے ہلاکت ہی ہے۔ آلات حرفہ، گھریلو سامان اور سواری کے جانور بھی تقدیری کی مثال ہیں اسی طرح علم و فن حاصل کرنے والوں کے لئے اس علم و فن کی کتابیں ہیں کیوں کہ جہالت ہلاکت کے مانند ہے۔

خلاصہ یہ کہ حاجت اصلیہ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کی بقاء اور اس کے وجود کے لئے ضروری ہیں۔ اور جو اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھ سکیں خواہ حقیقۃً ہو یا تقدیرًا۔

حاجت اصلیہ کا دائرہ

یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ کیا ہے ؟ ایا جس شخص کے مال پر زکوۃ واجب ہے اسی کی ضروریات کی چیزیں حوائج اصلیہ میں شامل ہونگی یا دوسرے لوگوں کی ضروریات بھی اس کے حوائج اصلیہ کے تحت آئیں گی ؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ صرف زکوۃ دینے والے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ضروریات کے ساتھ بیوی، نابالغ اولاد یا جن بالغ اولاد کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ اسی طرح والدین اور دیگر رشتہ دار جن کا نفقہ واجب ہے ان سب کی ضروریات اس کے حوائج اصلیہ میں شمار ہوں گی۔

"والمعتبر هنا : الحاجات الاصلية للمكلف بالزكوة، ومن يعوله من الزوجة والاولاد - مهما بلغ عددهم - والوالدين والاقارب الذين تلزمه نفقتهم فان حاجتهم من حاجته" [1]

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور کے اعتبار سے ہوگا

چوں کہ زمانہ، حالات اور ماحول کی تبدیلی سے لوگوں کی حاجت و ضرورت میں تبدیلی آتی رہتی ہے ہر دور میں ہر ایک کی حاجت و ضرورت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک چیز ہے جو عام انسانوں کی حاجت و ضرورت سے

---

[1] فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۵۳

خارج ہے لیکن کسی خاص انسان مثلاً وزیر اعظم کی حاجت وضرورت میں شامل ہے اس لئے "حاجت اصلیہ" کا تعین ہر دور اور ہر زمانہ کے اعتبار سے ہوگا حتیٰ کہ افراد و اشخاص کے اعتبار سے بھی حاجت اصلیہ کا تعین علٰحدہ ہوگا۔ وقت کے صاحب الرای اور اولی الامر جو لوگ ہوں گے ان پر چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ جس کو "حاجت اصلیہ" میں شمار کریں گے اس کا شمار "حاجت اصلیہ" میں ہوگا۔ ہر ایک کو "حاجت اصلیہ" کے تعین کا اختیار نہیں ہوگا۔

"والذی نری علی کل حال: أن الحاجات الاصلیة للانسان قد تتغیر وتتطور بتغیر الأزمان والبیئات والأحوال۔ والاولیٰ ان تترک لتقدیر اھل الرای واجتھاد اولی الأمر" [1]

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط — دین سے محفوظ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط "مال نامی" کا دین سے محفوظ ہونا بھی ہے اگر "مال نامی" حوائج اصلیہ سے زائد ہے لیکن دین سے محفوظ نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس دس ہزار روپے حوائج اصلیہ سے زائد ہیں۔ لیکن وہ دس ہزار روپے کا مقروض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں یا پانچ ہزار روپے کا مقروض ہے تو پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ بقیہ پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حضرت عثمان غنی رضؓ نے ماہ رمضان المبارک میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں خطبہ دیا، اور خطبہ کے دوران یہ ارشاد فرمایا:

"فمن کان لہ مال وعلیہ دین فلیحسب مالہ بما علیہ ثم لیزک بقیة مالہ" [2]

یعنی اگر کسی کے پاس مال ہے اور اس پر دین بھی ہے تو دین کے بقدر مال الگ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ دے۔ کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مدیون کا مال زکوٰۃ کے عموم سے خارج ہے۔ اور مال کی جو مقدار دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ نیز جو مال دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہو وہ حوائج اصلیہ میں سے ہے کیوں کہ دین کی ادائیگی انسان کی حاجت اصلیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور جس

---

[1] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص۱۵۱

[2] بحوالہ بدائع الصنائع ج ۲ ص۱۸

مال کا شمار حوائج اصلیہ میں ہو اس کی موجودگی میں غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوۃ غنی پر واجب ہے نہ کہ غیر غنی پر لہٰذا دین کے بقدر جو مال ہے وہ مال زکوۃ نہیں قرار پائے گا۔ اور اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی علامہ کاسانی لکھتے ہیں

"ولانه محتاج الى هذا المال حاجة اصلية لان قضاء الدين من الحوائج الاصلية والمال المحتاج اليه حاجة اصليه لا يكون مال الزكوة لانه لا يتحقق به الغنى ولاصدقة الا عن ظهر غنى عن لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم" [1]

اب یہاں پر تین باتیں قابل ذکر ہیں جن پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔۔۔۔ کس مال میں دین مانع وجوب زکوۃ ہے ؟

۲۔۔۔۔ وہ دین جو مانع وجوب زکوۃ ہے اس کی کتنی قسمیں ہیں ؟

۳۔۔۔۔ کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے ؟

پہلی صورت ۔ کس مال میں دین مانع وجوب زکوۃ ہے

کس مال میں دین مانع وجوب زکوۃ ہے اس سلسلہ میں غور کرنے سے فقہاء کرام کے تین اقوال سامنے آتے ہیں ۔

(الف) بعض فقہاء اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کے درمیان فرق کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک اموال باطنہ (نقود اور اموال تجارت) میں دین مانع وجوب زکوۃ ہے۔ اموال ظاہرہ (سائمہ جانور اور کھیت کی پیداوار) میں نہیں ۔

(ب) جمہور کے نزدیک اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں طرح کے اموال میں دین مانع وجوب زکوۃ ہے ۔

(ج) البتہ امام ابوحنیفہؒ کا راجح قول یہ ہے کہ کھیت کی جو بھی پیداوار ہو خواہ غلے ہوں یا پھل وغیرہ اس میں دین مانع وجوب زکوۃ نہیں ہے ۔ دین کے باوجود زمین کی کل پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا ۔ اس لئے کہ عشر زمین کا فریضہ ہے نہ کہ اموال کا ۔ لہٰذا مالک کے غنا اور فقر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا ۔ بلکہ زمین سے جو بھی پیداوار ہوگی اس پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا ۔ اسی وجہ سے

---

[1] بحوالہ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۸۱۸

اراضی موقوفہ کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ یہی قول احناف کا مفتی بہ ہے اور اسی پر عمل بھی ہے۔

" واما علیٰ ظاهر الرواية فلان العشر مؤنة الارض النامية كالخراج فلا يعتبر فيه غنى المالك ولهذا لا يعتبر فيه اصل الملك عندنا حتى يجب في الاراضي الموقوفة وارض المكاتب۔ " لہ

دوسری صورت ۔ اس دین کی قسمیں جو مانع زکوٰۃ ہے

جو دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ دین اللہ اور دین العبد۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی مختلف صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱ـــــ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو ـ مثلاً زکوٰۃ، دین اللہ ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا بندہ ہے اس لئے کہ "اموال ظاہرہ" میں تو خود سلطان مطالبہ کرتا ہے۔ اور "اموال باطنہ" میں اس کے نائب یعنی اصحاب اموال۔ حضرت عثمان غنی رضؓ کے ابتدائی دور تک تو "اموال ظاہرہ" اور "اموال باطنہ" دونوں کی زکوٰۃ کی وصولیابی حکومت وقت کی جانب سے ہوا کرتی تھی لیکن جب بعد میں اموال کی کثرت ہوئی اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور تمام اموال کا تتبع دشوار ہوا تو حضرت عثمان غنی رضؓ نے خود اصحاب اموال کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح اصحاب اموال سلطان کے نائب اور وکیل قرار پائے۔ اسی وجہ سے اگر اصحاب اموال "اموال باطنہ" کی زکوٰۃ از خود ادا نہ کریں تو سلطان ان سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لہ

۲ـــــ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو ـ مثلاً حج فرض یا نذر یا نماز، روزہ وغیرہ کا کفارہ کہ یہ سب دین اللہ ہیں لیکن ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی ادائیگی پر نہ تو کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قید و بند کیا جا سکتا ہے۔

۳ـــــ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو ـ مثلاً ایسا دین ہے جس کے مالک کا پتہ ہے اس طرح کے دین کا مطالبہ کرنے والا خود مالک یا اس کا نائب موجود ہے۔

۴ـــــ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو ـ مثلاً کسی کے پاس مال حرام ہے لیکن اس کے

لہ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۱

لہ دیکھئے شامی ج ۲ ص کتاب الزکوٰۃ

مالک کا پتہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مال حرام "دین العبد" تو ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی طرح "مہر مؤجل" کہ اس کی ادائیگی کا وقت موت یا طلاق ہے۔ ہندوستانی عرف و عادت کے مطابق بیوی موت یا طلاق سے قبل اپنے اس دین کا مطالبہ نہیں کرسکتی ہے۔ گویا کہ یہ دین ہی نہیں ہے۔ اس طرح مہر مؤجل دین العبد تو ہے لیکن کوئی عبد اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں ہے۔

۵ ــــــ دین العبد اصالۃً ہو ــ یعنی براہ راست یہ دین اس کے ذمہ عائد ہو۔ کسی دوسرے کے دین کی ذمہ داری نہ لی ہو۔

۶ ــــــ دین العبد کفالۃً ہو ــ کسی پر دوسرے شخص کا قرض تھا۔ مقروض شخص اس کی ادائیگی میں ٹال مٹول کررہا تھا۔ یا اس کی ادائیگی سے قاصر تھا۔ اور قرض دینے والا مسلسل اس سے مطالبہ کررہا تھا اور پریشان کئے ہوا تھا۔ دوسرے شخص نے اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی۔ جس نے قرض کی ضمانت لی ہے اس پر یہ دین اصالۃً نہیں ہوگا بلکہ کفالۃً ہوگا۔ قرض دینے والا اپنے قرض کا مطالبہ ضمانت لینے والے سے بھی کرسکتا ہے۔

۷ ــــــ دین العبد مجل ہو ــ یعنی وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری ہو۔ دائن ہر وقت اپنے دین کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

۸ ــــــ دین العبد مؤجل ہو ــ وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری نہ ہو۔ دائن وقت سے پہلے اپنے دین کا مطالبہ نہیں کرسکتا ہے۔

یہ دین کی چند صورتیں ہوئیں۔ ان میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسری صورت ــ کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے

تیسری اور اہم بحث یہ ہے کہ مذکورہ بالا دیون میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی یہ تصریحات موجود ہے کہ وہ دین مانع وجوب زکوۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ موجود ہے۔ خواہ وہ دین اللہ ہو یا دین العبد۔ اصالۃً ہو یا کفالۃً اور مؤجل ہو یا معجل۔ لہذا زکوۃ جو دین اللہ لیکن مطالبہ کرنے والا بندہ یعنی سلطان یا اس کا نائب موجود ہے۔ یا کسی کے دین کی ضمانت لے لی ہو یا طویل الاجل دین ہو یہ مانع وجوب زکوۃ ہیں۔ علامہ علاء الدین الحصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

"فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد سواءکان للہ کزکاۃ وخراج اوللعبد ولوکفالۃ اومؤجلا الخ" ۔ [1]

البتہ اگر ایسا دین ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے وہ مانع وجوب زکوۃ نہیں ہے لہذا نذور، کفارات، صدقۂ فطر اور وجوب حج وغیرہ، یہ دیون مانع وجوب زکوۃ نہیں ہوں گے کیوں کہ ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی عبد نہیں ہے۔ ان کا اثر احکام آخرت میں ظاہر ہوگا یعنی ان کی ادائیگی پر ثواب اور ترک پر گناہ ہوگا۔ احکام دنیا میں ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے اس طرح کے دیون کی ادائیگی پر نہ تو جبر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدم ادائیگی پر قید وبند۔ بدائع الصنائع میں ہے۔

"واما الدیون التی لا مطالب لها من جهة العباد کالنذور والکفارات وصدقة الفطر ووجوب الحج ونحوها لا یمنع وجوب الزکوة لان اثرها فی حق احکام الآخرة وهو الثواب بالاداء والاثم بالترک فاما لا اثر له فی احکام الدنیا الا تری انه لا یجبر ولا یحبس فلا یظهر فی حق حکم من احکام الدنیا فکانت ملحقة بالعدم فی حق احکام الدنیا" ۔ [2]

جہاں تک اس مال حرام کا تعلق ہے جس کے مالک کا پتہ نہیں ہے اصولاً اس کو مانع وجوب زکوۃ نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی عبد نہیں ہے لیکن یہ بھی مانع وجوب زکوۃ ہے اس کی تفصیل مال حرام کی بحث میں گزر چکی ہے۔

مہر مانع وجوب زکوۃ ہے یا نہیں ایک بحث مہر کی رہ جاتی ہے کہ مہر مانع وجوب زکوۃ ہے یا نہیں ؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں۔

۱ ـــــ مطلقاً مہر مانع وجوب زکوۃ ہے خواہ معجل ہو یا مؤجل اور اس کی ادائیگی کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

۲ ـــــ مہر معجل مانع ہے۔ مہر مؤجل نہیں۔

۳ ـــــ اگر شوہر مہر ادا کرنے کا عزم رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

---

[1] الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۵ [2] بدائع الصنائع ج۲ ص۸۲

علامہ شامی نے قہستانی کے حوالہ سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے: "زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ غیر مانع" [1] جب کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی اگر شوہر مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں [2]

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مہر معجل ہے تو یہ مانع وجوب زکوٰۃ ہے خواہ شوہر فی الفور ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس لئے کہ عورت جس وقت چاہے اپنے مہر معجل کا مطالبہ کر سکتی ہے، اس میں طلاق اور موت سے قبل بھی مطالبہ کا حق ہے اسی طرح اگر مہر مؤجل ہے اور شوہر فی الحال مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہے تو مہر مؤجل بھی مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا۔ البتہ اگر مہر مؤجل میں فی الحال ادائیگی کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو چوں کہ ہندوستانی عرف وعادت کے مطابق موت یا طلاق سے قبل عورت کو مہر کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے ایسی صورت میں مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔

دین طویل الاجل بھی مانع زکوٰۃ ہے

چوں کہ فقہی تصریحات کے مطابق دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ ہے جیساکہ اوپر در مختار وغیرہ کے حوالہ سے گزر چکا اس لئے سرکار کی جانب سے مختلف پروگراموں کے لئے ملنے والا قرض جس کی ادائیگی کے لئے ایک لمبی مدت مقرر ہوتی ہے، مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ پورے قرض کو منہا کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنیز جس کی مالیت مشترک ہے چند افراد کے درمیان، کسی خاص فرد کی ملک نہیں، اور مال مشترک کا حکم یہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر شریک کے حصہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اسی پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب پہنچ جائے لہٰذا مذکورہ صورت میں وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنیز کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فرد کے حصہ کا علحدہ علحدہ اعتبار کیا جائیگا۔ جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب ہو اسی پر زکوٰۃ شرعاً واجب ہوگی۔ مال مشترک پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو

---

[1] شامی ج ۲ ص ۵

[2] دیکھئے امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۰۹

درمختار اور شامی کی عبارت :

" (ولاتجب) الزکوۃ عندنا (فی نصاب) مشترک (من سائمۃ) ومال تجارۃ (وان صحت الخلطۃ فیہ) . . . . فان بلغ نصیب احدھما نصابًا زکاہ دون الآخر (درمختار) (قولہ فی نصاب مشترک) المراد ان یکون بلوغہ النصاب بسبب الاشتراک وضمّ احد المالین الی الآخر بحیث لا یبلغ مال کل منھما بانفرادہ نصابًا " ؎

ہیرے اور جواہرات پر زکوۃ

اصول یہ ہے کہ سونے اور چاندی یا مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں جو "ثمن" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور سائمہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں جب تک اس کو تجارت کی نیت سے حاصل نہ کیا جائے زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے فقہائے نے صراحتًہ لکھا ہے کہ ہیرے، جواہرات مثلاً لعل، یاقوت، زمرد وغیرہ یا جائداد یا وہ جانور جن کو چارہ کھلایا جاتا ہے یا غلام یا کپڑے یا دیگر سامان وغیرہ میں شرعًا زکوۃ واجب نہیں ہے الا یہ کہ ان کو تجارت کی نیت سے حاصل کیا جائے۔ لہذا مذکورہ صورت میں جو ہیرے اور جواہرات محض انکم ٹیکس سے بچنے کی غرض سے خرید کر محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ خریدتے وقت ان میں تجارت کی نیت نہیں ہوتی ان پر شرعًا زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو خواتین ہیرے اور جواہرات کو محض تزیین اور آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہے۔ گرچہ ان ہیروں اور جواہرات کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں روپئے کیوں نہ ہوں۔

" (لا زکوۃ فی اللآلی والجواھر) وان ساوت الفًا اتفاقًا (الا ان تکون للتجارۃ) والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ الخ (درمختار) (قولہ والجواھر) کاللعل والیاقوت والزمرد وامثالھا درر عن الکافی (قولہ وان ساوت الفًا) فی نسخۃ الوفًا (قولہ ما عدا الحجرین) . . . .

؎ شامی باب زکوۃ المال ج ۲ ص ۳۲

وماعدا ذکر کالجواهر والعقارات والمواشی العلوفة والعبید والثیاب والامتعة ونحوذلک من العروض ،، لہ

اموال تجارت کی زکوۃ میں کس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا

مفتی بہ قول کے مطابق زکوۃ کی ادائیگی کے وقت سامانِ تجارت کی جو قیمت ہوگی اسی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی حساب سے زکوۃ ادا کی جائے گی۔ سامانِ تجارت کی خرید و فروخت جس اعتبار سے ہوتی ہو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی یعنی اگر سامان کی خرید و فروخت تھوک بھاؤ سے ہوتی ہو تو تھوک بھاؤ سے اور اگر پھٹکر کے اعتبار سے ہوتی ہو تو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔

"وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء۔ وفی السوائم یوم الاداء اجماعًا وهو الاصح وفی رد المحتار: وفی المحیط یعتبر یوم الاداء بالاجماع وهو الأصح . . . وعلیه فاعتبار یوم الاداء یکون متفقًا علیه عنده وعندهما" ؎

اراضی کی خرید و فروخت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلہ حاصل کرنے کے لئے خریدی جائے اور ضرورت پڑنے پر فروخت بھی کی جائے۔ ایسی صورت میں اراضی کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ اس کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا۔ اگر زمین عشری ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اراضی کی خرید و فروخت تجارت کی غرض سے ہو یعنی اراضی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہو اور ضمنی طور پر غلہ بھی حاصل کیا جائے۔ ایسی صورت میں جو اراضی سال گزرنے پر مالک کے پاس بچ جائے وہ اموال تجارت میں شمار ہوں گی اور ان اراضی کی مالیت پر زکوۃ واجب ہوگی۔ زکوۃ کی ادائیگی کے وقت ان اراضی کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

شیئرز کی زکوۃ

شیئرز چوں کہ تجارتی سرمایہ ہے اس لئے اس پر شرعًا زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ شیئرز کی زکوۃ کس اعتبار سے ادا کی جائے گی یعنی زکوۃ اصل رقم پر واجب ہوگی یا اصل رقم اور منافع

لہ رد المحتار کتاب الزکوۃ قبیل باب السائمة ج ۲ ص ۱۴ ؎ شامی ج ۲ ص ۲۳

دونوں پر یا زکوۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیرز کی جو قیمت ہے اس پر زکوۃ واجب ہوگی مثلاً ایک تجارتی کمپنی قائم ہے جس کی مالیت مثلاً ایک لاکھ کی ہے جس میں دس آدمی شریک ہیں۔ زید نے بھی دس ہزار روپئے جمع کیا اور دس ہزار روپئے کے بقدر کمپنی کا مالک ہوگیا۔ ایک سال کے بعد زید کو ایک ہزار روپئے نفع ملے۔ اب کمپنی میں زید کی مالیت گیارہ ہزار روپئے ہوگئی۔ اور اسی شیر کی قیمت بازار میں مثلاً بارہ ہزار روپئے ہے۔ تو زکوۃ ان تینوں میں سے کس مالیت کے اعتبار سے واجب ہوگی ؟

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے یعنی گیارہ ہزار روپئے اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔ اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص شیرز کی خرید وفروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیرز کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوۃ واجب ہوگی۔

بونڈس کی زکوۃ

بونڈس جو درحقیقت قرض ہے جس کی ادائیگی کی مدت کمپنی یا حکومت کی جانب سے ۵ سال یا دس سال کی مقرر ہوتی ہے اس کی حیثیت "دین قوی" کی ہے۔ لہذا "دین قوی" کی طرح ہر سال اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ کم از کم نصاب زکوۃ کے ۱/۵ کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

جوابات بابت سوالات زکوٰۃ

از: مولانا محمد رضوان القاسمی، ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

محور اول

۱۔ جس تجارتی سامان کی قیمت پیشگی ادا کی جا چکی ہے مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حصکفی نے ایسے سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں:

"إلا في ما اشتراه للتجارة قبل قبضه" (۱)

۲۔ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، اس لیے کہ اس کو اس مال پر ملک تام حاصل ہو چکا ہے، ملک تام کے لیے فقہاء نے ملکیت رقبہ اور قبضہ کی شرط لگائی ہے اور یہ دونوں باتیں یہاں مالک مکان کو حاصل ہیں ——— البتہ جو رقم مالک مکان کو بطور ڈپازٹ دی گئی ہے اور مدت کرایہ مکمل ہونے پر یہ رقم واپس ہونی ہے اس کی حیثیت اگر کرایہ دار کی طرف سے امانت مانی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے مالک مکان پر چوں کہ اس کی حیثیت دین کی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے، لیکن امانت اور اس زر ضمانت میں فرق یہ ہے کہ امانت کبھی بھی واپس لینا ممکن ہوتا ہے جب کہ یہاں کرایہ دار ہوتے ہوئے اس بات

(۱) درمختار علی هامش الرد ۲/۴

کا اختیار نہیں رکھتا کہ کرایہ کی رقم واپس لے، اس لیے رقم کی حیثیت "رہن" کی سی ہے، جیسے مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہوتی ہے نہ مرتہن پر یہی اس کا بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ رہن کی طرح اس زرِ ضمانت کی حیثیت بھی ایک ایسی رقم کی ہے جو وثیقہ کی حیثیت سے اس کے پاس رہتی ہے۔ علامہ شامی نے مال مرہون کے متعلق لکھا ہے:

"ولافی مرهون أی لاعلی المرتهن لعدم الملك الرقبة ولاعلی الراهن لعدم الید" (۱)

۳ ـــــ زکوٰۃ کا مخاطب شریعت نے افراد کو بنایا ہے نہ کہ اداروں کو، اس لیے دوسری عبادت کی طرح زکوٰۃ کا تعلق بھی افراد سے ہے، دوسرے زکوٰۃ کے لیے شریعت نے ملک بلکہ ملک تام کی شرط لگائی ہے اور دینی مدارس اور ایسے دوسرے خیراتی ادارے اپنے فنڈ کے مالک نہیں ہوتے بلکہ واقفین اور معاونین کی طرف سے محض وکیل ہوتے ہیں، اس لیے مدارس وغیرہ کے پاس جو مال ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۴ ـــــ مال حرام میں بنیادی طور پر زکوٰۃ واجب نہیں لیکن وہ مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ حرام و حلال مال کے درمیان شناخت ممکن نہ رہے تو دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ فقہاء کا معروف و مسلم اصول ہے، اسی قاعدہ کا اطلاق مال رشوت اور بینک کے سود وغیرہ پر بھی ہوگا۔ شامی میں ہے:

"ولازکوٰۃ فی المغصوب والمملوك شراء فاسد والمراد بالمغصوب مالم یخلطه بغیره لعدم الملك" (۲)

۵ ـــــ دین کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔
قرض کی رقوم اور سامان تجارت کا عوض جو باقی ہو دین قوی کہلاتا ہے، تجارتی سامان کے علاوہ کسی اور مال کی قیمت باقی ہو تو اس کو دین وسط کہتے ہیں، جو مال کسی مال کے بدلے میں باقی نہ ہو، بلکہ کسی اور شئی کے عوض باقی ہو، جیسے مہر، بدل خلع، دیت وغیرہ تو اس کو دین ضعیف ـــــ

---

(۱) ردالمحتار ۲/۷ (۲) ایضاً ۵/۲

کہتے ہیں ـــــــ فقہاء کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ دینِ قوی اور دینِ وسط میں تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن دینِ ضعیف میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب کہ وہ قبضہ میں آجائے اور پھر اس پر سال گذر جائے دینِ قوی اور دینِ وسط میں قبضہ سے پہلے بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ دینِ وسط میں تمام رقم اکٹھی وصول ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرے گا، اور دینِ قوی میں نصاب کا ایک خمس وصول ہونے پر۔[1]

یہ زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں بنیادی اصول ہیں، ان کو سامنے رکھ کر دیون کے سلسلہ میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

۶ ــــ پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کی حیثیت اجرت کی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ماضی قریب کے اکابر علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے دو متضاد رائیں منقول ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مفتی محمد جمیل صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ ہی کی ایماء پر اس مسئلہ میں مزید تحقیق فرمائی اور جس نتیجے پر پہونچے وہ انھیں حضرات کے الفاظ میں یوں ہے:

" الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ تو دینِ قوی میں داخل نہیں ہوسکتا، اور دینِ متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے، جب تک کہ حُر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دینِ ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے" (۲)

راقم سطور کو اس تحقیق سے اتفاق ہے اور یہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ میں وصول و قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاجتِ اصلیہ

حاجتِ اصلیہ ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جو انسان کی شخصی ضروریات کی ہوں، علامہ طحطاوی

---

(۱) عالمگیری ۱/۹ (۲) امداد الفتاویٰ ۲/۴۸

نے حاجت اصلیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

" کثیاب المحتاج إلیہا لدفع الحر والبرد وکالنفقة و دور السکنی وآلات الحرب والحرفة واساس المنزل و دواب الرکوب و کتب العلم لاھلہا۔" (۱)

ظاہر ہے جب "حاجت اصلیہ" کا تعلق انسانی ضروریات سے ہے تو مختلف افراد، مختلف احوال اور مختلف طبقوں اور پیشوں کے اعتبار سے حاجت اصلیہ کا تعین عمل میں آئے گا۔

دین سے محفوظ ہونا

دین، حنفیہ کے یہاں زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہے اور اس کا مقصد مدیون کو حرج و تنگی سے بچانا ہے، لیکن آج کل جو ترقیاتی طویل الأجل قرض دیے جاتے ہیں، ان سے مدیون زبردست معاشی فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے ہر سال ایک معمولی قسط ہی ادا کرنی پڑتی ہے اس طرح اگر پورا دین اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاتا ہے تو فقراء حق سے محروم ہوتے ہیں، حالاں کہ ان کی زکوٰۃ ادا کرنے میں مدیون کے لیے ایسا حرج نہیں ہے جس کو شریعت دفع کرنا چاہتی ہے اس لیے یہ درمیانی رائے بہت مناسب ہے کہ ہر سال اس کو جو قسط ادا کرنی ہے اتنا حصہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور باقی دین مستثنیٰ کیے بغیر اس کے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

حنفیہ کے یہاں اموال میں شرکت اور خلط کا کوئی اثر نہیں، یہ متفق علیہ قاعدہ ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں حیوانات میں شرکت زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہوتا ہے، لہذا کمپنی کے مجموعی حصص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ کمپنی کے حصہ داروں میں جو مالک نصاب ہوں وہ اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے زکوٰۃ ادا کریں گے۔

•

---

(۱) طحطاوی / ۳۸۹

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ

شریعت میں اموال زکوٰۃ منصوص ہیں اس میں قیاس واجتہاد کو دخل نہیں، اس لیے ہیرے اور جواہرات جس قدر بھی ہوں اور جس نیت سے رکھے جائیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

" الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیہا وان کانت حلیاً إلا ان تکون للتجارۃ " (۱۸۰/۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

مال تجارت میں کس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس میں امام ابوحنیفہ رح اور صاحبین رح کے درمیان اختلاف ہے، صاحبین رح کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائے گی کے دن کا امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک اس دن کا جس دن کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور نصاب پر سال مکمل ہوا، اسی پر فتویٰ ہے۔ عالمگیری میں ہے۔

" إن أدی القیمۃ یعتبر قیمتہا یوم الوجوب " (۱۸۰/۱)

لہٰذا جس تاریخ کو نصاب پر حولان حول ہوتا ہے تمام سامان تجارت میں بہ شمول پلاٹس اراضی اسی دن کی قیمت معتبر ہوگی نہ مستقبل میں متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیر اور بانڈس کی زکوٰۃ

تجارتی یونٹس کے شیرز بھی مال تجارت کے حکم میں ہیں، لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور زکوٰۃ میں اس کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ حولان حول کے وقت مارکیٹ میں اس کی جو قدر تھی وہی معتبر ہوگی، اور اس کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی ——— باؤنڈز کی حیثیت قرض کے سند کی ہے لہٰذا جو رقم اس کے عوض ادا کی گئی ہے اس کا دین ہونا ظاہر ہے اور فقہا کی اصطلاح میں یہ دین قوی کے زمرہ میں آتا ہے، اس لیے اس پر ضروری زکوٰۃ واجب ہوگی۔

زکوٰۃ

از:۔۔ مولانا اعجاز احمد اعظمی، مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپورہ
اعظم گڈھ

زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے، جو صاحب نصاب مسلمان پر عائد ہوتا ہے، اس کے احکام و مسائل ۔۔۔۔۔ جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں ۔۔۔۔۔ کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہے:

"تملیك جزء مال عینه الشارع من مسلم فقیر غیر هاشمی ولا مولاه لله تعالی" (۱)

کسی مسلمان فقیر کو جو نہ ہاشمی ہو، نہ ہاشمی کے موالی میں سے ہو، مال کے ایک حصہ کا جسے شریعت نے متعین کیا ہے اللہ کے واسطے مالک بنانا۔

اور اس کا سبب فرضیت یہ تحریر کیا ہے کہ

"ملك نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد و عن حاجته الاصلیة نام ولو تقدیراً" (۲)

ایسے نصاب کی ملکیت تامہ جس پر سال پورا ہو چکا ہو اور اس پر کوئی ایسا دین نہ ہو جس کا مطالبہ بندوں کی جانب سے ہو، نیز اس کی حاجت اصلیہ سے فارغ ہو اور وہ نامی ہو، اگرچہ وہ حکماً ہی ہو۔

---

(۱) درمختار مع ردالمحتار ۲/۲۵۶ مطبوعۃ کراچی (۲) حوالۂ سابق ۲/۲۵۹

سوال نامے کے دونوں محور کا جواب اسی سبب کی تفصیل میں مضمر ہے، اس میں چند باتیں قابل غور ہیں :

(۱) ملک تام (۲) نصاب حولی (۳) فراغت عن الدین (۴) فراغت عن الحاجۃ الاصلیۃ (۵) نماء۔

یہی پانچ نکتے ہیں، جن پر اس مجلس میں غور کرنا ہے۔

سوال:۔ ملکِ تام سے کیا مراد ہے؟

"ان المراد بالملك التام المملوكة يدًا و رقبةً" (۱)

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شیئ کا مالک ہو اور قبضہ بھی اسی کا ہو، اگر قبضہ نہ ہو تو ملکیت ناقص ہے، یا قبضہ ہو لیکن شیئ کا مالک نہ ہو تو یہ بھی ناقص ہے، لیکن بعض اوقات ملکیتِ ناقصہ، ملکِ تام کے حکم میں ہوتی ہے، اس کی تفصیل دین کے اقسام کے سلسلے میں آرہی ہے۔

سوالات کے جواب

(۱) مالِ تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو، اور مال ابھی وصول نہ ہوا ہو، بحر الرائق میں محیط کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی، لیکن ادائیگی کا وجوب قبضہ کے بعد ہوگا اور سالہائے ماضی کی بھی دینی ہوگی۔

"ذكر في المحيط في بيان اقسام الدين ان المبيع قبل القبض لايكون نصابا لان الملك فيه ناقص لافتقاد اليد والصحيح انه يكون نصابا لانه عوض عن مال كانت بيده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليه على العوض فتعبر يده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعا اھ . فعلى هذا قولهم لاتجب الزكوة معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زكوته فيما مضى كالدين القوى" (۲)

(۱) درمختار مع ردالمحتار ۲/۲۶۹ (۲) بحرالرائق ۲/۲۰۸، ۲۰۹

محیط میں مذکور ہے ـــــ اقسام دین کے بیان میں ـــــ کہ مبیع، قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ نصاب ہوجاتا ہے، اس لیے وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور اسے عوض پر قبضہ کرنا عین ممکن ہے۔ پس اس کا قبضہ نصاب پر معتبر مانا جائے گا، کیوں کہ شرعاً وہ قبضہ پر قدرت رکھتا ہے اس بنیاد پر فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کی ادائے گی واجب نہ ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد ماضی کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی جیسا کہ دین قوی[1] میں ہوتا ہے۔

اور قیمت جو پیشگی ادا کردی گئی، اس پر بائع کی ملک تام ہوگئی، اس لیے اس کی زکوٰۃ بائع کے ذمے ہوگی، آگے ایک مسئلہ اجارہ کا آرہا ہے اسی میں اس مسئلہ کی دلیل بھی موجود ہے۔ فانتظر۔

(۲) کرایہ کی مد میں دی گئی رقم جو پیشگی ادا کردی گئی ہو، اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، جس نے رقم وصول کی ہے، کیوں کہ وہ اس پر ملکیتِ تامہ رکھتا ہے۔

" وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفہا اہل البخاری ان الزکاۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الآجر لانہ ملکہ قبل الفسخ " (۲)

امام ابوبکر محمد بن الفضل بخاری نے ذکر کیا ہے کہ اجارہ طویلہ جس کا تعارف اہل بخاری میں ہے، اس میں پیشگی دی ہوئی اجرت کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، کیوں کہ جب تک اجارہ فسخ نہ ہو، اس رقم کا مالک وہی ہے۔

اور جو رقم ڈپوزٹ ہوتی ہے اور بعد میں واپس کردی جاتی ہے وہ بحکم رہن ہے[*] اور رہن کے

---

(۱) دین قوی کی تعریف آگے آرہی ہے۔ (۲) بدائع الصنائع ۶/۲

* ولو استاجر دارا او شیئا واعطی بالاجر رھنا جاز " (فتاوی ھندیہ ۴۳۵/۵)

اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا یا کوئی اور چیز اور اجرت کے عوض کوئی چیز بطور رہن کے دی تو جائز ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ڈپوزٹ رقم جو بعد میں واپسی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے وہ رہن اجرت ہی بنے گی۔ خود شئی مستاجر کے عوض تو رہن رکھنا درست نہیں ہے کیوں کہ وہ امانت ہے پس وہ اجرت ہی کے عوض تسلیم کیا جائے گا۔

متعلق تصریح ہے کہ اس میں زکوٰۃ سرے سے واجب ہی نہیں ہوتی، نہ راہن پر نہ مرتہن پر۔

" ولافی مرھون بعد قبضہ ۔ قال الشامی ۔ ای لاعلی المرتھن لعدم ملك الرقبة ولاعلی الراھن لعدم الید واذا استردہ الراھن لایزکی عن السنین الماضیة " (۱)

اور نہ مال مرہون میں قبضہ کے بعد اس پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ یعنی نہ مرتہن پر ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے اور نہ رہن پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اور جب راہن اس شئ مرہون کو واپس لے لیگا، جب بھی سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ نہیں ادا کرے گا۔

(۳) جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

"فلازکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك " (۲)

وقف کے جانوروں اور فی سبیل اللہ مہیا کیے ہوئے گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ ان پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

(۴) وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بہ طور حرام آتا ہے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اگر یہ حرام مال علیحدہ ہے، حلال مال کے ساتھ شامل نہیں ہوا ہے تو اس پر اس کی ملکیت نہیں، اگرچہ قبضہ ہے، اس لیے اگر مالک معلوم ہے تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک نامعلوم ہے تو پورے کو فقرا و مستحقین میں تقسیم کر دینا واجب ہے، پس اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اور اگر اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس خلط کی وجہ سے وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا، لیکن چوں کہ دوسرے کا مال اس کی ملکیت میں غلط طور سے شامل ہو گیا ہے، اس لیے اس مقدار کا وہ ضامن ہوگا، گویا وہ اتنے کا مدیون ہے، اگر بہ قدر دین اور بہ مقدار ضمان علیحدہ کرنے کے بعد، نصاب کے برابر مال موجود ہے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور بہ قدر نصاب نہیں بچتا تو چوں کہ یہ مدیون ہے اس لیے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

---

(۱) فتاوی شامی ۲/۲۶۳

(۲) حوالۂ سابق ۲/۲۵۹

" فی القنیة ، لوکان الخبیث نصابا لا یلزمه الزکوٰة لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه ومثله فی البزازیة .... وفی الفصل العاشر من التاتارخانیة عن فتاوی الحجة من ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰة علیه فیها وان بلغت نصابا لانه مدیون ومال المدیون لا ینعقد سببا لوجوب الزکوٰة عندنا " (۱)

قنیہ میں ہے کہ اگر ناجائز مال بہ قدر نصاب ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ وہ کل واجب التصدق ہے (جب کہ مالک معلوم نہ ہو) اس لیے اس کے کچھ حصے کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں، اور اسی طرح بزازیہ میں بھی ہے .... اور فتاوی تاتارخانیہ کی دسویں فصل میں فتاوی حجہ سے نقل کیا ہے کہ جو حرام مال کا مالک ہوا یا اس نے کوئی مال غصب کیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو خلط کی وجہ سے وہ مالک ہوگیا، لیکن اس کا ضمان دینا ہوگا اور اگر اس کے سوا اس کے پاس بہ قدر نصاب مال نہیں ہے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگرچہ وہ خود بہ قدر نصاب ہو، کیوں کہ وہ مدیون ہے اور مدیون کا مال ہمارے نزدیک وجوب زکوٰۃ کا سبب نہیں ہوتا۔

(۵) دین کی زکوٰۃ مدیون پر نہیں واجب ہوتی، ہاں اگر مدیون کے پاس دین سے فاضل نصاب موجود ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، دین کے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص ٹال مٹول کر رہا ہے تو ظلم ہے، اس کے خلاف دنیا میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے اور آخرت میں خدا کے حوالے کرنا چاہیے، لیکن اس کی وجہ سے زکوٰۃ کے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زکوٰۃ کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کے اس جرم کے بدلے عائد کی جائے، یہ تو ایک عبادت ہے جو خلوص دل اور انشراح صدر کے ساتھ ادا کی جانی چاہیے۔

دین کی اقسام :

وصولیابی کی امید اور نا امیدی کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں :-

---

(۱) شامی ۲/۲۹۱

دین قوی۔ دین متوسط۔ دین ضعیف۔

دین قوی: وہ دین جو قرض یا مال تجارت کے عوض میں لازم ہوا ہو۔

دین متوسط: وہ دین جو قرض اور مال تجارت کے علاوہ کسی اور مال کے عوض لازم ہوا ہو، جیسے استعمالی کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف: ایسا دین جو کسی مال کے عوض نہ لازم ہوا ہو، جیسے مہر، وصیت اور بدل خلع وغیرہ۔

"قسم ابوحنیفة الدین علی ثلثة اقسام قوی وھو بدل القرض ومال التجارة ومتوسط وھو بدل مالیس للتجارة کثمن ثیاب البذلة وعبد الخدمة ودارالسکنی وضعیف وھو بدل مالیس بمال کالمھر والوصیة وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدیة و بدل الکتابة والسعایة۔"(1)

امام ابوحنیفہ رحمہ نے دین کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے، اور متوسط اور وہ ایسے مال کا بدل ہے جو تجارت کے لیے نہ ہو، جیسے استعمال کے کپڑے، خدمت گزار غلاموں اور رہائشی مکانات کی قیمت۔ اور ضعیف اور وہ ایسی چیز کا بدل ہے جو مال نہ ہو، جیسے مہر، وصیت، بدل خلع، صلح عن دم العمد، دیت، بدل کتابت اور سعایت۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ جب اس پر سال تمام ہو گا تو زکوٰۃ واجب ہو گی، لیکن اس کی ادائے گی کا وجوب اس وقت مؤخر ہو گا، جب تک اس میں چالیس درہم کے بقدر دین وصول نہ ہو جائے، جب اتنی رقم مل جائے گی تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہو گی، اور اس کے بعد جتنی وصول ہوتی جائے گی، اسی کے حساب چالیسواں حصہ واجب ہو گا۔

اور دین متوسط میں اس وقت تک وجوب ادا نہ ہو گا جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ ہو جائے لیکن جب اتنا وصول ہو جائے گا تو سالہائے گزشتہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہو گی، اور دین ضعیف میں زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہ ہو گی، جب تک بقدر نصاب دین وصول ہو کر اس پر سال نہ گزر جائے۔

---

(1) بحرالرائق ۲/۲۰۶

"ففي القوي تجب الزكوٰة اذا حال الحول ويتراخى القضاء إلى أن يقبض اربعين ففيها درهم وكذا فيما زاد بحسابه وفي المتوسط لاتجب مالم يقبض نصابا و يعتبر لما مضى من الحول في صحيح الرواية وفي الضعيف لاتجب مالم يقبض نصابا ويحول الحول بعد القبض عليه"(۱)

پس دین قوی میں جب سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائے گی چالیس درہم وصول ہونے تک مؤخر رہے گی، جب اتنا وصول ہو جائے گا تو ایک درہم واجب ہوگا، اور اسی طرح زائد میں اس کے حساب سے اور دین متوسط میں اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک نصاب نہ وصول کرلے، اور اس میں سال گزشتہ کا بھی اعتبار ہے، یہی صحیح روایت ہے اور دین ضعیف میں جب تک نصاب کے بہ قدر وصول نہ کرلے، اور اس پر قبضہ کے بعد سال نہ گزر جائے، اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

(۶) سرکاری محکموں اور بعض پرائیوٹ کمپنیوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ وضع کرکے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار اس میں اضافہ کرتی ہے جس کو پراویڈنٹ فنڈ کہتے ہیں، اس رقم کے دو حصے ہیں ایک حصہ اصل تنخواہ والا، دوسرا جو اس پر اضافہ ہوا ہے۔

اضافہ کی زکوٰۃ کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس لیے کہ اس پر نہ اس ملازم کی ملکیت وارد ہے اور نہ وہ بہ حکم دین ہے۔ بہ حکم دین اگر کوئی چیز ہے تو وہ اصل تنخواہ والا حصہ ہے، اس لیے اس حصۂ اضافی کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر قبضہ ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے۔

البتہ اصل تنخواہ میں وضع شدہ رقم کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ دین ہے؟ اگر ہے تو دین کی تین قسموں میں سے کس میں داخل ہے۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اجرت کی حیثیت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۱) بحر الرائق ۲/۲۰۷

وفی الاجرة ثلث روایات عن ابی حنیفة، فی روایة جعلها کالمهر لانها لیست ببدل من المال لانها بدل عن المنفعة وفی روایة جعلها کبدل ثیاب البذلة لان المنافع مال من وجه لکنه لیس بمعجل لوجوب الزکوٰة فیه والاصح ان اجرة دار التجارة او عبد التجارة بمنزلة ثمن متاع التجارة کلما قبض منها اربعین تلزمه الزکوٰة اعتبار البدل المنفعة ببدل العین۔(۱)

اجرت کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ سے تین روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں اس کو مثل مہر کے قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ مال کا بدل نہیں ہے، کیوں کہ یہ منفعت کا بدل ہے اور ایک روایت میں اسے استعمالی کپڑوں کی قیمت کے مانند ٹھہرایا ہے، کیوں کہ منافع ایک طرح کے مال ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کے محل نہیں ہیں، اور اصح یہ ہے کہ گھر یا غلام جو برائے تجارت ہو اس کی اجرت اور کرایہ سامان تجارت کی قیمت کی طرح ہے، جب چالیس درہم وصول ہوں گے ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں بدل منفعت کو بدل عین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرایہ اور اجرت دین میں داخل ہیں، اور اصح روایت کے مطابق جو حکم اس شئی کا ہے جس کی اجرت حاصل ہوئی ہے وہی اجرت کی بھی ہے، اگر مال تجارت کی اجرت حاصل ہوئی تو اس میں اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے جس طرح مال تجارت میں واجب ہوتی۔ گویا یہ دین قوی ہے اور اگر استعمالی سامانوں کی اجرت حاصل ہوئی تو اس کا قیاس انھیں پر ہے۔

حوالۂ بالا میں جو دوسری روایت ہے، منحۃ الخالق حاشیہ بحر الرائق میں محیط کے حوالے سے اسے ظاہر روایت قرار دیا ہے۔ غرض پہلی روایت کی بنیاد پر اجرت دین ضعیف میں داخل ہے اور دوسری روایت کی روشنی میں وہ دین متوسط میں شامل ہے، اور صحیح روایت کے پیش نظر وہ اصل مال مستاجر کے تابع ہے، لیکن واضح ہو کہ یہ تینوں روایتیں ایسی چیزوں کے کرایہ اور اجرت کے احکام بتاتی ہیں، جو خود مال ہیں مثلاً مکان، غلام وغیرہ، لیکن یہاں جو اجرت اور تنخواہ زیر بحث ہے وہ کسی مال کی نہیں ہے بلکہ یہ بدل ہے

---

(۱) مبسوط ۱۹۵/۲-۱۹۶

خدمت حر کی، اور حر بہ تصریح فقہا، مال نہیں ہے، لہٰذا اس کی خدمت بھی مال نہیں ہو سکتی، پس یہ تنخواہ غیر مال کی بدل ہے اس لیے یہ دین ضعیف ہے، اور دین ضعیف کا حکم معلوم ہے کہ اس میں قبضہ کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ وا ب ہوتی ہے، پس پراویڈنٹ فنڈ میں خواہ اصل تنخواہ کی وضع شدہ رقم ہو یا اضافی رقم، زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ بہ قدر نصاب قبضہ میں آجائے اور اس پر سال گزر جائے یا اگر اس کے علاوہ نصاب موجود تھا تو یہ رقم اس میں شامل ہو کر اصل نصاب پر سال پورا ہونے کے بعد اسی کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ نکل جائے گی۔ واللہ اعلم۔

دوسری شرط "نماء"

نماء، کے لغوی معنی بڑھنے کے ہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

النماء فی اللغة بالمد الزیادة والقصر بالهمزة خطأ یقال نمی ینمی نماء وینمو نموًا وانماه اللّٰه تعالیٰ کذا فی المغرب۔ (۱)

نماء، بالمد لغت میں بڑھوتری کے معنی میں ہے اور بغیر مد کے ہمزہ کے ساتھ غلط ہے، کہا جاتا ہے، نمی ینمی نماؤا (ص) وینمو نموا (ن) اور انماہ اللہ تعالیٰ۔ کذا فی المغرب۔

اور شریعت کی اصطلاح میں بھی نماء کا وہی معنی ہے جو لغت میں ہے، البتہ یہاں اس کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں، اول یہ کہ حقیقۃً اضافہ ہو، جیسے جانوروں میں توالد و تناسل کے ذریعے بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، اسی طرح تجارت کے واسطے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اضافہ تقدیرًا اور حکمًا ہو جیسے سونا اور چاندی کہ جب یہ اپنی ملک اور قبضہ میں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ اس پر قدرت حاصل ہے، یہ مال نامی تقدیرًا ہے، یعنی ظاہرًا بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا مگر اسے نامی تسلیم کیا گیا ہے۔

وفی الشرع هو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنه من الزیادة بکون المال

---

(۱) شامی ۲/۲۶۳

فی یدہ او ید نائبہ۔ (۱)

شریعت میں نماء کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور تقدیری۔ حقیقی وہ نماء ہے جو توالد و تناسل اور تجارتوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ نماء پر قدرت ہو، اس طرح کہ مال خود مالک کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال نامی کا نصاب ہونا شرط ہے، اگر کسی کے پاس نماء کی دونوں قسموں کے اعتبار سے کوئی مال نامی نہیں ہے، اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس زمینیں بہت ہیں یا مکانات ہیں یا کارخانہ ہے، جس میں مشینیں قیمتی قیمتی ہیں، تو گو اس کے پاس مالیت بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز مال نامی نہیں ہے اس لیے ان کا حساب نصاب زکوٰۃ میں نہ ہوگا۔

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ کے دائرہ میں وہ چیزیں آتی ہیں جن کا تعلق انسان کے جان و مال کی حفاظت اور بچاؤ سے ہے، مثلاً نفقہ، رہائشی مکان، لڑائی کے اوزار، گرمی اور سردی کی ضرورت کے کپڑے، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواریاں اور ان کی حفاظت کے گھر، مثلاً اصطبل، گیراج وغیرہ اور اہل علم کے واسطے کتابیں۔

الحاجة الاصلية هي ما يدفع الهلاك من الانسان تحقيقا كالنفقة و دورالسكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديرا كالدين وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب و كتب العلم لأهلها۔ (۲)

حاجتِ اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دفع کرتی ہیں، حقیقۃً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلاتِ حرب اور گرمی و سردی کے لباس، یا تقدیراً جیسے آلاتِ حرفت، گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لیے کتابیں۔

حاجتِ اصلیہ میں مزید کچھ اور تفصیلات ہیں جنھیں فقہاء اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً

---

(۱) شامی ۲/۲۶۳ (۲) شامی ۲/۲۶۲

استعمالی کپڑے کتنی تعداد میں ہوں، رہائشی مکان کس مقدار کا ہو، سواری کے جانور کتنے ہوں، کتابوں کے کتنے نسخے ہوں، تو حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے اور کتنے اس سے زائد ہوں گے، لیکن زکوٰۃ کی بحث میں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہاں سرے سے حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی قید وجوب میں مؤثر نہیں ہے، کیوں کہ زکوٰۃ کے لیے نصاب نامی شرط ہے اور نصاب نامی بہرحال حاجتِ اصلیہ سے فاضل ہوگا، تو یہ قید درحقیقت کسی احتراز کے لیے نہیں ہے، محض بیان واقعہ یا اہتمام ذکر کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامی رح نے لکھا ہے کہ:

فان الحوائج الاصلية اعم من الدين والنامی اعم منها۔ (۱)

یعنی حوائج اصلیہ دین سے عام ہیں اور نامی ہونا حوائج اصلیہ سے عام ہے، تو جب ایک عام قید اور شرط کسی حکم میں لگا دی گئی تو اس کے ضمن میں خاص خود بخود آ گیا، اب اس کے ذکر کی ضرورت احتراز کے لیے نہیں ہوتی، ہاں کسی خصوصیت کے اہتمام کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے، پس ثابت ہو گیا کہ مال کا نامی ہونا بنیادی شرط ہے، حاجت اصلیہ سے فراغ کی شرط صرف اظہار واقعہ کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامی اس کی مثال میں ذکر کرتے ہیں:

لانه يخرج منها كتب العلم لغير اهلها وليس من الحوائج الاصلية۔ (۲)

دیکھیے غیر اہل علم کے پاس کتابیں حوائج اصلیہ میں سے نہیں ہیں، لیکن چوں کہ مال نامی نہیں ہے، اس لیے ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

دین سے محفوظ ہونے میں فقہاء نے طویل الاجل اور قصیر الاجل کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین مطلقاً خواہ وہ طویل الاجل ہو یا قصیر الاجل، نصاب میں سے پورا وضع کیا جائے گا، دیکھیے مہر مؤجل کتنی طویل المیعاد ہوتی ہے، مگر فقہاء نے اسے بھی موانع

---

(۱) شامی ۲/۲٦۲ (۲) بدائع الصنائع ۲/٦

زکوٰۃ ہیں سے شمار کیا ہے، لیکن بدائع الصنائع میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مہر موجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

قال بعض مشائخنا ان الموجل لایمنع لانہ غیر مطالب بہ عادۃ۔[1]

ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ مہر موجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

اس کی علت لانہ غیر مطالب بہ عادۃ پر نظر کی جائے تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سالاً واجب الادا قسط کے بقدر ہی ہر سال دین وضع کیا جائے، کیوں کہ عادۃً اس سے زائد کا مطالبہ اس سال نہیں ہوتا، نیز یہ کہ امام شافعیؒ کے نزدیک کوئی بھی دین مانع زکوٰۃ نہیں ہوتا۔ اس خیال سے اگر احتیاطاً صرف قسط واجب الادا، کے بقدر وضع کر کے باقی کی زکوٰۃ ادا کی جائے تو مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

کسی تجارت میں اگر متعدد شرکاء ہوں تو مجموعی سرمایہ پر مجموعی طور سے زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا بلکہ انفراداً ہر ایک پر علیحدہ زکوۃ کا وجوب ہوگا، جب کہ اس کا حصہ بقدر نصاب ہو یا اگر کمپنی میں تو بقدر نصاب نہ ہو، لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ مال زکوٰۃ موجود ہو، تو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

فاذا کانت مشترکۃ بین اثنین فقد اختلف فیہ قال اصحابنا انہ یعتبر فی حال الشرکۃ ما یعتبر حال الانفراد وھو کمال النصاب فی حق کل واحد منھما فان کان نصیب کل واحد منھما یبلغ نصابا تجب الزکوٰۃ و إلا فلا۔[2]

بہر حال جب تجارت مشترک ہو تو اس میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شرکت کی حالت میں بھی وہی چیز معتبر ہے جو انفراد کی حالت میں ہے اور وہ نصاب تام ہے، ہر ایک کے حق میں، پس اگر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بقدر ہے تب تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

---

(۱) شامی ۲/۲۶۲ (۲) شامی ۲/۲۶۲

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، اگر بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفاً اتفاقاً إلا ان تکون للتجارۃ۔ (۱)

موتیوں اور جواہرات میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے گو وہ ہزار کے برابر ہوں مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں (تب زکوٰۃ واجب ہوگی)۔

تاہم جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نیت کس زمرے میں آئے گی۔ احقر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اسے فروخت کر کے پھر اسے روپیہ بنالیں گے اور نفع بھی ہاتھ آئے گا۔ آج کا ایک لاکھ کا ہیرا عین ممکن ہے کہ دس سال کے بعد ڈیڑھ دو لاکھ کا ہو جائے، اس لیے ایسے ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

البتہ جو خواتین محض تزئین و آرائش کے لیے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائے گی میں اصل یہ ہے کہ وہ نصاب کے جزء سے ہو یعنی جس مال کا نصاب ہو، زکوٰۃ اسی میں ادا کی جائے، البتہ اونٹوں میں شریعت نے ایک خاص حد تک بکریاں متعین کی ہیں، پھر اس کے بعد اونٹ کا وجوب ہوتا ہے، اس کے علاوہ تمام اموال میں قاعدہ یہی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے اسی مال میں سے بہ قدر زکوٰۃ کے علیحدہ کیا جائے۔ صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) درمختار مع الشامی ۲/۲۷۳

واما صفة الواجب فی اموال التجارة فالواجب فیها ربع عشر اعیین وهو النصاب فی قول اصحابنا ۔(۱)

بہرحال اموال تجارت میں واجب کی صفت یہ ہے کہ ان میں عین مال یعنی نصاب کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔

لیکن علماء احناف کے نزدیک بجائے عین مال کے اس کی قیمت کو زکوٰۃ میں دینا درست ہے، امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے قول میں تو عین یا قیمت ہر دو میں سے ایک واجب ہے اور صاحبین کے بقول اصل واجب تو عین مال سے ہے، مگر اس کے عوض میں قیمت بھی دی جا سکتی ہے، اس قاعدہ کے پیش نظر مسئلہ کا جواب یہ ہوگا کہ جب سال پورا ہوا تو اس وقت مال کا جو نرخ ہو اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

ثم اختلف اصحابنا فیما بینهم فـ ـند ابی حنیفة الواجب فی الدراهم والدنانیر واموال التجارة جزء من النصاب من حیث المعنی لا من حیث الصورة وعند ابی یوسف ومحمد الواجب هو الجزء منه صورة ومعنی لکن یجوز أقامة غیره مقامه من حیث المعنی ویبطل اعتبار الصورة باذن صاحب الحق وهو الله تعالی...... ویبنی علی الأصل مسائل الجامع اذا کان لرجل مأتا خفیز حنـ ـة للتجارة تساوی مأتی درهم ولا مال له غیر ذلك وحال علیها الحول فان ادی من عینها یؤدی خمسة اقفزة بلاخلاف لانها هی ربع عشر النصاب وهو الواجب علی ما مر ولو أراد أن یودی القیمة جاز عندنا خلافا للشافعی لکن عند ابی حنیفة فی الزیادة والنقصان یؤدی قیمتها یوم الحول وهی خمسة دراهم وعندهما فی الفصلین جمیعا یودی قیمتها یوم الاداء ۔(۲)

وتعتبر القیمة عند حولان الحول بعد ان تکون قیمتها فی ابتداء الحول مائتی درهم من الدراهم الغالبة علیها الفضة کذا فی المضمرات ۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۲۱ (۲) ایضا ۲/۲۲ (۳) فتاوی هندیه ۱/۱۷۹

پھر ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک دراہم ودنانیر اور اموال تجارت میں نصاب کا جز معنوی حیثیت سے واجب ہے، صورۃً نہیں، اور صاحبینؒ کے نزدیک واجب اس کا جز، صورت اور معنی کے لحاظ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ کو معنوی حیثیت سے اس کی جگہ رکھ سکتے ہیں اور صورت کا اعتبار صاحب حق یعنی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ختم ہو جائے گا۔ اسی قاعدہ پر جامع صغیر کا یہ مسئلہ مبنی ہے کہ کسی شخص کے پاس دو سو گز قفیز گیہوں تجارت کے لیے ہے اور اس کی قیمت دو سو درہم ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے اور اس پر سال گزر گیا، تو اگر گیہوں ادا کرنا چاہے تو بغیر اختلاف کے پانچ قفیز ادا کرے گا، اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے خلافاً للشافعی، لیکن امام صاحب کے نزدیک کمی اور زیادتی ہر صورت میں سال پورا ہونے کے دن کی قیمت ادا کرے گا اور وہ پانچ درہم ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ادا کے دن کی قیمت دے گا۔

تھوک اور پھٹکر تجارت میں زکوٰۃ کے لیے اس کے طریقۂ تجارت کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر تھوک کا تاجر ہے تو مال کی قیمت تھوک کے حساب سے لگائی جائے گی، ورنہ پھٹکر۔

زمین کی تجارت کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشری یا خراجی زمین بغرض تجارت خریدی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس کا فریضہ عشر یا خراج ہے، لیکن امام محمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اس میں کھیتی کرے گا تو عشر یا خراج بھی واجب ہوگا۔

ولو اشتری ارض عشر او خراج للتجارۃ لاتجب فیھا الزکوٰۃ .... و عند محمد اذا اشتری للتجارۃ ارض عشر تجب الزکوٰۃ مع العشر ان زرع۔[1]

اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور امام محمد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ اگر عشری زمین بغرض تجارت خریدی تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کھیتی کرے گا تو عشر بھی واجب ہوگا۔

اور اگر غیر عشری وخراجی زمین بغرض تجارت لی گئی ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس وقت

---

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ۲۵۳/۱

کے نرخ کے حساب سے ہوگی۔

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیئرز پر مال تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہوگی، ان کی مالیت کا تعین نہ ان کی بنیادی قیمت سے ہوگا اور نہ مارکیٹ کے نرخ سے بلکہ وہ شیئر جس مالیت پر مشتمل ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً شیئر کا مالک ابتداء سال میں بقدر نصاب ملکیت رکھتا تھا اور پھر درمیان میں بذریعہ تجارت اس میں اضافہ ہوتا رہا، تو سال کے آخر میں جس قدر مالیت فراہم ہوگئی ہے اسی سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مالیت کا پتہ کیسے چلے گا تو موجودہ کاروباری نظام میں اس کے معلوم کرنے کا طریقہ واقعی دشوار ہے، ایسی صورت میں آسان راہ یہ ہے کہ مارکیٹ کا نرخ دیکھ لیا جائے۔ یقینی طور پر تو نہیں لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ اس کی مالیت سے کچھ زائد یا کم از کم برابر ہوتا ہوگا تو احتیاطاً اسی نرخ سے زکوٰۃ ادا کی جائے، تاکہ زکوٰۃ میں کمی کا احتمال نہ رہے کہ خدا کے یہاں مواخذہ ہو، اگر کچھ زیادہ دے دی جائے گی تو مستحسن ہے۔

محور ثانی، نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی دونوں کا نصاب اصل ہے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے تابع نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ مال تجارت کی قیمت کا تعین دونوں سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر ایک سے نصاب پورا ہوتا ہو اور دوسرے سے نہیں تو جس سے نصاب پورا ہوتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا۔ وجوب زکوٰۃ کے اندر بھی اور اسی پر قیاس کرکے حرمت اخذ زکوٰۃ کے اندر بھی، اس لحاظ سے موجودہ دور میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

ثم فی تقویم عروض التجارة التخییر یقوم بایهما شاء من الدراهم والدنانیر الا اذا کانت لا تبلغ باحدهما نصابا فحینئذ تعین التقویم بما یبلغ نصابا۔ هکذا فی البحر الرائق۔ (۱)

---

(۱) فتاوی هندیه ۱/۱۷۹

پھر سامان تجارت کی تقویم میں اختیار ہے، درہم و دینار میں سے جس سے چاہے قیمت لگائے، البتہ اگر کسی ایک سے نصاب نہ پورا ہوتا ہو، تو وہ متعین ہے جس سے نصاب پورا ہو۔

محور ثالث، مصارف زکوٰۃ

(۱) سوال میں مذکور پہلی صورت زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے یہ کر درست ہے بلکہ مستحسن ہے جسے اہل مدارس کو اختیار کرنا چاہیے، مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان تو ظاہر ہے کہ وکیل ہے کہ انھوں نے زکوٰۃ کی رقم اسی لیے حوالے کی ہے مدارس میں جو مستحق طلبہ ہیں ان پر خرچ کی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کا نائب بھی ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:

مہتمم مدرسہ کا، قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر جملہ عالم کا ہوتا ہے، بس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبض ہے، اس کے قبض سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا، اگرچہ وہ مجہول الکمیت والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے۔[1]

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ طلبہ کے نائب اور قیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے وہ زکوٰۃ کی رقم قبضہ کرنے کے بعد آزاد ہے کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ وہ جن کا نائب ہے اور جن کی نیابت میں اس نے زکوٰۃ وصول کی ہے، انھیں پر خرچ کرنا متعین ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو حسب تصریح فقہا، زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، انھیں دوبارہ زکوٰۃ دینی ہوگی اور اس کا وبال مہتمم مدرسہ پر پڑے گا، اگر کوئی مہتمم ایسا کرتا ہے تو اسے زکوٰۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے، یہ تو مدرسہ کے مہتمم کا مسئلہ ہے، جس کو زکوٰۃ دہندگان پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے، خود صاحب امر اور سلطان زکوٰۃ وصول کرتا ہے، اور صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، چنانچہ مبسوط میں ہے:

فاما ما یاخذ سلاطین زماننا ھؤلاء الظلمۃ من الصدقات والعشور والخراج والجزیۃ فلم یتعرض لہ محمد رحمہ اللہ فی الکتاب وکثیر من أئمۃ بلخ یفتون باداء ثانیا فیما بینہ وبین اللہ کما فی حق البغی

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص۱۳۲

لعلمنا انهم لایصرفون الماخوذ مصارف الصدقة ۔(۱)

رہے وہ صدقات اور عشور وخراج اور جزیہ جسے ہمارے زمانے کے ظالم حکام وصول کرتے ہیں تو اس سے امام محمد علیہ الرحمہ نے کوئی تعرض نہیں کیا اور بہت سے ائمہ بلخ فتویٰ دیتے ہیں کہ دوبارہ ادا کیا جائے فیما بینہ وبین اللہ جب کہ باغیوں کے متعلق فتویٰ ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحیح مصارف صدقہ پر خرچ نہیں کرتے ۔

یہاں ایک اور صورت بتائی گئی ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا خود انھیں ظالم سلاطین کو دینے کی نیت کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ کیوں کہ انھوں نے ظلم کرکے اور ناجائز اموال جمع کرکے اپنے اوپر دوسروں کے اتنے حقوق جمع کر لیے ہیں کہ سارا مال دے کر بھی ان حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زبردست مدیون ہیں اور اس کی وجہ سے افلاس کے انتہائی مرتبہ پر ہیں، پس انھیں کو مال زکوٰۃ کا مالک نادیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

والاصح انہ یسقط ذلک عن جمیع ارباب الاموال اذا نوا بالدفع التصدق علیہم لان ما فی ایدیہم من اموال المسلمین وما علیہم من التبعات فوق مالہم، فلو ردوا ما علیہم لم یبق فی ایدیہم شئ فہم بمنزلۃ الفقراء ۔(۲)

اور اصح یہ ہے کہ سب مال والوں سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، جب کہ وہ دیتے وقت خود انھیں کو زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کرلیں، کیوں کہ اتنے اموال مسلمانوں کے غلط طور پر ان کے پاس ہیں اور اتنے تاوان ان پر مسلط ہیں جو ان کے مال سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب لوٹا دیں تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ بچے گا وہ بمنزلہ فقراء کے ہیں ۔

اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن بحرالرائق میں اس سلسلے میں تھوڑی تفصیل درج ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

وظاھر ما صححہ السرخسی انہ لا فرق بین الاموال الظاھرۃ والباطنۃ

---

(۱) مبسوط ۲/۱۸۰ (۲) حوالہ سابق ۔

وصحح الولوالجی عدم الجواز فی الاموال الباطنہ قال وبہ یفتی لانہ لیس للسلطان ولایۃ الزکوٰۃ فی الاموال الباطنۃ فلم یصح الاخذ۔ (۱)

امام سرخسی نے جس کی تصحیح کی ہے ظاہراً اس سے معلوم ہوتا ہے اموال ظاہرہ وباطنہ میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر ولوالجی نے اموال باطنہ میں عدم جواز کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی پر فتوی ہے کیوں کہ سلطان کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں ہے پس اس کا لینا صحیح نہیں ہے۔

یہی بات علامہ ابن ہمام نے بھی حاکم شہید کے حوالے سے نقل کی ہے[۲]، انھوں نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا تعلق ہمارے موضوع زیر بحث سے نہیں ہے، لیکن اس سے اشتباہ ہوسکتا تھا، اس لیے وضاحت کردی گئی۔

غرض جب صاحب امر غلط مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، تو مدرسہ کا مہتمم جو صاحب امر اور صاحب ولایت بھی نہیں، وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے کیسے خرچ کرسکتا ہے؟ اس مسئلے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

(۲) زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مدارس میں جو سفراء، محصلین مقرر کیے جاتے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ پر عامل نہیں ہیں۔ قرآن نے جن لوگوں کو العاملین علیہا کہا ہے وہ دوسرے لوگ ہیں، چنانچہ فقہاء ان کی تعریف کرتے ہیں:

فہم الذین نصبہم الامام لجبایۃ الصدقات۔ (۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو امام صدقات کی وصولی کے لیے مقرر کیا ہے۔

امام کو جبایت صدقات کا حق اس کی ولایت عامہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور عاملین اس کے کارکن ہوتے ہیں، مدارس کے مہتممین کو اہل اسلام پر کون سی ولایت عامہ حاصل ہے، صرف کام کی ظاہری مشابہت دیکھ کر حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مہتمم مدرسہ کا صرف منتظم ہے، زیادہ سے زیادہ جن لوگوں سے اسے چندہ دستیاب ہوتا ہے ان کا وکیل ہے، اس کے کارکنوں پر شریعت کی مخصوص اصطلاح

---

(۱) بحر الرائق ۲/۲۲۳ (۲) فتح القدیر ۲/۱۵۲ (۳) بدائع الصنائع ۲/۴۴

کو منطبق کرنا مناسب نہیں ہے۔

پھر ان سفراء کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن دینے کا مسئلہ اور نازک ہے، اول تو یہ عاملین علی الزکوٰۃ نہیں ہیں کہ انھیں زکوٰۃ لینے کا اس بنیاد پر استحقاق ہو، دوسرے کمیشن کے طور پر زکوٰۃ دینا خود محل نظر ہے بلکہ فقہاء کی تصریحات اور تعامل کے خلاف ہے۔

قال العینی اتفق العلماء علی ان العامل فی الصدقات ھم السعاۃ المتولون قبض الصدقات وانھم لا یستحقون علی قبضھا اجزاء معلوما سبعا او ثمنا وانما لہ اجر عملہ علی حسب اجتہاد الامام۔ (اوجز المسالک ۶/۹۱۔۹۰)

امام عینی نے فرمایا کہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عامل فی الصدقات وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی کرنے والے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ وصول کرنے کے عوض میں کسی متعین جز یعنی آٹھویں یا ساتویں حصے کے مستحق نہ ہوں گے، ان کے لیے عمل کا معاوضہ امام کے اجتہاد کے مطابق ہوگا۔

عاملین کو جو وظیفہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاتا ہے وہ بقدر کفایت ہوتا ہے، یہی تمام فقہاء لکھتے ہیں، اور اسی پر تعامل رہا ہے اس کی شرح یہ ہے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ سے اسے اتنی رقم دے دی جائے کہ اس کے کام کے زمانے کے اخراجات اس کے اور اس کے گھر والوں کے بسہولت پورے ہو جائیں، اس میں اجرت کی مشابہت تو ضرور ہے مگر اجرت نہیں ہے، اسی لیے اس کو اجرت کے بجائے "عمالہ" کا نام دیا جاتا ہے۔(۲) اس کے برخلاف کمیشن اول سے آخر تک اجرت کا معاملہ ہے، اسی واسطے فقہاء نے اس

---

(۲) قال القاری فی شرح النقایہ: لیس ما یأخذہ اجرۃ لانھا لا تکون الا علی عمل معلوم ومدۃ معینۃ ولا صدقۃ لانہ یاخذ وان کان غنیا ویحل بہ العمالۃ بالاجماع ولکن فیہ شبھۃ الصدقۃ فلم یجزہ أخذھا العامل الھاشمی صیانۃ لقرابتہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اوساخ الناس۔ اوجز المسالک ۶/۲۱۔

ملا علی قاری نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ عامل جو کچھ لیتا ہے وہ خالص اجرت نہیں ہے، کیونکہ اجرت معلوم کام اور متعین اجرت پر ہوتی ہے، اور نہ خالص صدقہ ہے اس لیے کہ غنی ہونے کے باوجود اسے عامل لیتا ہے اور عمالہ اس کے لیے جائز ہے، لیکن اس میں صدقہ کا شبہ ہے اس لیے عامل ہاشمی اسے نہیں لے سکتا، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو اوساخ الناس سے محفوظ رکھنا مطلوب ہے۔

طرح کے کمیشن کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اجرت بالکل مجہول ہوتی ہے اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اجرت کی جہالت معاملہ کو فاسد کر دیتی ہے، اگر اس اجرت کے فساد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی بطور کمیشن کے زکوٰۃ کی رقم دینا کسی طرح جائز نہیں، کیوں کہ زکوٰۃ کو کسی مال یا خدمت کے عوض دینا درست نہیں ہے۔

البتہ اگر کمیشن زکوٰۃ یا اموال واجبۃ التملیک کے علاوہ کسی مال سے طے کیا جائے تو اس میں صرف کی جہالت کا خدشہ باقی رہے گا۔ اگر یہ دور ہو جائے تو معاملہ صحیح ہوگا۔

زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے، زکوٰۃ صدقہ ہے جو کسی چیز کا عوض نہیں ہوتا، اور تنخواہ اجرت ہے، اجرتوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا خلاف موضوع ہے۔

خلاصۂ جوابات

پہلی شرط ملک تام

۱ ــــ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی نہیں ہوئی ہے، قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بائع کے اوپر، اور مال جو وصول نہیں ہوا ہے اس کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، مشتری کے اوپر، لیکن چالیس درہم کے بقدر وصول ہونے کے بعد ادا کرنا واجب ہوگا۔

۲ ــــ کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی۔

ب: ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے وہ رہن کے حکم میں ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر۔

۳ ــــ جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۴ ــــ حرام مال اگر غیر مخلوط اور ممتاز ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور اگر مخلوط و غیر متمیز ہو گیا ہے تو اس کی مقدار جدا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۵ ــــ دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، مگر وجوب ادا چالیس درہم کے بقدر وصولیابی کے بعد ہے، دین متوسط کی زکوٰۃ بھی دائن پر واجب ہے، مگر بقدر نصاب وصول ہونے کے بعد، اور

دین ضعیف کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد جب کہ بقدر نصاب ہو، سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

(۱) دین کے مانع زکوٰۃ ہونے میں طویل الاجل اور قصیر الاجل کی تفصیل نہیں ہے۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

- ایک تجارت میں کئی افراد شریک ہوں تو انفراداً زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، اجتماعاً نہیں۔
- ہیرے جواہرات بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، سرمایہ محفوظ رکھنے کے لیے اس کو ہیرے جواہرات کی شکل میں رکھ لینے سے اس میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ محض تزئین و آرائش کے لیے ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
- اموال تجارت میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نرخ کا تعین وجوب زکوٰۃ کے دن کے لحاظ سے ہوگا۔

عشری اور خراجی زمین جو بغرض تجارت لی گئی ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی زمین یا گھر برائے تجارت لیا گیا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

- کمپنیوں کی شیئرز تجارتی مال ہیں اس کے لیے ان کی زکوٰۃ واجب ہے اور قیمت کا تعین ان کی مالیت سے کیا جائے گا۔

محور ثانی: نصاب زکوٰۃ

- چاندی اور سونا دونوں نصاب میں اصل ہیں، تجارتی اموال میں جس کے حساب سے نصاب پورا ہوتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔

محور ثالث، مصارف زکوٰۃ

۱ــــــ طالب علموں کے سلسلے میں ادائیگی زکوٰۃ کی جو صورت سوالنامہ میں درج ہے وہ مستحسن ہے۔

۲ــــــ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے اور طلبہ کا نائب اور قیم۔

۳ــــــ مدرسہ کے سفرا، عاملین شرعی نہیں ہیں، اس لیے مدز کوٰۃ سے نہ ان کو تنخواہ دی جاسکتی ہے اور نہ کمیشن، ہاں اگر فقر کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہوں تو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی ہے۔

۴ــــــ فی سبیل اللہ کے مصداق اصالۃً مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ اگر ان کے ذیل میں منقطع الحاج کو داخل کیا جائے تو گنجائش ہے۔

۵ــــــ فی سبیل اللہ کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں فقر بنیادی شرط ہے۔

۶ــــــ مصارف زکوٰۃ آٹھ اصناف میں منحصر ہیں، ان پر قیاس کر کے دوسروں کو مصارف کے دائرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔

۷ــــــ فی سبیل اللہ یا کسی بھی مصرف زکوٰۃ کے دائرے میں ایسی کوئی صورت نہیں آسکتی جس میں زکوٰۃ کی تملیک نہ ہوتی ہو۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

اسلام میں زکوٰۃ کا مصرف

از:۔۔۔ مولانا شبیر احمد قاسمی، دارالافتا، مدرسہ شاہی مرادآباد

ملک تام کی تعریف

جس شئی میں مالک کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہوجائے اس پر ملک تام کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اگر صرف ملکیت حاصل ہوجائے لیکن قبضہ حاصل نہ ہو جیسا کہ قبضہ سے قبل طے شدہ مہر کی عورت مالک ہوجاتی ہے لیکن مہر پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت تامہ عورت کو حاصل نہیں ہوتی ہے اسی طرح اگر مال پر قبضہ تو ہوجائے لیکن ملکیت درحقیقت اپنی نہ ہو بلکہ کسی اور کی ہو تو ایسی صورت میں بھی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے جیسا کہ قرض دار شخص جو مال کما کر قبضہ کرتا ہے یا ہبہ وغیرہ کے توسط سے اس کے قبضہ میں آتا ہے تو ایسی صورت میں قرض دار کے قبضہ میں تو مال آگیا ہے لیکن مال کے ساتھ قرض خواہ کا بھی حق لاحق ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قرض ادا کرنا اس پر واجب ہوجاتا ہے لہذا اس مال کا مالک درحقیقت قرض خواہ ہی ہوا کرتا ہے اس لیے مقروض کے حق میں اس مال میں ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے مقروض پر اس مال کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوتی ہے۔

"ومنها الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكاة" (۱)

(۱) عالمگیری، کوئٹہ ۱/۱۷۲، ومثلہ فی الجوهرة ۱/۱۲۹

"ملکِ تام وہ ہے کہ جس میں قبضہ و ملکیت دونوں جمع ہوجائے اور بہر حال جب صرف ملکیت حاصل ہو اور قبضہ نہ ہو جیسا کہ قبل القبض عورت کا مہر یا قبضہ حاصل ہو لیکن ملکیت نہ ہو جیسا کہ مکاتب اور مدیون کی ملکیت تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

قیمت ادا کر کے قبضہ نہیں کیا اس کی زکوٰۃ

جس مال تجارت کی مشتری نے قیمت ادا کر دی ہے لیکن ابھی قبضہ نہیں کیا ہے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہے۔ (۱)

" ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ "۔(۲)

یعنی جو مال تجارت کی غرض سے خریدا ہے اس پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

" المبیع قبل القبض لا تجب فیہ الزکوٰۃ "۔ (۳)

یعنی قبضہ سے قبل مبیع میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اور قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں؟ تو اس میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ قاضی خاں کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

"رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسیامۃ ولم یقبضہا حتی حال الحول ثم قبضہا لا زکوٰۃ علی المشتری فیما مضی لانہا کانت مضمونۃ علی البائع بالثمن "۔ (۴)

کسی شخص کے پاس چر کر گزارا کرنے والے جانور ہیں ان کو دوسرے شخص نے نسل بڑھانے اور چرا کر پالنے کی نیت سے خرید کر قبضہ نہیں کیا ہے حتی کہ سال گزر گیا تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ بائع کی ضمانت میں ہے۔

لیکن راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ مال تجارت میں قبضہ کے بعد مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا

---

(۱) عزیز الفتاوی ۱/۳۴۶ (۲) الدر المختار کراچی ۲/۲۶۳ (۳) حاشیہ چلپی علی ہامش التبیین ۱/۲۵۶ (۴) شامی کراچی ۲/۲۶۳ وھکذا قاضی خان علی ہامش الہندیۃ ۱/۲۶۶

واجب اور ضروری ہے اس لیے کہ قبضہ سے قبل جو ملکیت ناقص تھی اس پر قبضہ کے بعد استصحاب حال کے قاعدے سے ملکیت تامہ کا حکم لاگو ہوجاتا ہے۔

" واما بعده (ای بعد القبض) فیزکیه عما مضی" (۱)

یعنی مال تجارت میں قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

" لاتجب الزکوٰۃ معنا ء قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زکوٰته فیما مضی الدین القوی الخ" (۲)

یعنی قبضہ سے قبل مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہے جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

اور مشتری نے مبیع کی جو قیمت بائع کو ادا کردیا ہے اس پر بائع کی ملکیت اور قبضہ دونوں جمع ہوکر ملکیت تامہ کے دائرہ میں داخل ہوچکی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع پر لازم ہوگا، مشتری پر نہیں ہوگا۔

" رجل اشتراها عبدا للتجارة یساوی مأتی درهم و نقد الثمن ولم یقبض العبد حتی حال الحول فمات العبد عند البائع کان علی بائع العبد زکوٰة المأتین فلانه ملك الثمن (والی قوله) لازکوٰة علی المشتری لان الثمن زال عن ملکه الی البائع" (۳)

یعنی کسی شخص نے بغرض تجارت ایسا غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم ہے اور ثمن ادا کردیا لیکن قبضہ نہیں کیا حتی کہ سال گزر گیا اور غلام بائع کے یہاں ہلاک ہوجائے تو دو سو درہم کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے اس لیے کہ وہ اس ثمن کا مالک ہوچکا ہے اور مشتری پر زکوٰۃ نہیں ہے اس لیے کہ اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملکیت میں داخل ہوکر سال گزر چکا ہے۔

کرایہ کی پیشگی رقم اور پگڑی کی زکوٰۃ

کرایہ دار پیشگی رقم جو یک مشت مالک مکان اور مالک دکان کو ادا کرتا ہے، مالک مکان اس کا مالک

---

(۱) شامی کراچی ۲/۲۶۳ (۲) البحرالرائق ۲/۲۰۹ (۳) البحرالرائق ۲/۲۰۴،۲۰۳، قاضی خاں ۱/۲۵۹

ہوجاتا ہے اس کی زکوٰۃ بھی مالک مکان ہی پر لازم ہوا کرتی ہے کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے اس لیے کہ اس رقم پر کرایہ دار کی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

"اذا عجل الاجرة لایملك الاسترداد" (۱)

یعنی اگر کرایہ دار پیشگی اجرت اور کرایہ ادا کر دیتا ہے تو مالک مکان اس کا مالک ہوجاتا ہے، لہٰذا واپسی کا حق نہیں ہوگا۔

ڈپوزٹ اور بیع الوفا، کی رقم کی زکوٰۃ

اگر اس طرح مکان یا دکان یا زمین وغیرہ خرید و فروخت کی جائے کہ مشتری جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بائع کے پاس مثل امانت کے ہے اور جب بائع اتنی رقم مشتری کو ادا کر دے گا تو مبیع واپس مل جائے یا عقد کے لیے مدت متعین کی جائے اور مدت پوری ہونے یا عقد فسخ ہونے پر مشتری اور مستاجر کو اپنی دی ہوئی پوری رقم واپس مل جائے تو ایسے معاملہ کو بیع الوفا، الامانت اور الرہن وغیرہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں تو ایسی صورت میں ادا شدہ رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ تو اس میں حضرات فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوبکر محمد بن فضلؒ فرماتے ہیں کہ اگر اجرت رقم کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ صرف بائع پر واجب ہوتی ہے۔

"حکی عن الشیخ الامام ابی بکر محمد بن فضلؒ قال ان کانت الاجرة من الدراهم او من الدنانیر کان زکوتها علی الآجر لانه ملکها بالقبض وعند انفساخ الاجارة لایلزمه رد عین مقبوض وانما یلزمه رد غیرها فکان بمنزلة دین بحقه بعد الحول الخ" (۲)

شیخ ابوبکر محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ اگر اجرت درہم و دینار کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے اس لیے کہ قبضہ کی وجہ۔ س کو ملک تام حاصل ہوچکا ہے اور فسخ اجارہ کے وقت عین مقبوض کی واپسی لازم نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ادا کرنا لازم ہے تو یہ بمنزلہ اس دین کے ہوگا جو بعد حولان حول اس پر لازم ہوا ہے۔

---

(۱) شامی، کراچی ۲/۱۰ (۲) قاضی خان ۱/۲۵۳

اور امام زاہد علی بن محمد بزدوی اور مجد الائمہ سرخنگیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری دونوں پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بائع کے اوپر اس لیے لازم ہے کہ اس کو ملک تام حاصل ہے اور مشتری پر اس لیے لازم ہے کہ وہ بمنزلۂ ثمن رہن ہے لیکن علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر واجب ہوگی، اور اسی کو انھوں نے ینبغی کے لفظ سے راجح قرار دیا ہے۔

" وقال الشیخ الامام الزاهد علی بن محمد البزدوی ومجد الائمة السرختکیؒ ان زکوٰتها تجب علی المستاجر ایضا لان الناس یعدون مال الاجارة دیناً علی الاجر وفی بیع الوفاء المعهود بسمرقند تجب زکوٰة الثمرة علی البائع وعلی قول الشیخ الامام الزاهد علی بن محمد البزدوی ومجد الائمة السرختکی تجب علی المشتری ایضا الخ " (۱)

حضرت امام الزاہد علی ابن محمد البزدوی اور مجد الائمہ سرخنگی فرماتے ہیں کہ اس کی زکوٰۃ مستاجر پر بھی لازم ہے اس لیے کہ لوگ مال اجارہ کو موجر پر قرض اور دین شمار کرتے ہیں اور وہ بیع وفا جو سمرقند میں معروف و مشہور ہے اس میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے اور امام بزدوی اور سرخنگیؒ کے نزدیک مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب ہے۔

اور علامہ شامی رح مشتری پر وجوب ثابت کرنے کے لیے یوں عبارت نقل فرماتے ہیں:

" ینبغی لزومها علی المشتری فقط علی القول الذی علیه العمل الان من ان بیع الوفاء منزل منزلة الرهن وعلیه فیکون ثمن دیناً علی البائع " (۲)

فرماتے ہیں کہ مناسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر لازم ہو، اس قول کے مطابق جس پر اس زمانے میں عمل ہے اور اس لیے کہ بیع الوفا، کو بمنزلہ رہن قرار دی جاتی ہے لہٰذا ثمن بائع کے اوپر بطور قرض لازم ہے۔

---

(۱) قاضیخان ۱/۲۵۴ (۲) شامی کراچی ۲/۲۶۱

حاصل یہ نکلتا ہے کہ قول راجح کے مطابق صرف مشتری پر واجب ہے لیکن احتیاطاً اسی میں ہے کہ بائع و مشتری دونوں ایسی رقم کی زکوٰۃ ادا کر دیا کریں۔ بیع الوفاء کے جواز کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ قید لگائی ہے کہ دستاویز کے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے۔ (۱)

مدارس، مساجد، قومی و رفاہی فنڈ کے مال پر زکوٰۃ

مدارس اسلامیہ اور مساجد اور دیگر قومی اور رفاہی فنڈ بیت المال وغیرہ شخص حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ سب اشیاء اشخاص حکمی میں شامل ہیں اور اسلامی شریعت نے زکوٰۃ کا فریضہ شخص حقیقی کی ملکیت تامہ پر واجب کیا ہے اور شخص حکمی کی ملکیت پر واجب نہیں کیا ہے اس لیے مساجد، مدارس، قومی فنڈ اور بیت المال وغیرہ کی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملک و هذا لان فی الزکوٰۃ تملیکا والتملیک فی غیر الملک لا یتصور الخ (۲)

وقف کے جانور اور رفاہی گھوڑے میں شخص حقیقی کی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے کسی شخص کو مالک بنا دینا شرط ہے اور غیر کی ملکیت میں تملیک متصور نہیں ہے۔

رشوت اور مال حرام کی زکوٰۃ

سود اور مال رشوت اور مال حرام کا قابض شرعی طور پر مالک نہیں ہوتا ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اس لیے ایسے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۳)

---

(۱) فتاویٰ مظاہر علوم ۱/۳۹۵ (۲) بدائع الصنائع ۲/۹، شامی کراچی ۲/۲۵۹، حاشیہ چلپی علی ھامش التبیین ۱/۲۵۲ (۳) امداد الفتاویٰ ۲/۱۶، کفایت المفتی ۴/۲۴۳، عزیز الفتاویٰ کراچی ۱/۳۶۲

وفی القنیۃ لوکان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلایفید ایجاب التصدق ببعضہ الخ۔ (۱)

یعنی مال حرام اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ نادار فقیر پر پورا کا پورا صدقہ کردینا واجب ہے اور اس کے بعض حصہ کا تصدق کافی نہیں ہے۔

اور ایسے مال کے بارے میں حکم شرعی اور واجب یہی ہے کہ پورا مال اصل مالک کو واپس کردیا جائے اور اگر اصل مالک تک رسائی ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب نادار فقیر کو صدقہ کردینا واجب ہے۔ صاحب بذل نقل فرماتے ہیں:

"صرح الفقہاء بان من اکتسب مالاً بغیر حق فاما ان یکون کسبہ بعقد فاسد کالبیوع الفاسدۃ والاستئجار علی المعاصی والطاعات او بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول ففی جمیع الاحوال المال الحاصل لہ حرام علیہ ولکن ان اخذہ من غیر عقد لم یملکہ و یجب علیہ ان یردہ علی مالکہ ان وجد المالک والا ففی جمیع الصور یجب علیہ ان یتصدق بمثل تلک الاموال علی الفقراء الخ" (۲)

یعنی حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ جو شخص بغیر حق کے کوئی مال حاصل کرے جیسا کہ بیوع فاسدہ، اجارہ فاسدہ اور معصیت اور ممنوع الاجارہ طاعات سے حاصل کرتا ہے یا چوری غصب، خیانت وغیرہ سے حاصل کرتا ہے تو تمام صورتوں میں حاصل شدہ مال اس پر حرام ہے وہ اس کا مالک نہیں ہوتا ہے اگر مالک مل جائے تو مالک کو واپس کرنا واجب ہے ورنہ فقراء کو صدقہ کردینا واجب ہے۔

اور اگر حاصل شدہ مال حرام کے بارے میں قابض اصل مالک کو تاوان وغیرہ دے کر بری ہو جاتا ہے یا اس سے صلح کرکے اس کو راضی کرلیتا ہے تو ایسی صورت میں علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے

---

(۱) شامی کراچی ۲/۲۹۱، بزازیہ ۴/۸۶ (۲) امداد المفتیین کراچی /۲۵۵، بذل المجہود ۱/۳۶ ومضمونہ فی الشامی کراچی ۲/۲۹۱ ومثلہ فی مجمع الانہر ۱/۱۹۳۔

ہیں کہ قابض مقبوضہ مال کا مالک ہوجاتا ہے اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوجاتی ہے۔

" لكن علمت انه لا تجب زكوته إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالح عنه فيزول خبثه الخ " (۱)

یعنی لیکن آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے مگر جب قابض صاحب مال کو عوض وغیرہ دے کر برأت حاصل کرتا ہے یا اس سے صلح کر لیتا ہے تو خبث اور حرمت ختم ہوجاتی ہے۔

اور اگر مال حرام کو قابض نے اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کردیا ہے تو اس کی دو شکلیں ہیں:۔

شکل نمبر ایک، قابض کے پاس مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب یا اس سے زائد موجود ہو تو مال حرام کو مستثنیٰ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

شکل نمبر دو، قابض کی ملکیت میں مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں قابض پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس کے پاس ملکیت تامہ کے طور پر کوئی نصاب موجود نہیں ہے۔

" واذا لم تتميز الاموال المغصوبه عن النصاب مملوكة له لا تجب عليه بقدر المغصوب وتجب في الزائد " (۲)

جب مال حرام اور مغصوب مملوکہ نصاب سے مخلوط ہونے کی وجہ سے امتیاز نہ کرسکے تو مقدار مغصوب کو مستثنیٰ کر کے بقیہ پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دین اور قرض کی زکوٰۃ کس پر لازم

دیون کی زکوٰۃ سے متعلق اہم ترین تین شکلیں علی الترتیب یہاں پر درج کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) وہ دین جو تجارتی مال یا قرض کے طور پر لازم ہے اور مدیون اس دین کا اقرار بھی کرتا ہے اور مدیون ادائے گی پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دائن بآسانی اس کو وصول بھی کرسکتا ہے تو ایسے دین کو

---

(۱) شامی کراچی ۲/۲۹۱ (۲) تقریرات رافعی ۱۳۲/ تحت عبارۃ الشامی ۲/۲۹۱

دین قوی کہا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوا کرتی ہے اس میں شریعت نے یہ رعایت دی ہے کہ وصول ہونے سے قبل ادا کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جب نصاب کے پانچواں حصہ کے بقدر وصول ہوجائے تو اس وصول شدہ کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرتا جائے گا، اور حضرت امام ابویوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوتا رہے گا اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ کے حساب سے نکالنا واجب ہوگا، اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا راجح اور مفتی بہ ہے۔

" اما القوی وهو الذی وجب بدلاً عن مال التجارة کثمن عرض التجارة من ثیاب التجارة وعبید التجارة او غلة مال التجارة ولاخلاف فی وجوب الزکوٰة إلا انه لایخاطب باداء شئ من زکوٰة مامضی مالم یقبض اربعین درهما فکلما قبض اربعین درهما واحداً وعند ابی یوسف ومحمد کلما قبض شیئا یودی زکوٰته قل المقبوض اوکثر الخ"[1]

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت وغیرہ کا بدل ہو، جیسا کہ تجارتی کپڑے اور غلام وغیرہ سامان تجارت کا ثمن یا مال تجارت کی آمدنی اور اس میں وجوب زکوٰۃ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے لیکن سنین ماضیہ کی زکوٰۃ چالیس درہم یعنی نصاب کے پانچویں حصہ کے بقدر قبضہ ہونے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور چالیس درہم وصول ہونے پر ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوگا اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، مقبوض کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔

(۲) اگر مدیون دین کا اقرار کررہا ہے مگر مفلس ہونے کی وجہ سے قرض ادا کرنے سے قاصر ہے تو ایسی صورت میں اگر حاکم نے اس کو مفلس تصور کرکے اس پر افلاس کا حکم نہیں لگایا ہے تو دین متوسط کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی دائن پر لازم ہوگا اور اگر حاکم نے افلاس کا حکم لگا دیا ہے تو مال ضمار اور دین ضعیف کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ کرنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا حضرت امام محمدؒ کے نزدیک دائن پر واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قبضہ

---

(۱) بدائع ۲/۱۰، مثله رسائل الارکان/۱۹۵، مجمع الانهر ۱/۱۹۵، قاضی خان ۱/۲۵۲، البحرالرائق ۲/۲۰۷، قاضی خان ۱/۲۵۳۔

سے قبل اس کے وصول پر دائن کو قدرت حاصل نہیں ہے۔

اور حضرات شیخین کے نزدیک سنین ماضیہ کی زکوۃ واجب ہے اس لیے کہ اس میں جانب فقرا کی رعایت پائی جاتی ہے۔ اور صاحب درمختار، صاحب تحفہ اور قاضی خان وغیرہ نے حضرت امام محمدؒ کے قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے اور باقانی نے کافی سے نقل کرکے شیخین کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

ولوكان الدين (إلى قوله) على معسر او مفلس اى محكوم بافلاسه أوعلى جاحد عليه بينة وعن محمد لازكوٰة وهو الصحيح (وتحته فى الشامية) ولولم يفلسه القاضى وجبت الزكوٰة بالاتفاق (إلى قوله) (وهو الصحيح) صححه فى التحفة كما فى غاية البيان وصححه فى الخانية ايضا (إلى قوله) ونقد الباقانى تصحيح الوجوب عن الكافى الخ (۱)

اگر تنگ دست اور مفلس پر قرض ہے اور حاکم اس پر مفلس ہونے کا حکم لگادے یا منکر پر دین ہے جس پر گواہ موجود ہے تو حضرت امام محمدؒ کے نزدیک قبضہ ہونے پر سنین ماضیہ کی زکوۃ نہیں ہے۔ (اور شیخین کے نزدیک واجب ہے) اور اگر قاضی نے مفلس قرار نہیں دیا ہے تو بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوۃ واجب ہے۔ اور امام محمدؒ کے قول کو تحفہ غایۃ البیان خانیہ نے صحیح قرار دیا ہے اور باقانی نے کافی سے وجوب کے قول کی تصحیح نقل کی ہے۔

(۳) دین کا اقرار کر رہا ہے اور اس کے پاس ادا کرنے کے لیے مال بھی ہے لیکن ٹال مٹول کر رہا ہے اور امروز وفردا میں کئی سال گزر گئے اور دائن کو اس کے حاصل کرنے پر قدرت بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوۃ ادا کرنا دائن پر واجب نہیں ہوگا، صرف مستقبل کی زکوۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔ (۲)

" يقر المديون بالدين وبملائته ولايقدر الدائن على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم " (۳)

---

(۱) الدرالمختار مع الشامى، كراچى ۲/۲۶۶، ومثله فى مجمع الانهر ۱/۱۹۴، عنايه ۱/۱۱۶۴، بدائع ۲/۹

(۲) امداد الفتاوىٰ ۲/۲۵ (۳) شامى كراچى ۲/۳۰۴۔

مدیون دین کا اور مال داری کا اقرار کرتا ہے اور دائن اس کے چھڑانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو وہ بمنزلہ عدم کے ہے اور عدم پر شرعی حکم لاگو ہو کر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوا کرتی ہے۔

اور اس کی زکوٰۃ مدیون پر اس لیے واجب نہیں کہ وہ اتنی مقدار مال کا درحقیقت مالک نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تام شرط ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ ایسا مال وجوب زکوٰۃ کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا۔ اور دین کی زکوٰۃ مدیون پر کسی حال میں بھی لازم نہیں ہوتی اور دائن پر ہی دین کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

سرکاری محکموں اور دیگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ فنڈ کے نام کاٹ کر جمع کرلیا جاتا ہے اور اس پر مزید اضافہ کے ساتھ محفوظ کرلیا جاتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اصل رقم اور اضافہ دونوں ملازم کو مل جاتے ہیں تو ایسی صورت میں فنڈ کی زکوٰۃ ملازم پر واجب ہوگی یا نہیں؟۔

تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ فنڈ کی مذکورہ رقم بالاتفاق دین قوی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی، اور دین ضعیف کے دائرہ میں داخل ہونا زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ ملازم کا اس رقم پر کبھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے اضافہ شدہ رقم کو سود کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاتا ہے اور دین ضعیف میں قبضہ کے بعد بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ہے، اور اس رقم کا دین متوسط کے دائرہ میں داخل ہونا امر متردد فیہ ہے لیکن اگر دین متوسط میں داخل کرلیا جائے تو بھی صحیح اور راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اس لیے پراویڈنٹ فنڈ پر ماضی کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۱)

" اما دین الوسط فما وجب له بدلا عن مال لیس للتجارة (الیٰ قوله)

وفیه روایتان عنه وروی بن سماعة عن ابی یوسف رح عن ابی حنیفة رح

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۹، فتاویٰ محمودیه ۳/۵۱، کفایة المفتی ۴/۲۸۸ و ۲۴۲، جواهر الفقه ۱/۳۸۵، فتاویٰ رحیمیه ۵/۱۴۲، عزیز الفتاویٰ کراچی /۳۶۸۔

انہ لازکوٰۃ فیہ حتی یقبض المأتین ویحول علیہ الحول من وقت القبض وھواصح الروایتین عنہ الخ "(۱)

بہرحال دین متوسط وہ ہے جو اس کے ایسے مال سے واجب ہے جو مال تجارت نہیں ہے اور اس کے وجوب میں امام ابوحنیفہ رح سے دو روایتیں ہیں اور ابن سماعہ امام ابویوسف سے اور وہ حضرت امام ابوحنیفہ رح سے نقل فرماتے ہیں کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے حتی کہ دو سو درہم قبضہ کرلے اور اس پر قبضہ کے بعد سال گزر جائے اور یہی امام صاحب کی دونوں روایتوں میں سے صحیح اور راجح روایت ہے۔

نمو کی تعریف اور وجوب زکوٰۃ کی شرط

نمو کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور باب زکوٰۃ میں اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) نمو حقیقی:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال توالد و تناسل اور تجارت کی شکل میں بڑھتا رہے۔

(۲) نمو تقدیری:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از خود یا اپنے نائب وغیرہ کے ذریعے مال کو بڑھانے اور ترقی کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا شرط ہے چاہے نمو حقیقی ہو یا تقدیری۔

" وفی الشرعی ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنہ من الزیادۃ بکون المال فی یدہ أو ید نائبہ الخ "(۱)

اور اصطلاح شرع میں نمو کی دو قسمیں ہیں، نمو حقیقی، نمو تقدیری، اور حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ توالد و تناسل اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ اضافہ ہو، اور تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از

---

(۱) بدائع ۱۰/۲، منحۃ الخالق ۲۰۶/۲، ومثلہ فی الشامی، کراچی ۳۰۶/۲ ومثلہ فی مجمع الانھر ۱۹۵/۱۔ (۲) شامی کراچی ۲۶۲/۲۔

(۱) شامی، کراچی ۲۶۳/۲ ومثلہ فی البحرالرائق ۲۰۶/۲، تبیین الحقائق ۲۵۵/۱۔

خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کو بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو۔

حوائج اصلیہ کی شرط

حوائج اصلیہ میں وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی بسر کرنا دشوار ہوجائے اور آج کل کے دور میں بہت سی غیر ضروری اشیاء کو لوگوں نے اپنے لیے یوں ہی ضروری کرلیا ہے جو درحقیقت حوائج اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں۔ اور حوائج اصلیہ دو قسموں پر ہے۔

(۱) حاجت اصلیہ حقیقیہ اس کے اندر وہ اشیاء شامل ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کو ہلاکت کا خطرہ ہے، مثلاً ضروری نفقہ اور اخراجات اور رہائشی مکانات اور آلاتِ جنگ اور سردی اور گرمی کے وہ کپڑے جن کی اپنے موسم کے اعتبار سے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) حاجتِ اصلیہ تقدیریہ، اس کے اندر وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں انسان جن کے بارے میں ہر وقت صحیح معنی میں متفکر رہتا ہے، مثلاً واجب الادا قرضہ پیشہ اور کاریگری کے اوزار و آلات اور گھر کے ضروری اثاث و سامان اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں یہ سب حوائج اصلیہ میں شامل ہیں، لہٰذا اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہے، لیکن اس پر قرض بھی ہے یا کسی عالم نے ضروری کتابیں خریدنے کے لیے کچھ رقم الگ کر رکھا ہے یا کسی کاریگر نے اوزار کے لیے کسی کو رقم دے رکھا ہے یا گھر کے سامان اور سواری کے لیے کچھ پیسہ دے رکھا ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

" وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة و دور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديرًا كالدين فان المديون محتاج إلى قضاءه بما فى يده من النصاب دفعًا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكالآلات الحرفة واثاث المنزل و دواب الركوب وكتب العلم لأهلها فان الجهل عندهم كالهلاك فاذا كان له دراهم مستحقة يصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة كما ان الماء المستحق يصرفه إلى العطش كان

کالمعدوم ؏ (شامی ۲/۲۶۲، کراچی)

حوائج اصلیہ میں ہر وہ شئی شامل ہوتی ہے جو انسان سے حقیقی معنی میں اسباب ہلاکت کو دور کرتی ہے جیسا کہ نفقہ، رہائشی مکان، جنگی آلات، گرمی سردی کے ضروری کپڑے یا تقدیرًا اور باطناً ہلاکت کو دور کرتی ہے، جیسے کہ واجب الادا قرض جو اس کے قبضہ میں بقدر نصاب مال ہے اس کے ذریعہ ادا کیا جائے گا اپنے سے قید وغیرہ کو دور کرنے کے لیے اور قید بھی ہلاکت کے درجہ میں، صناعت کے اوزار اور گھر کے اثاث اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں اس لیے کہ جہالت ان کے نزدیک ہلاکت ہے، لہذا ان ضروریات میں خرچ کے لیے جو رقم موجود ہے وہ کالعدم ہوگی، جیسا کہ پیاسے کے حق میں پینے کے پانی کو کالعدم قرار دے کر اس پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔

شامی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی حقیقت اور علاقہ ہر دور کے اعتبار سے حاجات اصلیہ میں تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عوام کے لیے کتب حدیث، کتب فقہ وغیرہ حاجات اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتیں اور علماء کے لیے حاجات اصلیہ میں سے ہیں۔ اور ایسی جگہ جہاں جانوروں کو سواری کے کام میں لایا جاتا ہے اور وہاں اسکوٹر، سائیکل وغیرہ چلانے کے لیے کوئی راستہ بھی نہیں ہے وہاں سواری کے جانور حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گے اور گاڑی اسکوٹر وغیرہ شامل نہیں ہوں گی۔ اور شہر والوں کے لیے یہ سب اشیاء حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گی، نیز اگر ایسی جگہ جہاں گاڑی وغیرہ چلانے کا راستہ نہیں ہے وہاں کے لوگ اگر گاڑی وغیرہ رکھ لیں تو وہ اشیاء حوائج اصلیہ سے اگرچہ زائد ہیں لیکن مال نامی نہ ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

طویل الاجل قرض اور کون سا دین مانع زکوٰۃ؟

وہ تمام دیون جو مدیون پر واجب الادا ہوتے ہیں وہ سب وجوب زکوٰۃ کو مانع ہیں اس لیے موجودہ دور میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے اور فیکٹری اور فرم وغیرہ قائم کرنے کے لیے پبلک حکومت سے جو قرض لیتی ہے اور ادائے گی کے لیے سالانہ ماہانہ قسط مقرر کیا جاتا ہے اور طویل الاجل قرض کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ مقدار قرض کو منہا کرنے کے بعد مابقیہ مال اگر نصاب کو پہونچ جاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب

ہوگا، اور اگر نصاب کو نہیں پہونچتا ہے تو زکوٰۃ ہی اس مدیون پر واجب نہ ہوگی۔

نیز اگر ایک کروڑ روپیہ قرض میں لے رکھا ہے اور سالانہ پانچ لاکھ کے حساب سے بیس سال میں ادا کرتا ہے تو سالانہ قسط کے لحاظ سے تجزی نہ ہوگا بلکہ پورے ایک کروڑ کو منہا کیا کرے گا۔

" فارغ عن الدین والمراد دین له مطالب من جهة العباد سواء کان الدین لهم او لله تعالیٰ وسواء کان المطالبة بالفعل او بعد زمان فینتظم الدین المؤجل " (۱)

مال نصاب قرض سے بری ہو اور قرض سے ایسا قرض مراد ہے کہ منجانب العباد اس کا مطالبہ ہو چاہے وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا اور مطالبہ فی الحال اور بالفعل ہو یا مدت اور زمانے کے بعد، لہٰذا دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ میں شامل ہوگا۔

کمپنی اور مشترک کاروبار کے حصہ داروں کی زکوٰۃ

مشترکہ تجارت اور کمپنی فیکٹری وغیرہ کے حصہ داروں کی زکوٰۃ مجموعہ رقم اور مال پر واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر حصہ دار کی زکوٰۃ اس کے حصہ کے حساب سے ادا کرنا واجب ہوگی، لہٰذا جس کا حصہ نصاب کو پہونچے گا، اس پر اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی اور جس کا حصہ نصاب کو نہیں پہونچتا ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اتنا مال نہیں ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہوسکتا ہو، تو ایسے حصہ دار پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہے اور جس کے پاس شرکت کے حصہ کے علاوہ اتنا مال ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہوجاتا ہے اس پر زکوٰۃ تو واجب ہوجاتی ہے لیکن وہ اپنے حصہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر نکالا کرے گا۔ (۲)

" ولاتجب الزکوٰة عند نا فی نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة (إلیٰ قوله) وان تعدد النصاب تجب اجماعًا ویتراجعان بالحصص فان بلغ نصیب احدهما نصابا زکاه

---

(۱) مجمع الانہر ۱/۱۹۳، ومثله عنایة علی هامش الفتح ۲/۱۶۰، خانیه ۱/۲۵۵، هندیه ۱/۱۷۳، الدرالمختار ۲/۲۶۰، البحرالرائق ۲/۲۰۲ (۲) مستفاد فتاویٰ دارالعلوم ۶/۶۷ -

دون الآخر الخ "(۱)

ہمارے نزدیک جانوروں اور مال تجارت کے ایک مشترک نصاب پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر اس میں اختلاط واشتراک صحیح ہوچکا ہے اور اگر نصاب متعدد ہوجائے تو ان نصابوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا، اور حصہ دار حضرات اپنے اپنے حصوں کے حساب سے ایک دوسرے سے مراجعت کریں گے۔ اور اگر کسی کا حصہ نصاب کو پہونچتا ہے اور کسی کا نہیں پہونچتا ہے تو جس کا حصہ نصاب کو پہونچتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسرے پر نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے، جواہرات اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں بلکہ گھروں میں برائے زینت یا کسی اور مقصد سے جمع کر رکھا ہے تو ہیرے و جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ ہیرے جواہرات اگرچہ حوائج اصلیہ سے زائد ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی ہونا بھی شرط ہے اور ان میں نمو اور بڑھوتری کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے ہیرے جواہرات چاہے کتنے ہی مقدار میں ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

"اما اليواقيت واللآلي والجواهر فلا زكوٰة فيها وان كانت حليا الا ان تكون للتجارة "(۲)

یاقوت، موتی، جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ زیور کی شکل میں کیوں نہ ہوں۔

"والجواهر واليواقيت فلا شئ فيها (۳)۔ فان الحوائج الاصلية اعم من الدين والنامي اعم منها لانه يخرج به كتب العلم لغير اهلها وليس من الحوائج الاصلية الخ" (۴)

---

(۱) الدر المختار، کراچی ۲/۳۰۴، (۲) عالمگیری ۱/۱۸۰ (۳) عالمگیری ۱/۱۸۵ ومثلہ کتاب الفقہ ۱/۶۱۲، الدر المختار، کراچی ۲/۳۲۱ (۴) شامی، کراچی ۲/۲۶۲۔

یاقوت وجواہرات میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لیے کہ حوائج اصلیہ میں دین بھی شامل ہے اور نمو بھی دین کو شامل ہے اور اسی نمو کی قید کی وجہ سے غیر اہل کے لیے کتب دینیہ نصاب کے دائرہ سے خارج ہوجاتی ہے حالاں کہ وہ غیر اہل کے لیے حوائج اصلیہ میں سے نہیں ہیں۔

غیر نامی اشیا، اگر بقدر نصاب یا نصاب سے زیادہ حوائج اصلیہ سے زاید ہو تو مالک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ سے صرف مستحق زکوٰۃ بننے سے محروم ہوتا ہے اس لیے ہیرے وجواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"وكذا الكتب وان لم تكن لاهلها اذا لم تنو للتجارة غير ان الاهل له أخذ الزكوٰة وان ساوت نصبا وتحته في الشامي واما غير الاهل فانهم يحرمون بالكتب من أخذ الزكوٰة لتعلق الحرمان بملك قدر نصاب غير محتاج اليه وان لم يكن ناميًا" (۱)

ایسے ہی کتابیں اگرچہ نااہل کے لیے ہوں اور تجارت کی غرض اس میں نہ ہو (تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے) لیکن اگر با اہل عالم کی کتابیں ہیں تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہوگا، کتابیں چاہے کئی نصاب کے بقدر کیوں نہ ہوں، اور غیر اہل ان کتابوں کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہونے سے محروم ہوجائے گا، جب کہ نامی اور تجارتی نہ ہوں۔

تجارتی پلاٹ اور اموال تجارت میں کس نرخ پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں ادا، زکوٰۃ کے لیے چار قسم کے نرخ سامنے آتے ہیں:

(۱) حضرت امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک جس دن سال ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا ہے اگر اسی روز زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور پھر بھاؤ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوجائے تو حولان حول کے دن جو بھاؤ عمومی طور پر پایا جاتا تھا اسی بھاؤ کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔

"عند ابي حنيفة رح في الزيادة والنقصان جميعًا يؤدي قيمتها

---

(۱) الدر المختار مع الشامي، کراچی ۲/۲۶۵۔

یوم الحول۔الخ" (۱)

حضرت امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک حولان حول کے بعد اگر زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور مال کے بھاؤ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہو جائے تو جب بھی ادا کرے گا حولان حول کے دن کے بھاؤ کا اعتبار کر کے ادا کرے گا۔

(۲) حضرت امام ابویوسفؒ و محمد رح کے نزدیک اگر یوم الحول میں زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو وقت گزر جانے کے بعد جس دن بھی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی اسی دن کی قوت خرید کے نرخ کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، لہٰذا اگر بھاؤ گھٹ جائے تو گھٹے ہوئے کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور اگر بڑھ جائے تو بڑھے ہوئے کی قیمت لگا کر ادا کرنا لازم ہوگا۔

" وعندهما فی الفصلین جمیعا یؤدی قیمتها یوم الاداء فی النقصان (وقوله) وفی الزیادة الخ" (۲)

اور حضرات صاحبین کے نزدیک عین شئی میں سے ادا کرے دونوں صورتوں میں یوم الاداء کے نرخ کا اعتبار ہے چاہے مال کی قیمت کم ہوگئی ہو یا زیادہ۔

(۳) متوقع قیمت فروخت کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کی جائے لیکن یہ ایک امر متردد فیہ ہے، اور زکوٰۃ مال متعین اور مال یقینی اور ملکیت یقینیہ پر ہی واجب ہوا کرتی ہے، اس لیے متوقع نرخ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

(۴) رأس المال اور لاگت کی قیمت کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے یہ ایک امر یقینی اور متعین ہے اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو ملکیت تامہ اور ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ ادا کرنا پایا جاتا ہے اور شریعت اسلامی نے ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ واجب کی ہے ملکیت متردد فیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے، اس وجہ سے اس شکل کا اعتبار کرتے ہیں اگرچہ عبارات فقہیہ زیادہ ساتھ نہیں دیتی ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کی اصل علت اور بنیاد پر غور کرنے سے اس شکل کی قوت نظر آتی ہے اس لیے اس صورت کو اگر جائز کہا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے اور کتب فقہ کی عبارات اول الذکر دونوں

(۱) بدائع الصنائع ۲/۲۲ ومثلہ فی الهندیہ ۱/۱۸۰ (۲) بدائع الصنائع ۲/۲۲

شکلوں کی مؤید ہیں، لہٰذا حاصل یہ نکلے گا کہ تیسری شکل کے جواز کے دائرہ میں آنے کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور چوتھی شکل اصل بنیاد وعلت کے لحاظ سے جواز کے دائرہ میں آسکتی ہے، اور اول و دوم کے لیے کتب فقہ کی صریح عبارات موجود ہیں۔ اس لیے ان تینوں شکلوں میں سے کسی بھی ایک کو معمول بہ بنائی جاسکتی ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہ رح کے قول کے مطابق یوم الحول کے نرخ کا اعتبار کرنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ اور تجارتی پلاٹ پر بھی مذکورہ تفصیل اور احکام لاگو ہوں گے۔ اگر پھٹکر فروختگی کا مال ہے تو زکوٰۃ میں پھٹکر بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا، اور تھوک فروختگی کا مال ہے تو تھوک بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا۔

کمپنی کے حصص اور شیئرز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص اور شیئرز میں تجارتی سرمایہ ہونے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی اور اس کی زکوٰۃ کی ادائے گی میں لاگت اور منافع دونوں کا اعتبار کرکے دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے اور اس کے سرمایہ میں سے جتنی مقدار کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں خرچ ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جو مقدار نامی اثاثوں میں لگا ہے اس کی اس کے منافع کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کا پورا حصہ نامی اثاثہ میں لگایا گیا ہے تو پورے حصۂ راس المال اور منافع دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔

اور اگر شیئرز مارکیٹ میں شیئرز کو خرید کر فروخت کیا کرتا ہے اور فروختگی کی غرض سے حصص خریدا کرتا ہے تو کل لاگت مال تجارت کے دائرہ میں آکر کل پر زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی۔ (۱)

بونڈس اور حکومت کو بطور قرض دی گئی رقم کی زکوٰۃ

حکومت اور کمپنی وغیرہ کو طے شدہ مدت اور معاہدہ کے تحت جو رقم بطور قرض دی جاتی ہے، وہ شرعی طور پر دین قوی کے حکم میں ہوتی ہے، اس لیے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا کرتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری رح کی البحر الرائق کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

---

(۱) مستفاد فتاوی رحیمیہ ۲/۱۴، جدید فقہی مسائل ۱/۱۳۲، اسلامی فقہ ۱/۳۲، جواہر الفقہ ۱/۳۸۵، امداد الفتاوی ۲/۱ فتاوی دار العلوم ۶/۳، ایضاح المسائل ۱۰۶/ ۔

" الدين علی ثلثة اقسام قوی وهو بدل القرض ومال التجارة (قوله)
ففی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی القضاء إلی ان یقبض
اربعین درهما ففیها درهم وکذا فیما زاد بحسابه الخ"[1]

قرض اوردین تین قسموں پر ہے، دین قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے تو دین قوی کے اندر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے لیکن ادائے گی چالیس درہم کے قبضہ کرنے تک موقوف رہے گی اس کے بعد جتنا وصول ہوتا رہے گا اس کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کیا کرے گا۔

مصارف زکوٰۃ

مدز کوٰۃ سے طلبہ کی فیس ادا کرنا

اگر طلبہ کے اخراجات کا حساب لگا کر فی کس جتنا بنتا ہے اتنے کا چیک بنا کر مہتمم مدرسہ کے قبضہ میں دے دیا کرے اور طلبہ اپنے قیام وطعام کی چیز کے نام سے مدرسہ کو دے دیا کریں تو بلاشبہ جائز و درست ہوگا اور یہ مدارس اسلامیہ میں مال زکوٰۃ کی تملیک کے لیے بہت بہترین اور مناسب شکل ہے اور یہ حیلہ تملیک نہیں بلکہ تملیک کے دائرہ میں داخل ہوجائے گی اور اگر مال دار اور مستطیع طلبہ سے فی کس کے تناسب سے فیس لیا کرے تو یہ بھی جائز اور درست ہے البتہ وہ غنی طالب علم جس کی ملکیت میں نصاب سے زائد مال اور رقم ہے، راجح قول کے مطابق اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا یا مدز کوٰۃ سے اس پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔[2] اور صاحب در مختار نے جو غنی طالب علم کے لیے اخذ زکوٰۃ کو جائز لکھا ہے اس کو علامہ شامی نے یہ کہہ کر مسترد کردیا ہے کہ یہ اس قول کے خلاف ہے جس میں مطلقاً غنی کے لیے حرمت زکوٰۃ کو ثابت کیا گیا ہے اور جواز کے قول کا کسی نے اعتبار نہیں کیا۔

---

(۱) البحرالرائق ۲/۲۰۶، ومسئلہ فی الخانیۃ ۱/۲۵۴

(۲) امداد الفتاویٰ ۲/۱۹۔ احسن الفتاویٰ ۲/۲۵۳۔

" وهـذا الفـرع مـخالف لاطلاقهم الحـرمـة فـي الغـني ولـم يعتـمـده احـد " (۱)

اور یہ جزئیہ فقہاء کے غنی کے حق میں علی الاطلاق حرمت زکوٰۃ کے قول کے مخالف ہے اور (اس جواز کے قول) کا کسی نے اعتبار نہیں کیا ہے۔

اور اگر فقیر طلبہ کو مہتمم اور ذمہ داران مدرسہ چیک یا رقم پر قبضہ نہ دیں اور خود مہتمم یا دیگر ذمہ دار طلبہ کے نام سے اپنے طور پر جمع کرلیں پھر اس رقم کو تنخواہ وغیرہ میں صرف کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا بلکہ اس کے جواز کے لیے یہ شرط ہے طلبہ صراحتًا ذمہ دار کو اس کام کے لیے وکیل بنادیں، اس کے بغیر جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔

ادا، زکوٰۃ میں ضم نصاب کا حکم

وجوب زکوٰۃ کے لیے شریعت اسلامی نے مال نامی ہونے اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ نصاب مال کے مالک ہونے کی شرط بھی لگائی ہے تاکہ لاضرر ولاضرار کے قانون کے تحت کسی کو کوئی نقصان نہ ہو اور اسلامی شریعت نے سونا اور چاندی کو الگ الگ معیار قرار دیا ہے اسی وجہ سے دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اصلیت کا حکم رکھتے ہیں اس لیے بلا وجہ کسی ایک کو ہی اصل ٹھہرانا بے اصل اور بے دلیل بات ہوگی، اس لیے جب دونوں الگ الگ اپنے نصاب کو پہونچ جائے تو الگ الگ زکوٰۃ نکالنا بھی واجب ہوتا ہے اور جب تفاوت ہوجائے اور ایک کا نصاب مکمل ہوجائے اور دوسرے کا مکمل نہ ہو یا کسی کا نصاب کامل نہ ہو تو شریعت نے انفع للفقراء کو پیش نظر رکھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملاکر دونوں کو ایک کے حکم میں قرار دے کر نصاب مکمل کرکے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے اور اس طرح ضم نصاب کی صورت میں انفع للفقراء کو ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور انفع للفقراء اسی میں ہے کہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملاکر پورے کو چاندی کا نصاب بنادیا جائے۔ (۲)

---

(۱) شامی کراچی ۲/۳۴۰ (۲) مستفاد فتاویٰ محمودیہ ۱۱/۲۹ - کفایت المفتی ۴/۲۵۳ - امداد الفتاویٰ ۲/۳۹ - فتاویٰ رحیمیہ ۱/۱۵ -

" وجوب الضم اذا لم يكن كل واحد منهما نصابًا بان كان اقل فلو كان كل منهما نصابًا تامًا بدون زيادة لا يجب الضم بل ينبغي ان يؤدي من كل واحد زكوٰته فلوضم حتى يؤدي كله من الذهب او الفضة فلا بأس به عندنا ولكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء"[1]

سونا چاندی میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ضم کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے کہ جب دونوں کا نصاب مکمل نہ ہو اور نصاب سے کم ہو اور اگر دونوں کا نصاب مکمل ہو تو انضمام لازم و واجب نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ دونوں کی زکوٰۃ الگ الگ ادا کی جائے اور اگر ملا کر ادا کی جائے تو بھی حنفیہ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے لیکن واجب یہی ہے کہ اس کے ساتھ قیمت لگائی جائے جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ اور نفع ہو۔

مہتمم معطین و طلبہ دونوں کا وکیل

مہتمم اور سفراء بالاتفاق معطین کے وکیل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طلبہ اور فقراء کے بھی وکیل ہیں یا نہیں؟ تو اگر ان کو صرف زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے وکیل تسلیم کیا جائے اور طلبہ کی طرف سے وکیل تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک یہ لوگ مصرف میں خرچ نہ کر دیں، لہٰذا اگر مصرف میں خرچ ہونے سے قبل ضائع ہو جائے تو معطین کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اس پر فریضہ زکوٰۃ بدستور باقی رہے گا، لیکن اگر مہتمم اور سفراء کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے تو ان پر تاوان بھی لاگو نہ ہوگا، نیز ایسی صورت میں جن مدارس میں زکوٰۃ کی رقم کئی کئی سال خرچ ہوتے بغیر جمع رہتی ہے اگر بقدر نصاب ہو تو ان کے معطین پر ان سالوں کی زکوٰۃ بھی دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں اس کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔[2] لیکن ہمارے اکثر اکابر اہل فتاویٰ نے مہتمم کو طلبہ اور معطین دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے

---

(۱) شامی، کراچی ۲/۳۰۳ ومثلہ فی الهندیة ۱/۱۷۹۔

(۲) معارف القرآن ۴/۱۶۹ تحت سورہ توبہ، آیت ۶۰۔

وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحت لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اسی وقت ادا ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر طلبہ پر خرچ ہونے سے قبل بلا تعدی ہلاک ہوجائے تو معطین کے وکیل اور امین ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی تاوان لازم نہ ہوگا اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے معطین کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، نیز کئی سال سے جمع شدہ رقم پر کسی شخص حقیقی کی ملکیت تامہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا لازم نہ ہوگا، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلا ہیں، لہٰذا نہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطین زکوٰۃ واپس لے سکتے ہیں۔ (۱)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس فتویٰ سے رجوع کرلیا ہے جس میں طلبہ کی طرف سے وکیل ہونے کا انکار کیا ہے، اور رجوع کا تفصیلی فتویٰ جواہر الفقہ ۴/۳۰۷ میں امین اشرف متعلم درجہ تخصص فی الفقہ والافتا، دارالعلوم کراچی کے ۱۴/ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ کے سوال کے جواب کے تحت موجود ہے۔ (۲)

اور یہی مضمون حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم نے فتاویٰ محمودیہ میں نقل فرمایا ہے کہ جب طلبہ نے مہتمم کے اہتمام اور انتظام اور قوانین تسلیم کرکے داخلہ لیا ہے تو گویا کہدیا کہ آپ ہمارے وکیل ہیں۔(۳)

اور قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے بھی صاف اور واضح الفاظ میں مہتمم کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے۔(۴) اور قوت دلائل کی روشنی میں اگرچہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے معارف القرآن میں نقل فرمایا ہے لیکن اساطین امت اور اہل فتاویٰ کی ایک بڑی جماعت نے مہتمم اور اہل مدرسہ کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے، اس لیے یہی مسلم ہوگا کہ مہتمم اور اہل مدرسہ اور سفراء معطین اور طلبہ دونوں کی طرف سے وکیل ہوں گے۔ نیز حضرت تھانویؒ نے بھی امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم مطبوعہ رحیمیہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رہ کے مذکورہ جواب کو تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ اور تردد بالکل رفع ہوجاتا ہے۔ (۵)

---

(۱) مستفاد فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۱۹ (۲) جواہر الفقہ ۴/۳۰۷ (۳) فتاویٰ محمودیہ ۲/۲۱۸، ملفوظات فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۰۶

(۴) مستفاد تذکرۃ الرشید ۱/۱۹۳، حاشیہ فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۲۰

(۵) امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم ۴/۲۱۸۔

مدزکوٰۃ سے سفراء کی تنخواہ

مدارس کے سفراء کو العاملین علیہا کے حکم میں قرار دے کران کو زکوٰۃ کی رقم میں سے بلاتملیک تنخواہ دینا درست ہوگا یا نہیں ؟ تو اس سلسلہ میں ہمارے اکابرین سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے سفراء کو العاملین علیہا کے دائرہ میں داخل کر کے مدزکوٰۃ سے ان کو تنخواہ دینا جائز قرار دیا ہے اور صرف یہ قید لگائی ہے کہ ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زائد تنخواہ دینا جائز نہیں ہے۔[1] نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ نے امداد المفتیین میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہی نقل فرمایا ہے کہ سفراء کو عاملین کے حکم میں قرار دے کران کو مدزکوٰۃ سے تنخواہ دی جاسکتی ہے[2] لیکن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں کافی تفصیل کے ساتھ مختلف دلائل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ مدارس کے سفراء کو عاملین کے حکم میں قرار نہیں دیا جاسکتا اور ان کو عاملین کے حکم میں قرار دے کر مدزکوٰۃ میں سے ان کو زکوٰۃ دینا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ (۳)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ موصوف نے جواز کے فتویٰ سے رجوع کر کے عدم جواز کو اختیار فرمالیا ہے اس لیے کہ یہ مسلم بات ہے کہ امداد المفتیین بہت پہلے مرتب ہوگئی تھی اور اس کے طویل عرصہ کے بعد معارف القرآن تحریر فرمائی ہے، تو اب اکابرین سے جواز کے قائل صرف حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہٗ تنہا رہ جاتے ہیں اور قریب قریب تمام اکابر اہل فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ سفراء کو امیر کی طرف سے مقرر کردہ عاملین کے حکم میں قرار دے کران کو مدزکوٰۃ سے بلاتملیک تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ امداد الفتاویٰ، عزیز الفتاویٰ، احسن الفتاویٰ وغیرہ سب میں عدم جواز کا حکم موجود ہے (۴) اور یہی حکم محاسبی اور دفتر کے ملازمین کی تنخواہ کے بارے میں بھی ہوگا، خصوصاً جب وہ لوگ حساب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہوں، لہٰذا مدزکوٰۃ سے سفراء و دیگر ملازمین کو تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔

---

۱) کفایۃ المفتی ۴/۲۶۹

۲) امداد المفتیین، کراچی ۴۵۸/

۳) معارف القرآن ۴/۱۶۹، سورہ توبہ آیت : ۷ ۔

۴) امداد الفتاویٰ دیوبند، عزیز الفتاویٰ کراچی ۳۶۰/ ۔ احسن الفتاویٰ ۴/۲۹۴ ۔

اگر باتنخواہ ملازمین کو حسن کارکردگی کچھ شرح فی صد متعین کرکے بطور انعام طے شدہ تنخواہ سے زائد دینا شرعاً جائز اور درست ہے لیکن یہ انعام وصول شدہ چندہ کے نصف سے کم ہی ہونا شرط ہے اور نصف سے کم میں کوئی بھی مقدار حسب صواب دید متعین کی جاسکتی ہے اس لیے کہ نصف یا اس سے زائد امیر کی طرف سے مقرر کردہ عاملین کو دینا بھی جائز نہیں ہے، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ میں واضح کردیا ہے۔

لکن لایزاد علی نصف ما یقبضہ۔ (۱) لیکن وصول شدہ کے نصف سے زائد ان کو نہ دیا جائے۔

اور اس کا لحاظ بھی لازم ہوگا کہ سفراء زکوٰۃ کی رقم وصول کرکے تملیک سے قبل اس میں سے خرچ نہ کریں بلکہ خرچ کے لیے مدرسہ سے علی الحساب پیشگی رقم لے لیا کریں اور زکوٰۃ کی وصول شدہ رقم اولاً مکمل مدرسہ میں لا جمع کردیں، پھر مدرسہ کے فنڈ سے اپنا حساب صاف کرلیا کریں ورنہ تملیک فقراء کی شرط فوت ہوجاتی ہے اور تملیک ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط ہے۔

ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً۔ (۲)

ادائے زکوٰۃ کے لیے تملیک فقراء شرط ہے۔

اور اگر باتنخواہ ملازم نہیں ہے تو اجارہ فاسدہ ہونے کی وجہ سے شرح فی صد متعین کرکے صرف کمیشن کو اجرت قرار دینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ صحت اجارہ کے لیے اجرت کا تعین شرط ہے۔ لہٰذا کمیشن کا یہ طریقہ جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔ (۳)

"وشرطها کون الاجرة والمنفعة معلومتین الخ۔" (۴)

یعنی صحت اجارہ کے لیے منفعت اور اجرت دونوں کا متعین ہونا شرط ہے۔

ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة والاجرة معلومة۔ (۵)

یعنی اجارہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک منفعت اور اجرت متعین نہ ہو۔

لہٰذا حاصل یہ نکلتا ہے کہ باتنخواہ ملازم کے لیے بطور انعام کمیشن متعین کرنا جائز ہے اور بے تنخواہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

---

(۱) شامی کراچی ۲/۳۴۰ (۲) درمختار کراچی ۲/۳۴۴ (۳) فتاویٰ احیاء العلوم ۱/۳۳۳، فتاویٰ محمودیہ ۴/۲۷۲، فتاویٰ محمودیہ ۷/۵۲۲ (۴) درمختار کراچی ۶/۵ (۵) ھدایہ ۳/۲۷۷

زکوٰۃ

از :۔ مولانا عبد اللہ قاسمی، استاذ جامعہ اسلامیہ، بنارس

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر ایک محکم فریضہ ہے جو ہر مالدار مسلمان پر چند شرائط و حدود کے ساتھ عائد کیا گیا ہے، جن میں سے کچھ شرائط کا تعلق اس شخص سے ہے، جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، کچھ کا اس مال سے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور کچھ کا اس مصرف سے جہاں زکوٰۃ کی مفروضہ مقدار خرچ کی جاتی ہے۔

فقہاء مجتہدین نے قرآن و حدیث کی نصوص، اجماع اور ان کی روشنی میں قیاس صحیح کے ذریعہ اصولی و فروعی اعتبار سے ان شرائط و حدود کی تشریح کر دی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اختلاف زمانہ اور احوال و ظروف کے تجدد کے ساتھ ہر دور کے جزئی مسائل بھی مختلف ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ان کا حل بھی اصول شریعت کی روشنی میں زمانہ و حال کی رعایت کرتے ہوئے ڈھونڈنا وقت کے فقہاء کی ذمہ داری ہوتی ہے، موجودہ زمانے میں ملکی و عالمی تجارتوں کی کچھ ایسی نئی شکلیں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر معاملات کے علاوہ باب زکوٰۃ پر بھی پڑا ہے خصوصاً ان شرائط اور اوصاف پر جن کا تعلق مال سے ہے، بسا اوقات یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ واجب بھی ہوئی یا نہیں۔ پیش نظر مقالہ میں سوالنامہ کے اسی جزء کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جب کہ محور ثالث "مصارف زکوٰۃ" کے بعض پہلوؤں پر بھی کچھ گفتگو کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی شرط ملکِ تام (محور اوّل)

ملکِ تام کا مطلب : کسی بھی مال میں زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس کا مملوک ہونا ضروری ہے، چنانچہ جس مال

کا کوئی شخص حقیقی[1] مالک نہ ہو، اس میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، پھر علاوہ امام زفر بھی ائمہ احناف کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اس مال پر شخص حقیقی کو ملکیت کامل طور سے حاصل ہو۔ کامل کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسباب تملک میں سے کسی سبب کے ذریعہ شئی کی ذات پر ملکیت قائم ہونے کے ساتھ ساتھ قبضہ و تصرف میں بھی وہ شئی آجائے۔ شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحداد (متوفی ۸۰۰ھ) الجوہرۃ النیرہ میں فرماتے ہیں:

"قولہ ملکاً تاماً یحترز من ملك المکاتب والمدیون والمبیع قبل القبض لأن الملك التام ھو ما اجتمع فیہ الملك والید واما اذا وجد الملك دون الید کملك المبیع قبل القبض والصداق قبل القبض أو وجد الید دون الملك کملك المکاتب و المدیون لاتجب فیہ الزکاۃ"[2]

ملک تام کی قید سے مکاتب اور مدیون کا مال خارج ہوجائے گا، نیز وہ فروخت شدہ سامان جس پر قبضہ نہ ہوا ہو، کیوں کہ ملک تام اسے کہتے ہیں جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں اکٹھا ہوں، چنانچہ اگر ملکیت تو ہو لیکن قبضہ نہ ہو جیسے کہ مبیع قبل القبض اور عورت کا وہ دین مہر جس پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہے یا قبضہ ہوا ور ملکیت نہ ہو مثلاً مکاتب کا مال اور مدیون کا دین جو کسی کا اس کے ذمہ ہے، ان سب میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔"

قبضہ و تصرف میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مال مقدور الانتفاع ہو بایں معنی کہ اس شئی پر بالفعل قبضہ و تصرف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کوئی چیز بالفعل قبضہ میں نہ ہونے کے باوجود بھی مالک کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو تب بھی کہا جائے گا کہ اسے ملکیت تام حاصل ہے۔

ملک العلماء علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

ومنھا الملك المطلق وھو أن یکون مملوکاً لہ رقبۃ ویداً وھذا قول اصحابنا الثلاثۃ وقال زفر والشافعی الید لیست بشرط فلا تجب الزکاۃ فی مال الضمار عندنا خلافاً لھما .... ثم قال تعلیلاً

---

(۱) شخص حقیقی اور شخص اعتباری کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) الجوھرۃ النیرۃ : ۱/۱۳۴

لهذا الحكم ولأن المال إذا لم يكن مقدور الانتفاع به في حق المالك لا يكون المالك به غنيا ولا زكاة على غير الغني........ ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به في حقه بيد نائبه..... وكذا الدين المقر به إذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول اليه"(۱)

منجملہ شرائط ملک تام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات اور قبضہ ہر دو اعتبار سے اس کا مملوک ہو یہی ہمارے تینوں ائمہ کا مذہب ہے۔ امام زفر و شافعی کے نزدیک قبضہ شرط نہیں چنانچہ مال ضمار میں ہمارے نزدیک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی برخلاف ان کے۔ آگے اس حکم کی علت بتلاتے ہیں کہ مال جب مالک کے حق میں مقدور الانتفاع نہ ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ غنی نہ ہوگا اور غیر غنی پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ آگے فرماتے ہیں، مسافر کا مال جو اس کے گھر ہے اس کے حق میں مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کا قائم مقام اس پر قابض ہے۔ آگے فرماتے ہیں اسی طرح وہ دین جس کا اقرار کر لیا گیا ہو اور اقرار کرنے والا مال مشول کرتا ہو، وہ بھی مقدور الانتفاع ہے کہ اس تک پہونچنا ممکن ہے۔

اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ مبیع قبل القبض (وہ عین جو بیع مکمل ہو کر خریدار کی ملک بن چکی ہے لیکن ابھی تک بائع کے قبضہ میں ہے) اور جملہ دیون جو کسی کے ذمہ واجب الاداء ہوں خواہ قرض ہو یا عورت کا مہر یا تلف کی ہوئی شئی کا ضمان یا زخم کا تاوان سب کی زکوٰۃ مالک پر عائد ہونی چاہیے۔ اگرچہ ادائے گی فی الحال واجب نہ سہی لیکن قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔ صاحبین کا یہی مسلک ہے۔

صاحب بدائع فرماتے ہیں:

" وقال ابو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوية تجب الزكاة فيها قبل القبض إلا الدية على العاقلة ومال الكتابة فانه لا تجب الزكاة فيها اصلا ما لم تقبض ويحول عليها الحول وجه قولهما ان ما سوى بدل الكتابة والدية على العاقلة ملك صاحب الدين ملكاً

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۹، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، پاکستان

مطلقاً رقبة ویداً التمکنه من القبض بقبض بدله وهو العین تجب فیه الزکاة کسائر الأعیان المملوکة ملکاً مطلقاً إلا أنه لا یخاطب بالأداء للحال لأنه لیس فی یده حقیقة فإذا حصل فی یده یخاطب بأداء الزکاة قدر المقبوض کما هو مذهبهما فی العین فیما زاد علی النصاب بخلاف الدیة وبدل الکتابة لأن ذلك لیس بملك مطلق بل هو ملك ناقص علی ما بینا ۔ والله اعلم ۔ (۱)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دیون کے سلسلہ میں اتنا عموم نہیں ہے جو صاحبین کے نزدیک ہے۔ بلکہ آپ دیون کی تین قسمیں قرار دے کر صرف ایک قسم میں قبضہ سے پہلے وجوب زکوٰۃ کی تصریح فرماتے ہیں اور وہ دین قوی ہے جس کی ادائے گی کم از کم خمس نصاب (نصاب کا پانچواں حصہ) پر قبضہ کرنے کے بعد عمل میں آئے گی بقیہ دو قسمیں دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے مطابق دین وسط میں قبضہ کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور قبضہ سے پہلے ان پر گزرے ہوئے ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، دین قوی آدمی کا وہ بقایا ہے جو کسی نے قرض کے طور پر لیا ہو یا کسی سامان تجارت کے عوض کسی شخص پر لازم الادا ہو، اور دین وسط وہ بقایا ہے جو سامان تجارت کے علاوہ اشیا، ضروریہ کے عوض پر لازم ہو، مثلاً اپنا خدمت کا غلام بیچا جس کی قیمت وصول نہ ہوئی یا استعمالی کپڑوں اور رہائش کے گھر کی قیمت جو وصول نہ ہو سکی۔ اور دین ضعیف وہ بقایا جو سرے سے کسی شئی کے عوض میں نہ ہو، مثلاً وہ دین جو وراثت یا اس کے حق میں وصیت کی وجہ سے اس کی ملک بن جائے یا ایسی شئی کا عوض جو از قبیل اموال نہیں ہے جیسے عورت کا دین مہر اور مرد کا دین خلع وغیرہ۔(۲) دیون کے سلسلہ میں آج تک فتویٰ امام صاحبؒ ہی کے قول پر دیا جاتا ہے کیوں کہ اسی میں لوگوں کی سہولت ہے۔

اب آئیے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

خریدکردہ مال تجارت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ

مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو کیا قیمت

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۰ (۲) بدائع الصنائع ۲/۱۰، الدر المختار علی ھامش رد المحتار ۲/۲۵، مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

جس پر بائع قبضہ کر چکا ہے اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی ؟ اس طرح مال جس پر عقد تام ہو چکا ہے لیکن قبضہ نہیں ہوا آیا اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی اگر ہوگی تو کس پر ؟ ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک تام کی جو حقیقت اوپر ذکر کی گئی ہے اس کی روشنی میں ثمن بائع کی ملک تام ہوگیا، لہٰذا سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ کا واجب الاداء ہونا یقینی ہے۔ البتہ مبیع قبل القبض کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہے۔ اگر صرف اس قدر دیکھا جائے کہ اس پر خریدار کو بالفعل ید اور تصرف حاصل نہیں ہے تو گویا اس پر خریدار کی ملکیت تام نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے جیسا کہ صاحب جوہرہ کی عبارت سے ظاہر ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت میں یہ مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کے عوض پر اسے قبضہ حاصل تھا اور عوض دے کر معوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے تو پھر یہ اس کا مملوک تام ہے جس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم الاداء ہونی چاہیے۔ فقہاء متاخرین کی عبارتیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم کی رائے وہی ہے جو دوسرے نمبر پر ذکر کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں :

"وقدمنا أن المبيع قبل القبض لاتجب زكاته على المشتري، وذكر في المحيط في بيان اقسام الدين أن المبيع قبل القبض لايكون نصابا لأن الملك فيه ناقص بافتقاد اليد والصحيح أنه يكون نصابا لأنه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليد على العوض فتعتبر يده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعًا فعلى هذا قولهم لاتجب الزكاة معناه قبل قبضه وأما بعد قبضه فتجب زكاته فيما مضى كالدين القوي" (۱)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ مبیع جس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوا ہو اس کی زکاۃ اس کے ذمہ لازم نہیں محیط میں اقسام دین کے ضمن میں لکھا ہے کہ مبیع قبل القبض کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے، جب کہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۸، ۲۰۹، ۲۰۳ - مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی، پاکستان ۔

تھا اور (ثمن دینے کے بعد) عوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے، لہذا تمکن شرعی کے اعتبار سے اس نصاب زکوٰۃ پر اس کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے گا۔ محیط کے اس بیان کی روشنی میں اب یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ فقہاء جو کہتے ہیں کہ زکاۃ واجب نہ ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ قبضے سے پہلے ادائے گی واجب نہیں، رہا قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الاداء رہے گی جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

علامہ ابن نجیم کے اس بیان سے تقریباً یہ منقح ہو چکا تھا کہ مبیع قبل القبض مقدور الانتفاع ہونے کی وجہ سے خریدار کی ملک تام ہے اور فقہاء کی عبارات "لا تجب فیه الزکوٰۃ" وغیرہ کی تاویل بھی یک گونہ ہو گئی تھی لیکن علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلے کی ایک ایک نظیر پیش فرما کر مسئلے کو مزید غور طلب بنا دیا اور ثابت کیا کہ واقعۃً اس کی زکوٰۃ خریدار کے ذمہ نہیں ہونی چاہیے۔ درمختار کی عبارت "فلا زکوۃ علی مکاتب لعدم الملك التام ولا فی کسب ماذون ولا فی مرهون بعد قبضه ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضه"(۱) کے تحت فرماتے ہیں:

"أما بعده فیزکیه عما مضی کما فهمه فی البحر من عبارۃ المحیط فراجعه لکن فی الخانیة رجل له سائمة اشتراها رجل للسامة ولم یقبضها حتی حال الحول ثم قبضها لا زکاۃ علی المشتری فیما مضی لأنها کانت مضمونة علی البائع بالثمن ومقتضی التعلیل عدم الفرق بین ما اشتراها للسیامة او للتجارۃ، فتأمل۔(۲)

بہرحال قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دے گا جیسا کہ بحر میں محیط کی عبارت سے سمجھا ہے، لیکن فتاویٰ خانیہ میں یہ جزئیہ ہے کہ ایک شخص کے کچھ مویشی تھے، جنھیں کسی شخص نے سیامت (سما) کی غرض سے خرید لیا اور قبضہ نہ کیا یہاں تک کہ بائع کے پاس ان پر سال گزر گیا تو خریدار پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ بائع کے پاس مضمون بالثمن تھے، اس تعلیل کا تقاضا یہ ہے کہ پھر تجارت کے سامانوں اور سیامت کے مویشیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، غور کرو۔

(۱-۲) الدر المختار و تعلیقاته - رد المحتار للشامی ۲/۶۔

علامہ شامی نے جس طرف توجہ مبذول فرمائی ہے وہ واقعی قابل غور ہے اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب مبیع بائع کے پاس مضمون بالثمن ہے تو وہ خریدار کی ملک تام نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر سامان ہلاک ہوجاتا ہے تو خریدار کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اگر ملکیت تام ہوتی تو بلا تعدی اس کے ہلاک ہونے سے خریدار کا مال ضائع ماناجاتا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی نظیر مسئلہ مرہون بھی بن سکتا ہے جسے علامہ شامی نے " ولا فی مرهون بعد قبضه" کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

" قلت لكن أرجع شيخ مشائخنا السائحاني الضمير في قول الشارح بعد قبضه إلى المرتهن ويؤيده أن عبارة البحر هكذا ومن موانع الوجوب الرهن إذا كان في يد المرتهن لعدم ملك اليد وليس فيها ما يدل على أنه لا يزكيه بعد الاسترداد لكن قال في الخانية: السائمة إذا غصبها ومنعها عن المالك وهو مقر ثم ردها عليه لا زكوٰة على المالك فيما مضى " (ردالمحتار ۲/۶)

ہماری نظر میں صاحب بحر کی تعلیل پر علامہ شامی کی تعلیل راجح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ محض تمکن شرعی کی وجہ سے اگر اس نصاب پر خریدار کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا مملوک تام ہونا لازم آئے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں ملک مشتری پر ہلاک ہو، جب کہ ایسا نہیں ہے، باقی اگر یہ کہا جائے کہ جب بائع کی ملکیت سے نکل گیا تو لازماً خریدار کی ملک تام ہوجانا چاہیے تو یہ کوئی ضروری نہیں کیونکہ مطلق ملکیت بائع سے ہٹ کر معلق رہ سکتی ہے تو تمام ملکیت بدرجہ اولیٰ معلق رہ سکتی ہے، جیسا کہ خیار شرط میں جب کہ خیار مشتری نے لیا ہو، مبیع بائع کی ملک سے نکل کر خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی۔

الحاصل یہ کہ اس مسئلہ میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جب کہ مبیع کی زکوٰۃ کسی کے ذمہ نہیں، بلکہ خریدار کے ذمہ اس وقت ہوگی جب اس پر قبضہ کرے اور اس پر سال گزر جائے، سابقہ سالوں کی زکوٰۃ نہ ہوگی۔

کرائے کی مد میں پیشگی رقم کی زکوٰۃ

کرائے کی مد میں جو پیشگی رقم دی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ محض زرِ ضمانت ہے

تاکہ کرایہ دار اگر کرائے کی ادائے گی میں نادہند واقع ہو ، تو اس رقم میں سے کرائے کی رقم وضع کرلی جائے گی، ورنہ اجارے کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس کردی جائے گی تو اس صورت میں یہ کرایہ دار کا مالک مکان پر دین ہوگا اور اس کی ادائے گی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس وقت لازم ہوگی جب اس رقم میں سے کم از کم خمس نصاب کے بقدر اسے واپس مل جائے اس وقت سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

لیکن اگر یہ پیشگی رقم بطور اجرت معجلہ کے ہے تو مالک مکان کی ملک ہوگئی اور سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ مالک کو دینی ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

" ذکر الشیخ الامام أبوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارة الطویلة التی تعارفہا أھل بخاری أن الزکاة فی الاجرة المعجلة تجب علی الآجر لأنہ ملکہ قبل الفسخ وان کان یلحقہ دین بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا أنہ یجب علی المستاجر ایضاً لانہ یعد ذلك مالاً موضوعاً عند الآجر"(۱)

اس عبارت کی روشنی میں مذکورالصدر دونوں صورتوں کا حل ہوسکتا ہے، کیوں کہ اول الذکر کرائے دار کا مالک کے پاس رکھا ہوا مال ہے اور ثانی مالک کی ملکیت تامہ۔

مدارس وغیرہ کے سرمایہ میں زکوٰۃ

جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ یہ رقم اگر وقف ہے تو ملکیت کا نہ ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ وقف نہیں تو کسی شخص حقیقی کی ملک بھی قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ منتظم ادارہ کے اس پر قبضہ کرلینے کے بعد وہ معطی کی ملکیت سے نکل تو جاتی ہے مگر جب تک کسی مصرف پر خرچ نہیں ہوجاتی اس کی ملکیت موقوف رہتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کی بابت وقف کا حکم رکھتی ہے۔

" ولا زکاة فی المال الموقوف لعدم الملك"(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۶ (۲) الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۱/۵۹۲

"واما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها الملك فلاتجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لأن في الزكاة تمليكا والتمليك في غير الملك لايتصور" (١)

البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جیسا کہ بعض صورتوں میں فقہاء بربنائے ضرورت شخصِ اعتباری یا شخص قانونی کا اعتبار کرکے اس پر وہ احکام جاری کرتے ہیں جو اصلاً شخصِ حقیقی پر ہونے چاہئیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ مدارس اور اداروں کو شخصِ اعتباری مان کر یہ رقمیں ان کی ملک قرار دی جائیں اور پھر ان پر وجوبِ زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے؟

اس سلسلہ میں ہمارے ناقص خیال میں جو بات آتی ہے وہ یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مدارس اور اداروں کو بعض حالات میں شخصِ اعتباری قرار دینا ناگزیر ہو جاتا ہے، مثلاً یہی کہ اگر مہتمم سے بلاتعدی مذکورہ رقوم ضائع ہو جائیں یا ادارے کی مصالح میں کسی عقد و معاملہ کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا ضمان مہتمم پر نہیں ہوتا بلکہ اس شخصِ اعتباری "ادارے" پر ہوتا ہے، جس کی مصلحت کی رعایت میں نقصان ہوا ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

لیکن شخصِ اعتباری مان لینے کے باوجود مسئلہ وجوبِ زکوٰۃ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ ایک خالص عبادت ہے اور محض حق اللہ جو ہر عاقل بالغ مسلم پر بہ چند شرائط فرضِ عین ہے، حقوق العباد اس سے وابستہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ حقوق العباد کی ادائے گی کی حد تک تو شخصِ قانونی کو معتبر ماننے کی ضرورت داعی ہے تاکہ اس سے متعلق کسی بندے کا حق ضائع نہ ہو اور کما حقہٗ اس کا حق مل سکے اور قاعدہ ہے "الضرورات تقدر بقدرها"۔

البتہ وقت کے بعض فقہاء کے خیال میں وقف زمین کی زرعی پیداوار پر حنفیہ کے نزدیک جو عشر واجب ہے اس کو زکوٰۃ کے معاملہ میں شخصِ قانونی کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے(٢)، لیکن یہ خیال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ فقہاء اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ عشر و خراج کے وجوب کا تعلق مالک سے سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ زرعی زمین کا محصول اور لگان ہے جو فقیر بندوں کا حق ہے چاہے زمین کسی کی ملک ہو یا نہ ہو

---

(١) بدائع ٩/٢ (٢) مولانا محمد تقی عثمانی، درس ترمذی ٣٢٥/٢

حتیٰ کہ ایسا مالک جس میں شرائط وجوب نہ پائی جائیں اس کی زمین پر بھی عشر واجب ہوتا ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں تصریح ملتی ہے۔

"ولایمنع الدین وجوب عشر وخراج لأنها مؤونة الأرض النامية وقال الشامي حتى يجب في الأرض الموقوفة والمكاتب" (۱)

"وفيه إشارة إلى أنه لا يلتفت إلى المالك سواء كان بالغاً أو صبياً أومجنوناً أو عبداً أو كانت الارض وقفا على الرباطات أو المساجد أو المدارس" (۲)

شیخ عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ بچوں اور پاگلوں کے مال میں صرف اس وجہ سے واجب نہیں کہ یہ ایک خالص عبادت ہے برخلاف عشر اور صدقۂ فطر کے کہ یہ ملحق بحقوق العباد ہیں۔

"الحنفية قالوا لاتجب الزكاة في مال الصبي والمجنون ولايطالب وليهما باخراجها من مالهما لأنها عبادة محضة والصبي والمجنون لايخاطبان بها وانما وجب في مالهما الغرامات والنفقات لانهما من حقوق العباد ووجب في مالهما العشر وصدقة الفطر لان فيهما معنى المؤنة فالتحقا بحقوق العباد" (۳)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقف کی زرعی پیداوار میں عشر "مؤنۃ ارض" ہونے کے باعث واجب ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی ناظر ومتولی اس شخص اعتباری (وقف) کا قائم مقام ہو کر ادا کرتا ہے، گویا وجوب عشر اور اس کی ادائیگی چوں کہ حق العبد ہے اس لیے اس میں شخص اعتباری کا نظریہ مجبوری ہے، برخلاف زکوٰۃ کے جو خالص عبادت ہے۔

---

(۱) الدر المختار و رد المحتار ۲/۹

(۲) الجوهرة ۱/۱۵۳

(۳) الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۱۹۱

مال حرام کی زکوٰۃ

حرام طریقہ سے جو مال کسی شخص کے قبضہ میں آتا ہے اس پر قیام ملک کا تحقق نہیں ہوتا بلکہ اس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو تو اس تک واپسی لازم ہے ورنہ بلا نیت ثواب واجب التصدق ہے۔ محض قبضہ قیام ملک کے لیے کافی نہیں، اس لیے ایسے مال میں خواہ قابض کے پاس سال بھر رہ جائے اور بقدر نصاب بھی ہو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

لوكان الخبيث نصاباً لايلزمه الزكاة لأن الكل واجب التصدق عليه ....إلى قوله ويجب عليه تفريغ ذمته برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء"(۱)

لیکن اگر حرام مال حلال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ باہم تمیز مشکل ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ استہلاک کی وجہ سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا، البتہ جس قدر مال حرام تھا اتنے کا اس کے مالکین کے لیے مدیون ہو جائے گا، اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے یا تو اس کے پاس اس مخلوط مال سے علیحدہ کوئی نصاب مالی جس میں زکوٰۃ فرض ہو موجود ہو تاکہ اس سے دین کی ادائیگی ہو سکے یا ان اموال حرام کے مالکین معاف کر دیں۔ ثانی الذکر صورت میں جس قدر اس کے پاس مال موجود ہے، سب کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور اول الذکر میں حرام مال کی مقدار جو اس کے ذمہ دین ہے وضع کرنے کے بعد باقی ماندہ اگر بہ قدر نصاب ہو تو زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں۔ محقق ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"وبالجملة فوجوب الزكاة عليه مقيد بما إذا أبرأه الغرماء أوبما إذا كان له مال يوفي دينه وإلا فلا وبه يندفع الإشكال لكن لابد أن يكون معه نصاب زائد على مايوفي دينه لأن ما كان مشغولاً بالدين لازكاة فيه وإنما يزكي مازاد عليه إذا بلغ نصاباً كما تفيده عبارة السعدية."(۲)

در مختار میں بھی نہر کے حوالے سے نقل کیا ہے:

---

(۱) منحة الخالق على هامش البحر الرائق ۲/۲۰۵ (۲) ايضا تحت قوله "وهو قيد حسن".

وهذا إذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه وإلا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما في النهر عن الحواشي السعدية "(۱)

دین کی زکوٰۃ

دین (الیسا بقایا جو ذمہ پر ہوتا ہے) کی زکوٰۃ مدیون پر واجب نہ ہونا تو ظاہر ہے کیوں کہ محض قبضہ مفید ملک نہیں ہوتا۔

" أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة " (۲)

رہا دائن (جس کا بقایا ہے) کے ذمہ واجب ہونا تو ملک تام کی تشریح کے ذیل میں آچکا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جس قسم کا دین ہے اسی کے مطابق حکم ہوگا، گویا دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے بموجب دین وسط میں وجوب زکوٰۃ قبضہ کے بعد حولان حول پر متعلق ہوگا الا یہ کہ اس کے پاس پہلے سے اسی جنس کا نصاب موجود ہو جس کے ساتھ مل کر اس کی بھی زکوٰۃ حولان حول سے قبل دینی پڑے گی۔

دین قوی (مال تجارت کا بدل جو مدیون کے ذمہ اس کے اقرار یا بینہ سے ثابت ہو) میں زکوٰۃ کا وجوب فی الحال (قبضہ سے قبل) متعلق ہوتا ہے، البتہ ادائے گی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ ہو جانے تک موقوف رہتی ہے اور قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء رہتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں فقہا، اس صورت کا حکم بھی یہی لکھتے ہیں کہ اگر مدیون باوجود دین کی ادائگی پر قدرت کے ٹال مٹول کرتا ہو تب بھی دائن پر ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ اصولی اعتبار سے یہ دین قوی ہے۔

" وكذا الدين المقر به إذا كان المقر مليئا فهو ممكن الوصول إليه " (۳)

لیکن علامہ شامی مصارف الزکوٰۃ کے باب میں درمختار کی عبارت " ومنه ما لو كان ماله

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۲/۲۵ (۲) الجوهرة ۱/۱۳۴ (۳) بدائع الصنائع ۲/۹

سؤجلاً أو على غائب أو معسراً وجاحد ولوله بينه في الأصح" کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

"قلت وقدمنا أول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتي إلى

هذا وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملائته لا يقدر الدائن

على تخلصه منه فهو بمنزلة العدم" (۱)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے علامہ شامی کی اسی ترجیح پر اعتماد ظاہر فرمایا ہے، چنانچہ آپ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ نادہندہ مقروض کا قرضہ دین قوی نہیں اس لیے وصولیابی کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

" ومتمسكي فيه ما في رد المحتار الخ" (۲)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ جو ملازم کی ماہانہ یافت میں سے سرکار یا پرائیویٹ کمپنیز لازماً وضع کر کے رکھتی ہیں اور ختم ملازمت پر اضافہ کے ساتھ اس کو واپس کرتی ہیں، تقریباً حال اور ماضی کے علماء کرام کا اتفاق ہے کہ یہ رقم دین ضعیف یا دین وسط کے تحت آتی ہے اور صحیح ترین روایت کے بموجب ان دونوں میں قبضہ کے بعد سے سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اس سلسلہ میں دو متضاد فتوے صادر ہوئے تھے، ایک میں دین قوی قرار دے کر گزشتہ کی زکوٰۃ واجب قرار دی گئی تھی، دوسرے میں دین وسط یا ضعیف قرار دے کر قبضہ کے بعد تمامیت سال پر وجوب زکوٰۃ ثابت کیا گیا تھا۔ حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ نے اس تعارض کو دفع کرانے کی غرض سے ایک تحقیقی استفتاء حضرت سے کیا جس میں بدائع، بحر اور منحۃ الخالق کی عبارات کی روشنی میں حضرت کے دوسرے فتوے کی تصویب چاہی گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

" الغرض پراویڈنٹ کا روپیہ دین قوی میں تو داخل ہو نہیں سکتا، کیونکہ وہ معاوضہ کسی مال تجارت کا نہیں، بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت

---

(۱) الدر المختار ورد المحتار ۶۲/۲ (۲) امداد الفتاویٰ مبوب ۳۵/۲

پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس پیچ کو بھی مان لیں تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس تحقیق سے اتفاق ظاہر فرماتے ہوئے لکھا:

"آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے، لہٰذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں۔" (۱)

چنانچہ اسی کے مطابق مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی عبدالرحیم صاحب، مفتی محمود الحسن صاحب اور مفتی نظام الدین صاحب وغیرہم کے فتاویٰ موجود ہیں۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کا مکلف شخص حقیقی ہے جو تکلفات شرعیہ کا اصل ہو، لہٰذا چند شرکاء کے مشترکہ کاروبار سے جو ایک شخص اعتباری کا تصور پیدا ہوتا ہے (کمپنی) اس کے ساتھ فریضہ زکوٰۃ وابستہ نہیں بلکہ کمپنی کے جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب ہیں صرف ان پر ان کے حصوں کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر شرکاء کی تعداد اتنی بڑی ہے، یا مشترکہ مال کی مقدار اتنی کم ہے کہ شرکاء پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنے پر ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب نہیں بچتا تو کسی پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ کمپنی کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہو۔ الاّ یہ کہ کسی شریک کے پاس اپنا کوئی نصاب شرعی موجود ہو جس کی زکوٰۃ لازم الادا ہو تو اس کے ساتھ وہ کمپنی میں سے اپنے حصۂ مالیت کی بھی زکوٰۃ نکالے گا۔ کمپنی بہ حیثیت کمپنی پر زکوٰۃ دو وجہ سے نہیں ہے۔ اوّلاً اس لیے نہیں کہ وہ شخص حقیقی مکلف نہیں، ثانیاً اس وجہ سے نہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک مخصوص نصاب کی شرط ضروری ہے جس کا مدار مالکین کے لیے سہولت اور آسانی مہیا کرنے پر ہے، لہٰذا سہولت اسی میں ہے کہ وہ نصاب شخص واحد ہی کا ہو، متعدد اشخاص کا مشترک نہ ہو، متعدد اشخاص کی ملک سے کوئی نصاب بن گیا جس کی وجہ سے سب پر بقدر حصص زکوٰۃ واجب ہوگئی تو یہ اس علت فقہی کے منافی ہوگا۔ لہٰذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ مشترکہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ جلد ۲، ص ۴۴ تا ۵۰ میں حضرت تھانوی رحمہ کے دونوں فتوے، مفتی صاحب کا تحقیقی استفسار اور حضرت کی تصویب ملاحظہ کی جائے۔

نصاب پر زکوٰۃ نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابن رشدؒ اپنی بدایۃ المجتہد میں مسئلہ مذکور میں اختلاف ائمہ کے ذیل میں اس علت فقہی پر زور دیتے ہوئے مالکیہ اور احناف کی وکالت میں رقم طراز ہیں:

" اما المسئلة الرابعة فان عند مالك وابي حنيفة أن الشريكين ليس يجب على احد هما زكوٰة حتى يكون لكل واحد منهما نصاب(۱) وعند الشافعي أن المشترك حكمه حكم مال رجل واحد وسبب إختلافهم الاجماع الذي في قوله عليه السلام ليس فيما دون خمس أوراق من الورق صدقة فإن هذا القدر يمكن أن يفهم منه أنه انما يخصه هذا الحكم لمالك واحد أو أكثر من مالك واحد إلا أنه لما كان مفهوم إشتراط النصاب انما هو الرفق فواجب أن يكون النصاب من شرطه أن يكون لمالك واحد وهو الأظهر" (۲)

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کسی بھی تجارتی کمپنی کے شیئرز خرید لینا درحقیقت اس کمپنی میں اس شیئر (حصہ) کے بقدر شرکت حاصل کرنا ہے اور خریدار اپنے حصہ (مثلاً ہزارویں) کے بقدر کمپنی کے پورے اثاثے، عمارت، تیار شدہ وخام مال تجارت اور نقد روپیوں میں شریک ہوجاتا ہے اور جوں جوں کمپنی ترقی کرتی رہے گی اس کے حصے کے تناسب سے سرمایہ کی مقدار بھی بڑھتی رہے گی، لہٰذا اصل ضابطے کی رو سے ہونا یہ چاہیے کہ حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی رقم کا جتنا حصہ کمپنی کی عمارت، آلات حرفت وغیرہ غیر نامی اثاثوں میں لگا ہوا ہے اس کی تو زکوٰۃ لازم نہ ہو اور جتنا سامان تجارت یا نقد کی صورت میں موجود ہے اگر بقدر نصاب ہے تو اس کی زکوٰۃ لازم ہو، اور ادائے گی زکوٰۃ کے سلسلہ میں نہ تو شیئر کی بنیادی قیمت سے تعلق ہوگا، جس کے عوض اس نے شیئر خریدا ہے اور نہ ہی ادائے گی یا وجوب کے وقت شیئر کے بازاری نرخ سے، کیوں کہ شیئر بذات خود کوئی مال متقوم نہیں ہے کہ اسے تجارتی سرمایہ

---

(۱) یہ صرف مالکیہ کا مسلک ہے، احناف کے نزدیک کسی ایک کا بھی حصہ اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ "فان بلغ نصيب أحدهما نصاباً زكاه دون الآخر۔ الدر المختار ۲/۳۵ (۲) بداية المجتهد ۱/۲۵۸

قرار دیا جائے بلکہ یہ ایک اضافی شئی ہے جو اپنے مضاف الیہ کے اعتبار سے معنی خیز بنتی ہے، جیسے دکان کا حصہ، مکان کا حصہ وغیرہ، اسی طرح یہاں مشترک تجارت کا حصہ، چنانچہ اس مشترکہ تجارت میں ہر شریک کا جتنا حصہ ہے وہی اس کا اپنا مال ہے جس پر زکوٰۃ کا حکم حسب شرائط عائد ہوگا اسی طرح ہر شریک کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ اپنے حصہ کا مال کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے۔ (۱)

گویا ہر شریک کو کمپنی سے یہ تفصیل دریافت کرنی ضروری ہوگی کہ اس کے سرمایہ کی کل مقدار کیا ہے؟ کتنا حصہ نامی اثاثوں کی شکل میں ہے؟ اور کتنا غیر نامی کی شکل میں؟ تاکہ وہ اپنی زکوٰۃ کا حساب صحیح طور پر لگا سکے۔ اگر تفصیل اسے کمپنی کی طرف سے موصول ہوجائے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرورۃً اس وقت بازار میں شیئر کا جو نرخ ہو اسی کے ذریعہ مالیت کا تعین کیا جائے گا، اس لیے کہ اغلب یہی ہے کہ بازاری قیمت کے مقابلہ میں شیئر کی وہ مقدار جو نامی ہے کم ہے اور شیئر کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اصل مالیت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کے تابع ہوتا ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ مارکیٹ کی قیمت معیار مالیت قرار دی جائے۔ (۲)

"بونڈس" حقیقت میں اس کے خریدار کی طرف سے حکومت یا کمپنی کو قرض دینا ہے جس کا سارٹیفکٹ اس کے پاس موجود ہے، ظاہر ہے کہ مدت کے اختتام پر اصل رقم کے ساتھ جو منافع ملتا ہے یقیناً ربوٰ ہے اور اصل رقم بمنزلہ دین قوی ہے، جس کی زکوٰۃ لازم ہے اور ادائے گی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ کرنے کے بعد سابقہ سالوں کی بھی ہوگی۔

دوسری شرط "نما" حقیقت اور اقسام

وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا ضروری ہے، نما کی حقیقت بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ شرعی اعتبار سے نما کے تحقق کی دو صورتیں ہیں؛

(۱) **حقیقی**:۔ جانوروں (سوائم) میں بالفعل توالد و تناسل کے ذریعہ اور دوسرے مالوں میں بالفعل تجارت کے ذریعہ اضافہ ہو رہا ہو۔

---

(۱) یہاں ان علمی اشکالات سے بحث نہیں جو شیئرز کی خرید و فروخت کی بابت پیدا ہوتے ہیں، ان کا کافی وشافی حل حضرت تھانویؒ کے رسالہ "القصص السنی" میں ملاحظہ کیا جائے۔ (۲) مستفاد از رسالہ "القصص السنی"۔ امداد الفتاوی ۴/۴۸۶ تا ۵۱۲۔

(۲) تقدیری :- بالفعل اضافہ تو نہ ہورہا ہو، البتہ یہ ممکن ہو کہ مالک اگر چاہے تو اس میں زیادتی اور اضافہ کی شکل پیدا کرسکتا ہے بایں طور کہ مال خود اس کے قبضہ میں ہے یا اس کے قائم کے قبضہ میں۔ مثلاً مسافر کا مال جو اس کے وطن میں ہے۔(۱)

پھر نماء تقدیری کی بھی دو قسمیں نکلتی ہیں۔ خلقی اور فعلی۔

(۱) خلقی :- اس کا مصداق نقدین (سونا اور چاندی) ہیں جو فطری طور پر جملہ حوائج بشری کی تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں اور خلقۃً نامی ہیں اس لیے بندوں کی طرف سے نیت کرکے قابل تجارت بنانے کے محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ بقدر نصاب موجود رہنے پر ان میں لازماً زکوٰۃ فرض ہوگی، خواہ تجارت کی نیت سے رکھے گئے ہوں یا کوئی نیت نہ ہو یا اپنے ضروریؔ استعمال میں لانے کی نیت ہو۔

(۲) فعلی :- نقدین کے علاوہ بھی اموال میں نماء فعلی ہوتا ہے۔ بایں معنیٰ کہ نماء کی نیت کرنا ضروری ہوتا ہے جانوروں میں اگر یہ نیت کرلی گئی کہ سال کا اکثر حصہ چراکر ان کی افزائش نسل عمل میں لائی جائے گی، جسے سیامت کہتے ہیں یا سامانوں میں یہ نیت کرلی گئی کہ تجارت کرکے اس میں اضافہ کیا جائے گا تو نماء تقدیری کا تحقق ہوگیا اگرچہ بالفعل ان میں اضافہ نہ ہوسکے۔

البتہ اسامت یا تجارت کی نیت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ فعل تجارت یا فعل اسامت کے ساتھ نیت پائی جائے ورنہ نیت معتبر نہ ہوگی، خواہ تجارت کی نیت صراحۃً ہو یا دلالۃً تجارت کی نیت صریح کی مثال مثلاً عقد معاملہ کرتے وقت یہ نیت کرے کہ میں اس عقد سے جس شئی کا مالک ہورہا ہوں اس کو تجارت میں لگاکر نفع کماؤں گا، چاہے یہ معاملہ خریداری کا ہو یا اجارے کا، ثمن چاہے نقدین کے قبیل سے ہو یا عروض (سامانوں) کے قبیل سے۔ لیکن اگر اپنے استعمال میں لانے کی نیت ہو یا کوئی شئی اس کی ملکیت میں بغیر کسی عقد و اجارہ کا معاملہ کیے آجائے جیسے وراثت کا مال یا عقد معاملہ کے نتیجہ میں آئے لیکن اس میں "مبادلۃ المال بالمال" کی حقیقت مفقود ہو جیسے ہبہ، صدقہ، وصیت یا مہر کے طور پر ملکیت میں کوئی مال آجائے تو اس قسم کے مملوکہ اموال سامان تجارت نہ ہوں گے حتیٰ کہ بعد میں بھی تجارت کی نیت کرنا مفید نہ ہوگا الا یہ کہ تجارت کی نیت سے کوئی عملی اقدام کر ڈالے۔

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۶ و ردالمحتار ۲/۶

اور دلالۃً نیت تجارت کی مثال یہ ہے کہ کوئی سامان ایسے سامان کے عوض خریدے جو اس کے پاس پہلے سے تجارت ہی کے لیے رکھا ہوا تھا یا اپنے اس گھر کو جو تجارت کے واسطے تھا کسی سامان کے عوض کرائے پر دے دیا تو ان صورتوں میں اگرچہ صراحۃً تجارت کی نیت نہ بھی کرے تب بھی جس سامان کا مالک ہوگا وہ عروض تجارت کے حکم میں ہوگا۔ (۱)

اب آئیے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا الگ سے جائزہ لیتے ہیں۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارتی سامان چوں کہ نامی ہیں اس لیے ان کی زکوٰۃ فرض ہے اور مالیت کا حساب بازاری نرخ سے لگایا جائے گا، اصل لاگت سے کوئی مطلب نہیں۔ صاحبین کے نزدیک ادائے گی کے دن جو بازار میں قیمت ہوگی، اس کے حساب سے مالیت کا تعین ہوگا اور امام صاحب کے نزدیک جس دن سال پورا ہوا تھا اس روز کی بازاری قیمت معیار قرار دی جائے گی۔

”و تعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعًا وهو الأصح ویقوم فی البلد الذی المال فیه“ (۲)

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے صاحبین کی رائے کو ترجیح دیا ہے۔

” اگر نقصان قیمت میں ہے یا نفع اس قیمت کی زکوٰۃ دیوے جو دینے کے روز اسباب تجارت کی قیمت ہے۔“ (۳)

رہی بات تھوک اور پھٹکر کی تو جیسا اس کا کاروبار ہوتا ہو، بایں طور کہ تھوک خریداری اور تھوک ہی فروختگی ہوتی ہو تو معیار تھوک قیمت ہوگی، ورنہ پھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا۔

اراضی تجارت کی زکوٰۃ

اموال تجارت میں وجوب زکوٰۃ کا جو کلی ضابطہ فقہاء بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ:

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۱۰-۲۰۹، رد المحتار ۲/۱۴، الدر المختار وشرحه رد المحتار ۲/۱۴ (۲) الدر المختار ۲/۲۲، البحر الرائق ۲/۲۲۱ (۳) تذکرۃ الرشید ۱/۱۸۶

" أن ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكی بنية التجارة بشرط عدم المانع المؤدی إلی الثنی " (۱)

یعنی نقدین اور سوائم کے علادہ میں زکوٰۃ تجارت کی نیت سے واجب ہوتی ہے بشرطیکہ نیت کی وجہ سے وجوب زکوٰۃ کی صورت میں ایک ہی مال میں دو مرتبہ زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہو، چنانچہ کبھی ایسا ہوجائے تو نیت تجارت کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مثلاً :

" خراجی یا عشری زمین تجارت کی نیت سے خرید کر اس میں کاشت کاری کیا یا تجارت کی نیت سے بیج خرید کر بو دیا تو اس صورت میں صرف عشر یا خراج واجب ہوگا، زمین یا بیج کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔"

لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہوگا، جب کہ اس زمین کی بوائی کر دی جائے نیز اس کا عشری یا خراجی ہونا معلوم ہو، دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کے وقت یہ حکم نہ ہوگا، مثلاً تجارت کی نیت سے عشری یا خراجی زمین خریدا اور بوائی نہیں کی یا اس زمین کا سرے سے عشری یا خراجی ہونا معلوم نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر ہندوستان کی زمینوں کا یہی حال ہے تو بلاشبہ یہ اراضی اموال تجارت ہوں گی، اور ان کی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ان کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات جو تجارت کی غرض سے رکھے ہوں ان پر نامی ہونے کے باعث زکوٰۃ لازماً ہوگی، باقی اس مقصد سے ان کا ذخیرہ کیا گیا ہو کہ انکم ٹیکس یا دیگر سرکاری قوانین کی زد سے محفوظ رہیں گے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں خواہ ان کی مالیت لاکھوں کی ہو، زیادہ سے زیادہ ان کے حوائج اصلیہ سے زائد ہونے کی وجہ سے حرمت زکوٰۃ، وجوب صدقۂ فطر اور وجوب قربانی وغیرہ احکام آئیں گے۔ البتہ ہیرے جواہرات کا ذخیرہ کرنے والوں کی نیت اگر حکم شرعی (زکوٰۃ) سے فرار اختیار کرنی ہو تو گناہ گار ہوں گے لیکن اس صورت میں بھی زکوٰۃ ان پر واجب نہ ہوگی۔

---

(۱) الدر المختار ۲/۱۴

"لازکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وإن ساوت ألفاً إتفاقاً إلا أن تکون للتجارۃ"(۱)

یہی حکم ان جواہرات کا بھی ہے جو تزئین اور آرائش کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ ان کے متعلق حاجتِ اصلیہ کے تحت شامل ہونے نہ ہونے ہی میں فقہا، کا اختلاف ہے اگرچہ صحیح یہی ہے کہ ایسے قیمتی اثاثے جن کا مقصد محض تزیین ہو، تحقق غنا کے لیے کافی ہیں، لیکن حرمت زکوٰۃ وغیرہ کی حد تک نہ کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں۔

تیسری شرط۔ حاجاتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجاتِ اصلیہ: تعریف اور دائرہ

تیسری شرط مال کا حاجتِ اصلیہ (بنیادی ضرورت) سے زائد ہونا ہے۔ حاجت اصلیہ کی تعریف فقہاء یوں کرتے ہیں:

"ما یدفع الهلاك عن الانسان تحقیقاً أو تقدیراً۔ (۲)

حاجت اصلیہ ہر اس ضرورت کو کہتے ہیں جس کا استعمال انسان کو ہلاکت سے بچائے خواہ یہ ہلاکت سے بچانا حقیقۃً ہو یا حکماً، پھر ہر دو کی تشریح کرتے ہیں:

"فالثانی کالدین والأول کالنفقة ودور السکنی وآلات الحرب والثیاب المحتاج الیها لدفع الحر والبرد وکآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الرکوب وکتب العلم لاهلها۔ (۳)

تقدیراً ہلاکت سے بچانے والی ضرورت مثلاً دین ہے کہ اگر کسی شخص کا بقایا اس کے ذمہ ہو، اور ادائے گی نہ کرے تو ذلت اٹھانی پڑے گی جو ہلاکت کے مرادف ہے، بلکہ اس کی وجہ سے قید بھی ہو سکتا ہے لہٰذا دین کی ادائے گی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اپنی ذلت سے ضرر کا دفعیہ، بلکہ یہ ضرورت دوسری ضروریات کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔

حقیقۃً ہلاکت سے بچانے والی ضروریات میں رہائش کا گھر، ہتھیار، استعمالی کپڑے جو سردی اور

---

(۱) الدر المختار ۲/۱۴ (۲) البحر الرائق ۲/۲۰۶، الدر المختار ۲/۶ (۳) البحر ۲/۲۰۶

گرمی سے دفاع کے لیے رکھے جائیں، گھر کے استعمالی سازوسامان، سواری کا جانور اہل علم کے لیے کتابیں وغیرہ۔

ضرورت کے تحت رکھے ہوئے نقد کی زکوٰۃ

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے نقد رقم اپنی واقعی اور بنیادی ضرورت کی خاطر جمع کر رکھی ہے مثلاً رہائش کا گھر نہیں ہے وہ اس سے گھر خریدنا چاہتا ہے، کپڑے بنوانے ہیں۔ ابھی ان ضرورتوں کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی کہ اس سے پہلے اس پر سال پورا ہو جاتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ذمہ پر واجب ہوگی؟ یا یہ رقم حاجتِ اصلیہ میں شمار کی جائے گی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم شرح المجمع لابن الملک سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاذا كان له دراهم مستحقة ليصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة اهـ فقد صرح بأن من معه دراهم وامسكها بنية صرفها إحاجته الاصلية لاتجب الزكاة إذا حال الحول وهي عنده ويخالفه مافي معراج الدراية في فصل زكوٰة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيف ما أمسكه للنماء أو للنفقة اهـ وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري" (۱)

جب کسی کے پاس کسی ضرورت کے پیش نظر کچھ دراہم موجود ہوں جو اس ضرورت میں خرچ ہونے ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابن الملک نے اس کی صراحت کر دی کہ بنیادی ضرورتوں میں خرچ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے دراہم میں خواہ ان پر سال گزر جائے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب کہ معراج الدرایہ کی فصل زکوٰۃ العروض میں اس کے خلاف ہے کہ نقد میں بہر حال زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، نماء (تجارت) کے لیے رکھا ہو یا خرچ کے لیے۔ اسی طرح بدائع میں نماء تقدیری کے تحت بھی مذکور ہے۔

علامہ شامی نے دونوں میں بڑی اچھی تطبیق پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بدائع اور معراج الدرایہ وغیرہ کے بیان کا محمل یہ ہوگا کہ نقدی میں زکوٰۃ فرض اس وقت رہے گی جب کسی نے اس ارادے سے

---

(۱) البحر ۲/۲۰۶

رکھ رکھا ہو کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئے گی تو خرچ کر دوں گا لیکن کوئی ضرورت پیش ہی نہ آئی کہ سال پورا ہو گیا، اب اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اگرچہ اس کا خرچ کرنے کا ارادہ اب بھی بدستور قائم ہے، لیکن اگر کسی متعین ضرورت کے پیش نظر رکھا تھا، مثلاً رہائش کا گھر بنوانا ہے سال پورا ہو گیا اور وہ ضرورت ہنوز باقی ہے تو اس صورت میں ان دراہم کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جیسا کہ شرح المجمع میں صراحت ہے۔(۱)

حاجتِ اصلیہ کا تعین احوال و ظروف کے اعتبار سے

اس میں شک نہیں کہ حاجتِ اصلیہ کا دائرہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی تعبیر "کتب العلم لأهلها" سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کے لیے کتابیں حاجت اصلیہ ہیں جب کہ غیر عالم کے حق میں حاجتِ اصلیہ نہیں، چنانچہ کسی ماحول میں عام طور سے پانچ چھ جوڑے کپڑے استعمال کے لیے رکھے جاتے ہوں، ایسے ماحول میں کوئی شخص پچیس، پچاس یا اس سے زائد جوڑے رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ماحول کے اعتبار سے یہ اس کی پہننے کی ضرورت سے بہت زائد ہیں، لہذا اس کی حاجت اصلیہ سے باہر ہوں گے۔

لیکن اس کا اثر زیادہ سے زیادہ تحقق غنا پر پڑے گا، جس سے زکوٰۃ لینے کی حرمت، صدقۃ الفطر اور قربانی کا وجوب وابستہ ہوتا ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ پر کیوں کہ اس میں حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونے کے ساتھ نامی ہونے کی بھی شرط ہوتی ہے۔

چوتھی شرط۔ دین سے محفوظ ہونا

مال کا دین سے محفوظ ہونا حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کی شرط کے تحت آجاتا ہے بایں معنی کہ یہ ایک معنوی ضرورت ہے۔ لیکن چوں کہ حسی حوائج اصلیہ کی بہ نسبت اس کی تفصیلات و احکام قدرے مختلف ہیں اس لیے فقہاء اس کو الگ سے مستقل شرط کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، کسی شخص کے مال میں جملہ شرائط وجوب نصاب نامی وغیرہ موجود ہوں لیکن اس پر کسی قرض یا بقایا کا بار ہو تو پہلے بقایا کی مالیت اس کے نصاب سے

---

(۱) رد المحتار ۲/۶،

منہا کرلی جائے گی، اس کے بعد اگر مال بقدر نصاب بچتا ہو تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے گا۔
کس قسم کا دین وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں یوں ملتی ہے:

"قال فی النهاية كل دين له مطالب من جهة العباد فإنه يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد أو لله تعالى كدين الزكاة فالذي له مطالب من جهة العباد كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلف وأرش الجراحة والمهر وسواء كان الدين من النقود أو المكيل أو الموزون أو الثياب أو الحيوان وسواء وجب بنكاح أو خلع أو صلح عن دم عمد وهو حال أو موجل" (۱)

یعنی ہر وہ دین جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے چاہے وہ دین بندوں کا ہو جیسے قرض، مبیع کا ثمن، تلف کی ہوئی شئی کا ضمان، زخم کا تاوان اور مہر یا اللہ کا مثلاً دین زکوٰۃ کیوں کہ اس کا بھی مطالبہ کرنے والا امام موجود ہوتا ہے۔ برخلاف دین کفارہ اور دین نذر کے کہ امام المسلمین کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ پھر اس دین کا کوئی نقدی کے قبیل سے ہونا ضروری نہیں بلکہ جس قسم کا بھی ہو، خواہ کیلی ہو، وزنی ہو، مزروعات میں سے ہو یا عددی کے قبیل سے ہو، اس کا ذمہ پر وجوب چاہے معاملے کے ضمن میں ہوا ہو یا عقد نکاح کے یا خلع کے یا دم عمد (قصاص) پر عقد صلح کے نتیجہ میں سردست واجب الادا ہو یا ادھار۔

دین طویل الاجل کا حکم

حنفیہ کے نزدیک دین کے وجوب زکوٰۃ سے مانع ہونے کی جو تفصیل اوپر ذکر کی گئی اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ دین خواہ مؤجل ہو یا معجل بہرصورت اس کا ذمہ پر ہونا زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع ہے، اس کی مدت لمبی ہو یا کم، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اصل چیز مطالبہ ہے اور مؤجل کا مطالبہ عادۃً معینہ مدت سے قبل نہیں ہوا کرتا، اس لیے مانع نہیں ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ عورت کا دین مہر جو مؤجل ہو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان

---

(۱) الجوهرة النيرة ۱/۱۴۰، ۱۳۹، البدائع ۲/۶ تا ۸

تین اقوال پائے جاتے ہیں اور مسئلہ خاصا مختلف فیہ ہے۔

(۱) بہر صورت مانع زکوٰۃ ہے۔

(۲) معجل مانع ہے مؤجل نہیں۔

(۳) شوہر اگر ادائے گی کا پختہ ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

بدائع میں ہے:

"وعلیٰ هذا یخرج مهر المرءة فانه یمنع وجوب الزکاة عندنا معجلاً کان أو مؤجلاً لأنها إذا طالبته یؤاخذ به، وقال بعض مشائخنا إن الموجل یمنع لأنه غیر مطالب به عادة فإن کان المعجل فیطالب به عادة فیمنع وقال بعضهم إن کان الزوج علی عزم من تضائه یمنع وان لم یکن علی عزم القضاء لایمنع لأنه لایعده دینا" (۱)

علامہ شامیؒ نے قہستانی سے دوسرے قول کا راجح ہونا نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"عزاه فی المعراج إلی شرح الطحاوی وقال وعن أبی حنیفة لا یمنع وقال الصدر الشهید لا روایة فیه ولکل من المنع وعدمه وجه زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح أنه غیر مانع" (۲)

اس مسئلہ میں ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں، حضرت تھانویؒ کا تینوں قولوں کے مطابق فتویٰ موجود ہے(۳) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تیسرے قول پر فتویٰ دیا ہے(۴)، اور فتاویٰ دارالعلوم میں شامی پر اعتماد کر کے دوسرے قول کو اختیار کیا گیا ہے۔(۵)

آج کل حکومتیں جو اپنے شہریوں کو لمبی لمبی مدت پر بڑی بڑی رقمیں قرض کے طور پر دیتی ہیں جس کی ادائے گی سالانہ قسط وار کرنی ہوتی ہے ان کا حکم مذکورہ بالا نقول کی روشنی میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سالانہ واجب الادا قسط ہی نصاب زکوٰۃ سے منہا کی جانی چاہیے نہ کہ پوری مقدار قرض۔ اولاً اس وجہ سے کہ ان

---

(۱) بدائع ۲/۶ (۲) ردالمحتار ۲/۵ (۳) امداد الفتاویٰ ۲/۱۰۹

(۴) کفایت المفتی ۴/۲۴۶ (۵) فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۵۰ و ۴۶

قرضوں میں لازماً اسی قسط کا مطالبہ ہوتا ہے جو اس سال واجب الادا ہے نہ کہ پورے قرض کا۔ دوسرے اس میں فقراء کا نفع بھی ہے ورنہ اگر پوری مقدار قرض منہا کرلی جائے تو بسا اوقات زکوٰۃ ہی فرض نہ ہوسکے گی یا ہوگی تو بہت معمولی جب کہ مالکین اس رقم قرض کو تجارت یا کسی دوسری نامی مد میں لگا کر اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

محورثانی ۔ نصاب

چاندی اور سونے میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، البتہ اموال تجارت کی مالیت کا تعین نقدین میں سے کسی ایک سے کرنا پڑے گا اور اس بارے میں مسئلہ بے غبار ہے کہ جس کے ذریعہ قیمت لگانے سے مال تجارت کی مالیت نصاب کے بقدر ہو جاتی ہو وہی معیار ہوگا۔ چنانچہ فی زمانہ جب کہ سونے چاندی کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ظاہر ہے کہ معیار چاندی ہی قرار پائے گی کہ اسی کے ذریعہ قیمت لگانے پر مال کی مقدار نصاب تک جلدی پہونچتی ہے۔ باقی اگر دونوں کے ذریعہ نصاب کے بقدر یا اس سے زائد مالیت قرار پاتی ہو تو جس میں فقیر کا زیادہ نفع نظر آئے اسی کو اصل تسلیم کیا جائے۔

"ولو بلغ بأحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ بأحدهما نصاباً وخمساً وبالآخر أقل قومه بالأنفع للفقير" (۱)

یہ تفصیل تو اس نصاب شرعی کے متعلق ہے جس کا تعلق وجوب زکوٰۃ سے ہے باقی وہ نصاب شرعی جس کا مالک شرعاً غنی کہلاتا ہے اور زکوٰۃ کا مال اس کے لیے حرام رہتا ہے خواہ اس پر زکوٰۃ فرض ہو یا نہ ہو اس کا تعین حدیث پاک کے بموجب چاندی کے نصاب سے کیا جائے گا۔

"واستدل له في الكافي لقوله صلى الله عليه وسلم من سأل وله ما يغنيه فقد سأل الناس الحافاً وما الذي يغنيه قال مأتا درهم او عدلها" (۲)

---

(۱) الدر المختار ۳۱/۲

(۲) رد المحتار ۶۵/۲

محورِ ثالث ۔ مصارفِ زکوٰۃ

ادائیگی زکوٰۃ کیلئے تملیک شرط ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں بندوں پر ان کے مخصوص اموال میں سے ایک معین حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا فرض قرار دیا ہے وہیں بہ نص قرآنی اس حصۂ زکوٰۃ کے مصارف بھی واضح انداز میں بیان فرمادیے ہیں کہ ان ہی مصارف میں یہ زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جائے گا، ان کے علاوہ میں نہیں، ساتھ ہی ادائیگی کے صحیح طریقہ اور کیفیت کی بھی نشاندہی کردی ہے۔ چنانچہ آیات قرآنی و احادیث نبوی کی روشنی میں امت کے جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی ادائیگی اسی وقت صحیح ہوسکتی ہے جب ان مستحقین میں سے کسی کو زکوٰۃ کے مال پر بلاکسی عوض مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دیے اگر کوئی مال زکوٰۃ کی نیت سے ان ہی لوگوں کے فائدے میں خرچ کردیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم مدارس، مساجد، شفاخانے اور یتیم خانے وغیرہ کی تعمیر میں صرف نہیں کی جاسکتی، اگرچہ اس سے مستفید مستحقین بھی ہوں گے، کیوں کہ ان صورتوں میں تملیک کا مفہوم مفقود ہے حتی کہ زکوٰۃ کی رقم سے کوئی شئی خرید کر مستحقین کو بطور اباحت مستفید ہونے کا موقع دے دیا جائے، مثلاً بٹھا کر صبح و شام کھانا کھلادیں تو فقہاء فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (۱)

ملک العلماء کاسانی نے تملیک کے ضروری شرط ہونے پر استدلال اس طرح کیا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کا حکم ہے وہاں فعل "ایتاء" کا استعمال کیا گیا ہے جس کی حقیقت مالک بنادینا ہے، نیز قرآن میں زکوٰۃ کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ کسی فقیر حاجتمند کو اس کا مالک بنادیا جائے۔

طلبہ کو زکوٰۃ کیسے دی جائے؟

ادائیگی زکوٰۃ میں تملیک مستحق کے شرط ہونے کی وجہ سے آج کل دینی مدارس اداروں اور یتیم خانوں

---

(۱) بدائع ۲/ ۳۹

کے ارباب انتظام کو سخت آزمائش کا سامنا ہے، جہاں محتاج طلبۂ علم دین اور یتامیٰ جیسے مستحقین زکوٰۃ موجود ہوتے ہیں جن کی خاطر وہ قوم سے زکوٰتیں یا دیگر صدقات واجبہ وصول کرکے لاتے ہیں اور ان پر حسب حکم شرعی صرف کرنے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان اداروں میں مستحقین کے علاوہ خرچ کی کچھ اور مدات بھی ہوتی ہیں جن میں صدقات واجبہ کی رقمیں صرف نہیں کی جاسکتیں اور کافی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ملازمین کی تنخواہیں، ادارے کی تعمیر اور ان پر آنے والے ضروری اخراجات بجلی، پانی، ٹاٹ فرنیچر وغیرہ۔ اور تجربہ شاہد ہے کہ ان میں سے اکثر مدارس کو صدقات واجبہ کے علاوہ اتنی رقم فراہم نہیں ہوپاتی جس سے وہ ادارے کے دوسرے اخراجات پورا کرسکیں، اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے فقہ کی بعض جزئیات کو نظیر بناکر نہ جانے کب سے حیلۂ متعارفہ کی ایک رسم بد چلی آرہی ہے جس پر مالکین خوش ہیں کہ ہم نے زکوٰۃ کی رقم مصرف پر خرچ کرنے دی اور منتظمین خوش ہیں کہ ہم نے مصرف پر خرچ کرلی، جب کہ حقیقت میں رقم اپنے مصرف پر خرچ نہ ہوئی، صرف ہتھ پھیرا ہوا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قطع نظر ورع سے میرے نزدیک قاعدۂ فقہیہ کے رو سے بھی یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، کیوں کہ تملیک رکن زکوٰۃ ہے اور تملیک میں جب عاقدین ہازل ہوں تو تملیک نہیں ہوتی اور صورت متعارفہ میں دونوں شہادت قرائن قویہ معترف ہیں کہ تملیک مقصود نہیں۔" (۱)

ایک طرف اس دور جہل وضلالت میں علم دین کی روشنی پھیلانے کے لیے اس طرح کے اداروں کا قیام وعمل ضروری ہے تو دوسری طرف ان کی بقاء و دوام کی راہ میں مختلف مالی مشکلات کا سامنا ہے، ان مشکلات کے حل کی ایک راہ ڈھونڈی بھی گئی تو تجربہ نے بتایا کہ یہ خطرات سے محفوظ نہیں اس لیے ہمارے خیال میں حیلۂ متعارفہ سے ہٹ کر کوئی ایسی راہ عمل تلاش کرنا ضروری ہے جس سے شریعت کی حکم عدولی سے محفوظ رہتے ہوئے احیائے دین کے ان مراکز کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاسکے۔ سوالنامہ میں جو دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے اول الذکر پر ہمیں اشکال ہے، جب کہ دوسری پر بحمد اللہ اطمینان ہے اور وہ حیلۂ متعارفہ کا نعم البدل کہ طالب علم پر آنے والے مجموعی اخراجات طالب علم کے ذمہ واجب الادا ہوں، اور چوں کہ وہ غیر مستطیع ہے اس لیے زکوٰۃ کی مد سے اتنی نقد رقم یا اس کا چیک طالب علم کو دے دیا جائے اور وہ اپنے

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۱۳

اوپر عائد قرض کی ادائیگی میں اس کو داخل مدرسہ کر دیا کرے۔

اول الذکر صورت کہ مدرسہ کا مہتمم خود ہی اتنی مقدار رقم مد زکوٰۃ سے ادا کر دیا کرے یہ محل اشکال اس وجہ سے ہے کہ اس کی بنیاد مہتمم ادارہ کو مستحقین کا ہر اعتبار سے وکیل تسلیم کرنے کے نظریہ پر قائم ہے جو بجائے خود محل نظر ہے۔

مہتمم طلبہ کا وکیل یا زکوٰۃ دہندگان کا؟

اس سلسلہ میں کل تین احتمالات ہیں۔ صرف زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔ صرف طلبہ کا وکیل ہے، دونوں کا وکیل ہے ــــــ عام علمائے کرام کا رجحان یہی ہے کہ ہمارے ملک کے مدارس جو عوامی چندوں سے چلتے ہیں ان کے ارباب انتظام صرف مالکان اموال کی طرف سے زکوٰۃ کا مال مصرف پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں وکیل ہیں اور مستحقین کے نائب یا وکیل نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کا یہی خیال ہے، فرماتے ہیں:

"آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کے بھیجے ہوئے سفراء صدقات یا زکوٰۃ وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ یعنی مالداروں کے وکیل ہیں۔ ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اس لیے ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک وہ اس مال کو خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہوئی (۱)"

لیکن اس صورت میں کئی ایک اشکالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

---

(۱) معارف القرآن ۴/۲۹۹ ۔ ادارۃ المعارف کراچی

(۱) مہتمم اس کو دوسرے اموال میں خلط کردے تو استہلاک کی وجہ سے اس کی ملک ہوجانا چاہیے اور جو کچھ خرچ کرے گا وہ اس کی جانب سے تبرع ہوگا اور معطین کے لیے اتنے کا ضامن۔

(۲) معطی جب مرجائے گا اور مال مہتمم کے قبضہ میں بدستور باقی ہو تو اس مال کا اس کے ورثہ کی طرف لوٹانا واجب ہوگا جن کی تلاش و جستجو اس کی ذمہ داری ہے۔

(۳) جب رقم ارباب اموال کی ملک ہے تو جس معطی نے زکوٰۃ کی رقم مثلاً نصاب یا اس سے زائد مقدار میں دی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ بھی مالکین پر لازم ہونی چاہیے، کیوں کہ وکیل کا قبضہ خود موکل کا قبضہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صرف طلبہ اور مستحقین کا وکیل قرار دیا جائے تو اس صورت میں مال کا مہتمم کے قبضہ میں آجانا گویا طلبہ کے قبضہ میں آجانا ہے اور وہ ان کی طرف سے ہر ایسے کام میں خرچ کرنے کا مجاز ہوگا، جس میں کسی بھی اعتبار سے طلبہ کا فائدہ ہو۔

لہٰذا تملیک کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اسی طرح طلبہ کی خوراک، پوشاک یا نقد کی صورت میں مالک بنانے کے علاوہ تنخواہ ملازمین، مدرسہ کی تعمیر وغیرہ دوسری مدات میں صرف کرنے کا بھی جواز ہوگا، اور حیلۂ متعارفہ جیسے بے کار عمل سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس میں ایک زبردست اشکال یہ رہتا ہے کہ زمانہ شارع علیہ السلام یا آپ کے بعد اسلامی بیت المال میں جو زکوٰتیں وصول ہوکر آتی تھیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مصارف ثمانیہ ہی میں خرچ کیا جاتا تھا، حالاں کہ امیر المومنین کی ولایت عام ہونے کی وجہ سے فقرا اور مستحقین کی طرف سے امام کو یقیناً وکالت و نیابت دلالۃً حاصل تھی امام کا قبضہ خود مستحقین کا قبضہ تھا، گویا کہ مستحقین نے قبضہ کرکے امام کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار دے دیا تھا پھر بھی عہد نبویؐ، عہد خلفاء راشدین یا قرون اولیٰ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ صدقہ واجبہ کی رقم رفاہ عام کے کاموں یا عاملین کے علاوہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس ابوداؤد شریف میں ایک مرفوع حدیث ہے جس سے یہ متعین ہوجاتا ہے کہ ہر چند کہ زکوٰۃ پر امام کا قبضہ مستحقین کا قبضہ ہے لیکن ان کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، اور ان کے علاوہ کسی اور جگہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

" فاتاه رجل فقال اعطني من الصدقة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لم يرض بحكم نبي ولا غيره من الصدقات حتى حكم فيها هو فجزءها ثمانية اجزاء فان كنت من تلك الاجزاء اعطيتك " (۱)

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ صدقات میں سے مجھے بھی دیا جائے آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ صدقات کی بابت کسی نبی یا غیر نبی کے فیصلہ پر راضی نہیں بلکہ خود اس نے مصارف زکوٰۃ کی آٹھ قسمیں کردی ہیں اگر تو ان میں ہے تو میں دے سکتا ہوں (ورنہ نہیں)۔

لہٰذا جب اسلامی بیت المال کے ذمہ دار کو یہ حق نہیں تو آج کے مدارس کے نظماء کو کیوں کر یہ حق پہونچے گا کہ غیر مصرف میں زکوٰۃ صرف کر ڈالیں۔

اس لیے تیسری صورت متعین ہوجاتی ہے کہ نہ ہر اعتبار سے مہتمم معطیین کا وکیل ہے اور نہ ہر اعتبار سے طلبہ اور مستحقین کا بلکہ بعض بعض پہلوؤں سے ہر دو کے نائب اور وکیل کا درجہ رکھتا ہے، قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے پہلی صورت کے تحت مذکورہ اشکالات کے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے :

" مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے اس کے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا اگرچہ وہ مجہول الملکیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے، پس بعد موت معطی کے ملک ورثہ معطی کی اس میں نہیں ہوسکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے بہرحال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک ہے "(۲)

یہی بات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری رحمہ اللہ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ کے ایک اشکال کے جواب میں کہی ہے:

عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطیین اور آخذین

---

(۱) سنن ابوداؤد ۲۳۰/۱ (۲) تذکرۃ الرشید ۱۶۵/۱-۱۶۴

کی طرف سے وکلاء ہیں لہٰذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں۔ (۱)

یہ حقیقت ہے کہ ارباب مدارس لوگوں کی زکوٰۃ وصول کر کے مصرف میں خرچ کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور نہیں ہیں، جیسا کہ امیر المومنین مامور ہے، بلکہ وہ ادارہ چلانے کے لیے مالکین اموال سے صدقات وصول کرتے ہیں اور دینے والے حضرات صراحۃً انھیں مصرف پر خرچ کرنے کا وکیل بنا دیتے ہیں، دوسری طرف ظاہر ہے کہ مستحقین نے صراحۃً انھیں اپنا وکیل بنایا نہیں لیکن چوں کہ احیاء دین کی خاطر مدارس کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اور ان کا انحصار ان ہی صدقات وعطیات پر ہے اس لیے بر بنائے ضرورت ارباب انتظام کو (جن کا انتخاب ارباب حل وعقد کے مشورے سے ہوتا ہے اور عوام وطلبہ عرفاً ان کے اہتمام کو تسلیم بھی کرتے ہیں) امیر المومنین کے قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے تاکہ وہ پیچیدگیاں لازم نہ آئیں جو پہلی صورت کے ذیل میں بہ طور اشکال ذکر کی گئیں اور قاعدہ ہے" الضرورات تقدر بقدرها"

لہٰذا جس قدر ضرورت داعی ہوگی اسی قدر ان کو فقراء کا نائب تسلیم کیا جائے گا، اور یہاں ضرورت صرف اس قدر ہے کہ مال معطیین کی ملک سے نکل جائے تاکہ ان کے مرنے پر ورثہ کی طرف واپسی لازم نہ ہو، خلط (جس سے بچنا عادۃً ناممکن سا ہو گیا) کی وجہ سے استہلاک نہ لازم آئے، اسی طرح اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہو نیز زکوٰۃ وصول کر کے لانے والوں کو عاملین کی طرح زکوٰۃ میں اجرت دینا جائز ہو جائے۔ باقی قصداً مال ضائع کر دینے کی صورت میں ضامن ہونے کی بابت اور مصارف پر صحیح طریقے سے خرچ کرنے کی بابت وہ لازماً معطیین یعنی مالکین ہی کے وکیل ہوں گے نہ کہ طلبہ کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

مدارس کے سفرا، العاملین کے مصداق ہیں؟

مدارس کے سفرا جو وصولی صدقات کے لیے بھیجے جاتے ہیں" العاملین علیہا" کے مصداق ہیں یا نہیں، ؟ اس سلسلہ میں علما کرام کی آرا مختلف ہیں مگر اپنی ناقص معلومات کی حد تک ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ کہ ضرورۃً انھیں بھی عاملین کا مصداق قرار دینا چاہیے جیسا کہ ضرورۃً مہتمین کو بعض پہلوؤں سے

(۱) فتاویٰ خلیلیہ /۳۸۱ امداد الفتاویٰ مبوب ۲/۲۶۶، فتاویٰ امدادیہ موسوم بفتاویٰ اشرفیہ ۲/۳۸۱ میں حضرت تھانوی اور مولانا خلیل احمد صاحب کی مفید علمی مکاتبت ہے جس سے بہت سے اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔

امیر المومنین یا عمال کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اس وجہ سے اس راہ کی بہت سی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں مثلاً یہی کہ باضابطہ تنخواہ پر سفراء کا تقرر کرنے میں بسا اوقات ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہونچتا ہے آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زائد آتا ہے۔ اب اگر ان کو عاملین کے تحت داخل مانا جائے گا تو ان پر عامل کے احکام آئیں گے اور عامل کو اتنی ہی مقدار دی جاتی ہے جو اس کے وصولی پر جانے اور لوٹنے کی درمیانی مدت میں اس کی جملہ ضروریات کی اوسط طریقہ پر کفایت کر سکے اور ساتھ ہی اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اجرت اس کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے بڑھنے نہ پائے ورنہ کمی کی جائے گی۔(۱)

چنانچہ جب سفیر کو اس کی فکر ہوگی کہ اگر صدقات کی وصولی مجھ سے کم ہوئی تو لازماً میرے اوسط درجہ کے اخراجات وصول شدہ رقم کے نصف سے بڑھ جائیں گے اور اس میں میرا نقصان ہوگا تو وہ زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرے گا، اس صورت میں بہرحال آمد کا تناسب اخراجات سے زائد ہوگا، ہمارے اس خیال کی تائید مفید کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے لانے والوں کو اسی رقم میں سے اجرت عمل دینے کی گنجائش ہے خواہ وہ غنی ہوں، مگر کسی حال میں ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زیادہ نہیں دی جائے گی۔"

نیز فرماتے ہیں:

> "اموال زکوٰۃ وقیمت چرم قربانی میں سے اجرت عامل (سفیر چندہ) دینے کا جواز تو نا قابل تردد ہے اور اس صورت میں حیلۂ تملیک کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔" (۲)

واضح رہے کہ عاملین کے مصداق صرف محصلین اور سفراء ہی ہو سکتے ہیں وہ عملہ نہیں جو حساب آمد و خرچ کے اندراج پر مامور ہے کیوں کہ قرون اولیٰ میں کہیں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وصول کر کے لانے والے کے علاوہ محرر بیت المال محافظ وغیرہ کو صدقات میں سے تنخواہ دی گئی ہو۔

کمیشن پر زکوٰۃ کی فراہمی

فقہ حنفی کے اصول بیوع و اجارات کی رو سے ہر ایسا معاملہ جس میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہو

---

(۱) روح المعانی ۱۰/۱۲۱، تفسیر الخازن ۳/۹۱ (۲) کفایت المفتی ۴/۲۶۹

ناجائز ہوتا ہے، چنانچہ مذکورہ مسئلے میں بھی اسی علت کے باعث اہل علم باکمال ارباب افتا، عدم جواز کا فتوی دیتے آئے ہیں۔ کمیشن پر چندہ کرانے میں جو امور عدم جواز کے متقاضی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اجرت مجہول ہے، کیوں کہ کمیشن وصولی کے تناسب سے ہوگا۔ معلوم نہیں وصولی زیادہ ہوگی یا کم اگر اتنی کم ہوئی کہ جس کے کمیشن سے اس کا سفر خرچ وغیرہ بھی نہ نکل پائے تو یہ مستقل باعث نزاع ہے کہ سفیر فراہمیٔ چندہ کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائے اور نتیجہ صفر ہو، لہٰذا منتظم سے الجھنا عین ممکن ہے، اسی طرح وصولی اتنی زیادہ کر لایا کہوں کہ اس کا کمیشن ہی پچیس تیس ہزار تک پہونچ جاتا ہے تو منتظمین کی نیتیں ڈگمگانے لگتی ہیں، یہ محض احتمال نہیں بلکہ ایسے واقعات رونما ہوتے دیکھے گیے ہیں۔

۲۔ جب سفیر عامل صدقہ کے حکم میں ہے تو اس کے اوپر اخراجات میں میانہ روی برتنا اور اسراف وتقصیر (فضول خرچی وتنگی) سے اجتناب لازم ہوگا، فضول خرچی سے اس لیے کہ یہ مال فقرا کا ہے اور جو کچھ بطور حق الخدمت اسے دیا جاتا ہے وہ ضرورۃً ہے اور ضرورت کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جاتا ہے اور تنگی سے اجتناب اس لیے لازم ہے کہ خود خسارہ میں نہ پڑے اور بعد کو بد دل ہو کر یہ کام ہی چھوڑ دے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

"علی الامام أن یبعث من یرضی بالوسط من غیر إسراف ولا تقصیر" (۱)

زیر بحث مسئلہ میں اگر سفیر کے ہاتھوں چندہ کم ہوگا تو تبذیر کا مرتکب ہوگا، جو فقرا کی حق تلفی ہے اگرچہ برابر سرابر بھی صورت ہو سکتی ہیں لیکن پہلے دونوں امکانات اس کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور "درء المفاسد أولی من جلب المنافع" (۲)

عدم جواز کی پہلی علت کے سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں جہالت ایسی نہیں جس سے لازماً نزاع اور جھگڑا پیدا ہو اور جہالت وہی مضر ہے جو مفضی الی النزاع ہوتی ہے چنانچہ بہت سے معاملات جس میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہوتا ہے مگر اس کی جہالت باعث نزاع نہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتراض نہیں اور وہ معاملے جائز ہیں، مثلاً مزارعت (بٹائی) درختوں پر پھلوں کی بیع جو لازماً مجہول

---

(۱) روح المعانی ۱۲/۲ (۲) المدخل الفقہی للزرقاء ۹۸۵/۲

ہوتے ہیں اور مضاربت وغیرہ۔

لیکن ان معاملات کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ لوگوں کی عام ضروریات ان سے وابستہ ہوگئی ہیں اور ان کا عرف وتعامل بن چکا ہے، اس لیے ان کی جہالت کسی کے لیے قابل اعتراض نہیں ہوتی اور کوئی نزاع نہیں ہوتا، مگر جب تک ان میں عرف نہیں ہوتا تب تک دو چند اشخاص اگر اس قسم کے معاملات کرتے ہیں چاہے ان میں بالفعل منازعت نہ بھی ہو تب بھی وہ معاملے ناجائز کہے جاتے ہیں۔

گویا زیر بحث مسئلہ میں بھی اجرت کی جہالت باعث نزاع اسی وقت نہیں ہوگی جب اس کا عرف وتعامل ہو جائے ورنہ اکا دکا اشخاص اور دو چند اداروں کے ذمہ دار جو اس طرح کا معاملہ کریں خواہ بالفعل ان میں جھگڑا رونما نہ بھی ہو تب بھی معاملہ ناجائز ہی کہا جائے گا، الایہ کہ اس مسئلہ میں بھی عام ضرورت اور عرف وتعامل معتبر حد تک تسلیم کرلیا جائے جو محل نظر ہے۔ جیسا کہ عرف کی تعریف " هو عادة جمهور قوم في قول او فعل[1] " سے کی گئی ہے۔

رہی عدم جواز کی دوسری دلیل تو اپنی جگہ پختہ ہے اس لیے مسئلہ کا حل اسی میں ہے کہ اگر سفیر کو عامل صدقہ کا مصداق قرار دیا جاتا ہے تو اجرت بھی اسی طرح دی جائے جس طرح عامل کو دی جاتی تھی۔

مَصارفِ زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کے مصداق کے سلسلہ میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین متقدمین ومتأخرین کا جس پر اتفاق ہے اس سے اختلاف کرنے کی جرأت ہماری نگاہ میں سخت خطرناک ہے ان سب حضرات کی تصریحات کو یکسر پس پشت ڈالتے ہوئے لفظ کے محض ظاہری لغوی معنی کو پکڑ کر توسیع یا تعمیم کا نظریہ بالکل غلط ہے۔

جس طرح صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ شریعت کی مخصوص اصطلاحیں ہیں اسی طرح فی سبیل اللہ شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، شریعت نے ان الفاظ کو ان کے لغوی معانی سے نکال کر ایک مخصوص مفہوم کیلیے

---

(۱) المدخل الفقهي ۲/ ۸۴۰

متعین کر دیا ہے اسی طرح یہ لفظ سبیل اللہ بھی ایک خاص معنی کے لیے متعین ہو کر رہ گیا ہے اور وہ غزوہ اور جہاد عسکری ہے اور جب بھی کتاب وسنت میں یہ لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتا ہے۔

مسئلہ چوں کہ اجماعی ہے اور ماضی و حال کے علماء کے حق نے بحمد اللہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے سبھی شکوک وشبہات کا جائزہ خوب اچھی طرح لے کر غلط فہمی یا گمراہی کے جتنے راستے ہو سکتے ہیں سب کو مسدود کر دیا ہے اور منشا شریعت کی بھرپور ترجمانی کر دی ہے (فجزاہم اللہ خیرا لجزاء) اس لیے زیر بحث موضوع پر تفصیلی گفتگو کے بجائے ہمارے لیے صرف ایک راہ نظر آتی ہے کہ مسئلہ کی تنقیح کے ضمن میں ذکر کردہ نکات اور سوالات کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں دے دیا جائے اور بوقت ضرورت دو چار جملوں میں مقصد کی وضاحت بھی کر دی جائے اور بس۔

(۱) آیت کریمہ میں حصر حقیقی ہے، جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا تعلق ہے اس آپ کی رائے بھی جمہور امت سے مختلف نہیں ہے، بلکہ آپ نے جس انداز سے آیت کریمہ کی تشریح کی ہے وہ ان لوگوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جو شاہ صاحب کو اپنا نظریاتی مقتدا و پیشوا کہتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے تھکتے نہیں اور نظریہ توسیع فی سبیل اللہ کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب پہلے تو جمہور کی طرح صدقات واجبہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کا حق یہ ہے کہ کسی مستحق کو ان کا مالک بنا دیا جائے نہ کہ مساجد، مدارس اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جائے جہاں تملیک مفقود ہوتی ہے۔ پھر اپنے حکیمانہ مزاج کے مطابق مصارف کو تین بنیادی جامع تعبیروں میں سمیٹتے ہوئے فی سبیل اللہ کی جگہ غزاۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بالکل جمہور کے مطابق ہے۔ مصارف کی توضیح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ چوں کہ منافقین حضور پاک کو صدقات کی بابت طعن وتشنیع کے ذریعہ چاہتے تھے کہ ہماری خواہش کے مطابق صدقات کا مصرف محدود کر دیا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ نہیں! اس میں تو بہت سے لوگوں کا حق ہے اور اس میں توسیع ضروری ہے جن کا دائرہ ان آٹھ مصارف کی حد تک وسیع ہوگا تاکہ اس سے مسلم معاشرہ میں توازن پیدا ہو سکے۔ ان آٹھوں مصارف سے تجاوز نہ ہوگا۔ اگر شاہ صاحب کی مراد یہی ہو، جیسا کہ ظاہر الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ حصر اضافی ہے اور ان مصارف کا ذکر صرف منافقین کے مقابلہ میں آگیا ہے ورنہ تو ان میں فی نفسہ توسیع کی گنجائش ہے تاکہ عوامی ضروریات انجام پا سکیں تو یہ شاہ صاحب کے انداز تشریح کے سراسر خلاف ہوگا، کیوں کہ جن وجوہ میں تملیک نہیں انھیں سب سے پہلے شاہ صاحب خارج

کر چکے ہیں، باقی فقرا، مساکین، مسافرین اور قرض داروں کو محتاجین میں شامل کرلیا، غازیوں اور عاملین کو حفظ سے تعبیر کردیا۔ رہا فی الرقاب اور مؤلفۃ القلوب تو اس کی الگ سے نشاندہی کی، تو اب لے دے کر صرف اغنیاء بچ جاتے ہیں جن کو نہ دینا واضح ہے کہ مال صدقہ انھیں سے تو وصول کیا گیا ہے۔

(۲) جی ہاں جمہور مفسرین اور فقہائے نے قرآن وحدیث کے تتبع سے جو یہ سمجھا ہے کہ قرآن وحدیث میں کسی قید وقرینہ کے بغیر جب لفظ فی سبیل اللہ بولا جاتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد عسکری ہی مراد ہوتا ہے اس کے ہم ماننے کے پابند ہیں۔

(۳) احناف کا اصول یہی ہے کہ جب کسی مسئلہ میں مختلف اقوال صحابہ کے دوران پائے جاتے ہوں تو احناف ان ہی میں سے کسی ایک کو ترجیحی دلائل سے منتخب کرلیتے ہیں یا کوئی تطبیق کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان اقوال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے، جیسا کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی شافعی امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"ماجاءنا عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فعلی الرأس والعین بأبی ھو وأمی ولیس لنا مخالفۃ و ماجاءنا عن اصحابہ تخیرنا وما جاءنا عن غیرھم فھم رجال ونحن رجال" (۱)

(۴)۔ (الف): فی سبیل اللہ سے مراد محتاج غازی ہیں، اگرچہ امام محمد رحمہ اللہ نے ضرورت مند حاجیوں کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے لیکن احناف کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ ہی کا قول مفتی بہ رہا[۲] ہے۔ فقہاء متأخرین میں سے بعض نے محتاج طلبۂ علم دین کو بھی اس میں داخل مانا ہے جس کا مقصد ان کی زیادہ استحقاقیت ثابت کرنا ہے کہ اس میں دہرا اجر ہے۔

(ب): جی ہاں فقر کی شرط ضروری ہے:

"ولا یصرف إلی اغنیاء الغزاۃ لأن المصرف ھو الفقراء" (۳)

(۵) مصارف زکوٰۃ کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اگر دیکھا جائے تو اس میں فقرا، اغنیا، کافر،

---

(۱) بحوالہ درس ترمذی ۱/۱۰۹ (۲) فتح القدیر ۲/۱۰۵، داراحیاء التراث العربی

(۳) الہدایہ ۱/۱۸۵

اور مسلمان سبھی قسم کے لوگ ہیں، مجموعی اعتبار سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص امر تعبدی ہے جس کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اس پر کسی دوسرے امر کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالرزاق صاحب قاضی شریعت ضلع کٹیہار کی یہ بات کیا خوب ہے۔

" آٹھ مصارف کے بارے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ان میں تین مال دار بھی ہو سکتے ہیں اور ایک زمانۂ نبوی میں کا (تھا جو عہد فاروقی میں القط کر دیا گیا اور چار میں فقر وغیرہ شرط ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف مال دار اور غریب کا فراد مسلمان متضاد صفات والے ہیں۔ یہ بجائے خود دلیل ہے کہ مصارف صدقات واجبہ زکوٰۃ وغیرہ کا تعین انسان کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔"

اس لیے ہمارے نزدیک مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہی نہیں کیوں کہ امر تعبدی پر قیاس کرنا جائز نہیں۔

(۶) ظاہر ہے کہ یہ ضرورت بمعنی حاجت ہے نہ کہ ضرورت بمعنی اضطرار۔ یہ صحیح ہے کہ حاجت کو بمنزلہ ضرورت بعض مواقع میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن صرف ان ہی احکام میں جہاں کوئی نص قطعی موجود نہ ہو بلکہ نص عام ہو یا مسئلہ قیاسی و اجتہادی ہو اور مصارف زکوٰۃ نص صریح قطعی سے متعین کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں کسی حاجت کو دخیل بنانا نص کی مخالفت ہوگی جو جائز نہیں، شیخ مصطفےٰ احمد الزرقا، حاجت و ضرورت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" أما الأحكام التي تثبت بناءً على الحاجة فهي لا تصادم نصاً و لكنها تخالف القواعد والقياس۔" (۱)

اس لیے اکیڈمیوں، تنظیموں یا رفاہی اداروں کی یہ ضرورت چنداں اس حکم قطعی کو مس نہ کر سکے گی اور براہ راست صدقات واجبہ کی رقم ان میں خرچ نہیں ہو سکتی۔

وصلى الله على سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم وصحبه أجمعين

---

(۱) المدخل الفقهي، ج ۲ فقره ۶۰۳

خلاصہ جوابات

محور اول، ملک تام

۱۔۔۔۔۔ ثمن کی زکوٰۃ بائع کے ذمہ ہے اور مبیع کی زکوٰۃ خریدار پر قبضہ کے بعد سے واجب ہوگی۔

۲۔۔۔۔۔ کرائے کی پیشگی رقم کرایہ دار کا دین قوی اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ پر لازم ہے۔ ادائے قبضہ کے بعد سابقہ کی بھی ہوگی۔

۳۔۔۔۔۔ حرام مال میں زکوٰۃ نہیں لیکن مخلوط ہونے کی صورت میں اگر علاوہ کوئی نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۴۔۔۔۔۔ مدارس وغیرہ کے سرمائے پر زکوٰۃ نہیں۔

۵۔۔۔۔۔ دین قوی کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ ہوتی ہے۔ ادائے گی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ کے بعد کرے گا، مقروض ٹال مٹول کرے تو قبضہ کے بعد زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۶۔۔۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ ہونے کے بعد سے زکوٰۃ ہوگی سابقہ کی نہیں۔

۷۔۔۔۔۔ کمپنی بہ حیثیت کمپنی پر زکوٰۃ نہیں، بلکہ جو شرکا، مالک نصاب ہوں گے ان کے حصوں میں زکوٰۃ آئے گی۔

۸۔۔۔۔۔ شیئر کی زکوٰۃ شیئر ہولڈر کے ذمہ ہے، واقعی مالیت جو اس کی کمپنی میں ہے اس کی تفصیل دریافت کرکے اس کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی تفصیل نہ ملنے پر بازاری نرخ معیار ہوگا، اور بونڈس دین قوی ہے، قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

۹۔۔۔۔۔ اموال تجارت جو بھی ہوں ادائے گی کے وقت ان کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائیگی اور زمین کی متوقع قیمت فروخت کے حساب سے۔

۱۰۔۔۔۔۔ ہیرے جواہرات اگر تجارت کی غرض سے نہیں ہیں تو ان کی زکوٰۃ نہیں خواہ لاکھوں کی مالیت کے برابر ہوں۔

۱۱۔۔۔۔۔ حاجت اصلیہ کا تعین حالات وزمانے کے اعتبار سے ہوگا، مگر اس کا اثر وجوب زکوٰۃ پر نہیں پڑتا۔

سوالنامہ کا جواب

از: مولانا محمد نعیم الدین، جامعہ عربیہ اسلامیہ، کریم گنج، آسام

الحمد للّٰہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

محور اول: زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

جواب:- مال نامی پر خواہ حقیقی ہو یا تقدیری، جو دَین اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اور وہ تین قسم پر ہے:-

(۱) نقود (۲) سوائم (۳) اموال تجارت

کما فی طحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح (ص۳۸۹). ھی تملیك مال مخصوص لشخص مخصوص فرضت علی حر مسلم مکلف مالك لنصاب من نقد ولو تبرا او حلیا او آنیۃ او یساوی قیمتہ من عروض تجارۃ فارغ عن الدین و عن حاجۃ الأصلیۃ نام ولو تقدیرا۔

وفی شرح الوقایۃ[۱]: اعلم ان الزکوٰۃ لاتجب الا فی نام۔ الخ

وفی عمدۃ الرعایۃ: نام ای موصوف بالنماء تحقیقا وتقدیرا فانہ لو وجبت الزکوٰۃ فی غیر نام لاکلت المال وافنتہ وھو حرج عظیم وھو

---

(۱) ۲۱۸/۱

موفوع عنا بنص القرآن۔

وفی عمدة الرعاية ايضا : حاصله ان الزكاة لاتجب فی مال وان بلغ مقدار النصاب وحال عليه الحول ايضا الا اذا وجد ثلاثة اشياء احدها[۱] الثمنية وهو ان يكون المال ثمنا خلقة بان يكون مخلوقا لان يجعل ثمنا وعوضا فی العقود والتجارات وتشترى بها الاشياء وهو الذهب والفضة فتلتزم فيهما الزكاة كيف ما امسكهما ولو للنفقة اذا حال عليها الحول وبلغ نصابا۔ ثانيها[۲] : السوم وهو فی الدواب التی تجب فيها الزكاة كالبقر والغنم والابل، فتلزم فی الدواب الزكاة اذا كانت سائمة وان كان يعلفها فی بيته ويصرف عليها من عنده فلا زكوٰة عليها وان مضت عليه السنة وبلغت نصابا۔ وثالثها[۳] التجارة وهو فی غير الثمن الخلقی والدواب فما عداها اذا كانت بنية التجارة تجب فيه الزكاة والا فلا۔

وفی الجوهرة[۱] : اعلم ان شرائط الزكاة ثمانية، خمسة فی المالك وثلاثة فی المملوك، وهو ان يكون نصابا كاملا وحولا كاملا وكون المال اما سائمة او للتجارة۔

وفی فتح القدير[۲] : ثم هی فريضة محكمة وسببها المال المخصوص اعنی النصاب النامی تحقيقا او تقديرا ولذا يضاف اليه فيقال زكاة المال۔

اموال زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے جو شرائط ہیں ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے کیا مراد ہے؟

جواب:۔ ملک تام سے مراد وہ مال ہے جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں ایک ساتھ پائے جائیں۔

كما فی كتاب الفقه علی المذاهب الاربعة[۳] : الملك التام ان يكون

---

(۱) ۱/۱۱۲ (۲) ۱/۴۸۱ (۳) ۱/۵۹۱

المال مملوكا فی الید فلو ملك شیئا لم یقبضه فلاتجب فیه
الزکاة کصداق المرأة قبل قبضه فلا زکوٰة علیها فیه۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱)

منها الملك التام وهو ما اجتمع فیه الملك والید، اما اذا وجد الملك
دون الید کالصداق قبل القبض او وجد الید دون الملك کملك المکاتب
والمدیون لاتجب فیه الزکاة۔ کذا فی السراج الوهاج۔

وفی الجوهرة:[۲] لان الملك التام هو ما اجتمع فیه الملك
والید۔ واما اذا وجد الملك دون الید کملك المبیع قبل القبض و
الصداق قبل القبض او وجد الید دون الملك کملك المکاتب والمدیون
لاتجب فیه الزکاة۔

اس ذیل میں چند سوالات کے جوابات

جواب ۱: وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام ہے یعنی ملکیت کے ساتھ قبضہ بھی ہونا ہے، چوں کہ صورت مسئولہ میں یہ شرط مفقود ہے لہٰذا زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ ہو جائے گا تو صحیح قول کے مطابق دین قوی میں شمار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

کما فی البحر الرائق:[۳] واطلق الملك فانصرف إلی الکامل وهو الملك
رقبة ویدا فلاتجب علی المشتری فیما اشتراه للتجارة قبل القبض
ولا علی المولیٰ فی عبده المعد للتجارة اذا ابق لعدم الید۔ الخ۔

وفی فتح القدیر:[۴] ویخرج ایضا المشتری للتجارة اذا لم یقبض
حتی حال حول لا زکوٰة فیه اذا لم یستفد ملك التصرف وکمال الملك
لکونه مطلقا للتصرف۔

---

(۱) ۱۷۲/۱ (۲) ۱۱۴/۱ (۳) ۲۰۳/۲ (۴) ۴۸۲/۱

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱)

واما المبیع قبل القبض نقیل لایکون نصابا والصحیح انہ یکون نصابا کذا فی محیط السرخسی ۔

جواب ۲: کرائے کی مدت میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے ان صورتوں میں فقہاء و مشائخین کرام کے درمیان اختلاف رائے ہے بعض فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ دینا کرایہ دار اور مالک مکان دونوں پر احتیاطاً واجب ہوگی، لیکن علامہ شامی کے قول کے مطابق صرف مشتری پر لازم ہوگی اور علامہ شامی کے قول کی تائید ہوتی ہے صاحب بدائع کے بعض مشائخ کے قول سے اور ذخیرہ کے قول سے بھی۔

کما فی خلاصۃ الفتاوی: (۲) الاجارۃ الطویلۃ التی یفعلها الناس فی زماننا .... فزکاۃ الاجرۃ المعجلۃ فی هذه الاجارۃ الطویلۃ تجب علی الآجر واما علی المستاجر فتجب ایضا ذکره الشیخ الاسلام محمد الائمۃ السرخسی فی الجامع الکبیر وعلی هذا فی المبیع الذی اعتاده اهل هذا الدیار وهو البیع الذی وعد فیه الوفاء ان زکاۃ ذلك علی البائع ان بقی فی یده ویجب ان یلزم المشتری ایضا۔ وفی الجامع للسید الامام ابی شجاع لازکاۃ علی المستأجر والاحتیاط ان یزکی کل واحد منهما۔

وفی البدائع: (۳)۔ وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفها اهل البخاری ان الزکاۃ فی الاجرۃ المعجلۃ یجب علی الآجر لانہ ملکہ قبل الفسخ وان کان یلحقہ دین بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا انہ یجب علی المستأجر ایضا لانہ یعده ذلك مالا موضوعا عند الآجر۔

---

(۱) ۱/۸۸ (۲) ۱/۲۳۹ (۳) ۲/۶

وفی رد المحتار علی الدر المختار[1]: قالوا ثمن المبیع وفاء ان بقی حولا فزکاته علی البائع لانه ملکه وقال بعض المشائخ علی المشتری لانه یعده مالا موضوعا عند البائع فیواخذ بما عنده بدائع وذکر فی الذخیرة ان زکاته علیهما للتعلیلین المذکورین قال ولیس هذا ایجاب الزکاة علی شخصین فی مال واحد لان الدراهم لاتتعین فی العقود والفسوخ وهکذا ذکر فخر الدین البزدوی هذه المسئلة ایضا فی شرح الجامع اه ومثله فی البزازیة قلت ینبغی لزومها علی المشتری فقط علی القول الذی علیه العمل الأن من ان بیع الوفاء منزل منزلة الرهن وعلیه فیکون الثمن دینا علی البائع۔ تأمل۔

جواب ۳: دینی مدارس اور اداروں وغیرہ میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ مال موقوف کے مانند ہے جو متولی یا مہتمم حضرات کے پاس بطور امانت رہتا ہے جن کا خود وہ حضرات مالک ہونے کی حیثیت سے اپنی ذات کے لیے تصرف کرنے کا بالکل اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس قسم کے جمع شدہ مال پر وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ملک تام کی شرط مفقود ہے۔

کما فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة[2]: ولا زکاة فی المال الموقوف لعدم الملك فیه۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار:[3] فلا زکاة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك الخ۔

جواب ۴: جو مال کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اگر حلال و حرام اموال مخلوط ہو گئے ہوں کہ تمیز مشکل ہو جائے اس شرط پر کہ اس کے پاس اس مال مخلوط کے سوا دوسرا اتنا مال بھی پایا جاتا ہو، جس سے مال مغصوب والا قرض وہ ادا کر سکے تو غاصب کا مال شمار کر کے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یعنی کسی کے پاس اپنا ذاتی مال پہلے سے تھا اس نے کسی دوسرے کا مال چھین کر اس طرح ملا لیا کہ

(1) ۲/۶ (2) ۱/۵۹۲ (3) ۲/۵

اب چھینا ہوا مال اس سے جدا نہیں ہو سکتا ہے امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں کہ یہ ضائع کر دینے کے حکم میں ہے اور اس پر اس مال غصب کا تاوان لازم ہوگا لہٰذا وہ اس مال کا مالک بن گیا۔ لیکن اس ملا ہوا مال کے علاوہ اتنا مال کا وہ خود مالک ہونا ضروری ہوگا، جس سے اس تاوان کو ادا کر سکے۔ اس صورت میں اس پر اپنا تمام مال کا زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں۔ صاحبین کے نزدیک غاصب مال مغصوب کا کسی صورت میں مالک نہیں ہو سکتا ہے، لہٰذا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

كما فى البحر الرائق :[1] لوان سلطانا غصب مالا وخلطه الخ۔ اى خلط بماله اذالم يكن له مال و غصب اموال الناس وخلطها ببعضها فلازكاة عليه لما فى القنية لوكان الخبيث نصابا لايلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه ومثله فى البزازية قال فى الشرنبلالية وبه صرح فى شرح المنظومة ويجب عليها تفريغ ذمته برده إلى اربابه ان علموا و الا الى الفقراء۔

وفى رد المحتار على الدر المختار :[2] ولوخلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فيجب الزكاة فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يكن تميزه عند ابى حنيفة رح وقوله ارفق اذ قلما يخلوا مال عن غصب وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى دينه والا فلا زكاة كما لوكان الكل خبيثا كما فى النهر۔

جواب ۵: دائن اور مدیون کسی پر فی الحال زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام شرط ہے حالاں کہ ان دونوں میں سے کسی کو ملک تام حاصل نہیں، دائن کی ملکیت ہے تو قبضہ نہیں اور مدیون کا قبضہ ہے تو ملکیت نہیں۔

امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک دین تین قسم پر ہیں :

---

(۱) ۲۲۱/۲ (۲) ۳۹/۲

(۱) قوی (۲) متوسط (۳) ضعیف

دین قوی قرض یا مال تجارت کا بدل ہے، جب نصاب پورا ہو جائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو جائے گی، لیکن ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کی جائے گی، وصول کے بعد ایام ماضی کی بھی ادا کی جائے گی یعنی جب وصول کرے گا تو ہر چالیس درہم پر ایک ایک درہم زکوٰۃ میں دے گا۔

دین متوسط: یعنی وہ مال تجارت کا بدلہ نہ ہو، بلکہ جانوروں کی قیمت یا خدمت کے غلام ہوں یا تو حوائج اصلیہ میں سے دوسری ملکیت کی چیز ہو تو دوسو درہم قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی اور سال کا حساب جس وقت فروخت کیا تھا اس وقت سے لگایا جائے گا، شامی نے اسی کو صحیح ترین قول فرمایا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ میں آنے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع کی تحقیق کے مطابق یہی دوسرا قول اصح الروایتین قرار پایا۔

اور دین ضعیف وہ ہے جو مال کا بدل نہ ہو جیسے مہر، دیت، بدل خلع وغیرہ اس پر زکوٰۃ اس وقت لازم ہوگی جب اس قسم کے دین میں سے دوسو درہم پر مالک کا قبضہ ہو جائے گا اور اس کے بعد سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات طے پائی کہ دین کے اقسام ثلاثہ میں سے دین قوی پر بعد القبض ایام ماضی کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور دین متوسط کے دوسرے قول کو راجح قرار دے کر اور دین ضعیف ان دونوں قسم پر بعد القبض سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اگر مدیون دین ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور وصول کی امید ہو تو بعد القبض ایام ماضی کی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ لیکن مدیون پر کسی حالت میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی۔

کما فی رد المحتار[1]: اعلم ان الدیون عند الامام ثلثة: قوی ومتوسط و ضعیف۔ فتجب زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فورًا بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی، کقرض وبدل مال تجارة فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم وعند قبض مأتین منه لغیرها ای من بدل مال لغیر تجارة وهو المتوسط کثمن سائمة وعبید خدمة ونحوهما مما هو مشغول

(۱) درمختار ۲/۳۵

بحوائج الاصلية كطعام و شراب و املاك ويعتبر ما مضى من الحول قبل القبض فى الاصح ومثله مالو ورث دينا على رجل وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده اى بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده مايضم الى الدين الضعيف كما مر - ولو برأ رب الدين المديون بعد الحول فلا زكاة سواء كان الدين قويا اولا خانية وقيده فى المحيط بالمعسر اما الموسر فهو استهلاك فليحفظ بحر قال فى النهر وهذا ظاهر فى انه تقييد للاطلاق وهو غير صحيح فى الضعيف كما لايخفى -

وفى البدائع (١): واما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه ذكر فى الاصل انه تجب فيه الزكاة قبل القبض لكن لايخاطب باداء مالم يقبض مأتى درهم فاذا قبض مأتى درهم زكى لما مضى وروى ابن سماعه عن ابى يوسف رح عن ابى حنيفة رح انه لازكاة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه -

وفى البدائع (٢): ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به فى حقه بيد نائبه وكذا المدفون فى البيت لانه يمكن الوصول اليه بالنبش بخلاف المفازة لان النبش كل الصحراء غير مقدور له وكذا الدين المقر به اذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول اليه الخ -

وفى رد المحتار (٣): ولو كان الدين على مقر ملى او على معسر مفلس اى محكوم بافلاسه او على جاحد عليه بينة وعن محمد لازكاة

---

(١) البدائع ٢/١٠ (٢) ايضا ٢/٩ (٣) ردالمحتار ٢/٩-١٠

وهو الصحيح ذكره ابن مالك وغيره لان البينة قد لاتقبل اوعلم به قاض سيجئ ان المفتى به عدم القضاء بعلم القاضى فوصل الى ملكه لزم زكاته ما مضى۔

جواب ۵۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہ دین قوی میں سے نہیں اس لیے کہ یہ قرض نہیں ہے اور کسی مال تجارت کا بدل بھی نہیں۔ اسی طرح دین متوسط بھی نہیں اس لیے کہ یہ کسی جانور کی قیمت یا خدمت کے غلام اور حوائج اصلیہ میں سے کسی چیز کا بدل بھی نہیں ہے تو لامحالہ یہی ماننا پڑا کہ یہ دین ضعیف میں شامل ہوگا، کیوں کہ وہ کسی چیز کا بدلہ نہیں، بلکہ یہ رقم ملازم کے ماہانہ حقوق میں سے ایک حصہ جمع کر کے رکھ لیا جاتا ہے جو ایام ملازمت کے اختتام پر اس کو واپس دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اور عطیہ بھی ملتا ہے۔ کچھ حصہ کا وہ خود مالک تھا لیکن قبضہ نہیں تھا۔ اب جب سے ملک تام حاصل ہوگا اس وقت سے حساب کر کے حولان حول پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ کما مر دلیلہ۔

وجوبِ زکوٰۃ کی دوسری شرط "نما" نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

نما دو طرح ہوتا ہے۔ حقیقی یا تقدیری یعنی وجوب زکوٰۃ کے لیے جو مال ہو وہ بڑھنے والا ہو، خواہ وہ تقدیراً بڑھنے والا ہو یعنی مالک اپنا مال قبضہ کے ساتھ اس کے بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو اگرچہ وہ اپنے نائب اور قائم مقام کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ یا حقیقۃً یعنی توالد و تناسل اور تجارت کے ذریعہ مال کو بڑھانا ہو۔

كما فى البحر الرائق (۱)، والنماء فى اللغة بالمد الزيادة والقصر بالهمزة خطأ، يقال نما المال ينمى نماء وينمو نموًا وانماه الله كذا فى المغرب۔ وفى الشرع هو نوعان، حقيقى وتقديرى فالحقيقى الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات۔ والتقديرى تمكنه عن الزيادة بكون المال فى يده او بيد نائبه فلا زكوٰة على من لم يتمكن

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۲۲

منهانی ماله کمال الضمار الخ -

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

ابن مالکؒ نے حاجت اصلیہ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ مالک اس کے ذریعے اپنے اوپر سے ہلاکت کو دور کرے، خواہ وہ حقیقۃً ہو جیسے اپنے استعمال کے کپڑے اور دوسری وہ تمام اشیاء جن کے اوپر ٹیک لگاتا ہوا وہ اپنی زندگی بسر کرے۔ یا تقدیرًا جیسے اپنے اوپر کسی کا حق دینا ہے۔

حوائج اصلیہ کے دائرہ میں یہ تمام اشیا، داخل ہیں

روزمرہ کے اخراجات، رہنے کا مکان، لڑائی کے آلات، جاڑے گرمی کے کپڑے، پیشہ وروں کے اسباب و آلات، سواری کے جانور، اہل علم کی کتابیں۔

کما فی رد المحتار علی الدر المختار (۱): (قوله وفارغ عن حاجة الاصلية) اشارة إلى انه معطوف على قوله عن دين (قوله وفسره ابن مالك) اى فسر المشغول بالحاجة الاصلية والاولى فسرها وذلك حيث قال وهى ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر او البرد۔ أو تقديرًا كالدين فان المديون محتاج إلى قضائه بما فى يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها۔

جواب ۱: کتب فقہ سے جہاں تک پتہ چلتا ہے کہ حوائج اصلیہ کا اطلاق کسی زمان، مکان اور اشخاص کے ساتھ محدود اور مقید نہیں، لہذا ہر دور و ماحول کے تغیر تبدل کا اعتبار کیا جائے گا، اور اس صورت مسئلہ کو سفر حج کے "راحلہ" پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) رد المحتار علی الدر المختار ۲/۶

كما في رد المحتار على الدر المختار(۱)؛ (قوله المحارة) انه يعتبر في كل ما يليق بحاله عادةً وعرفاً فمن لايقدر الا عليها اعتبر في حقه بلا ارتياب وان قدر بالمحمل او المقتب فلا يعذر ولو كان شريفاً اوذا ثروة۔اھ

وفي كتاب الفقه على المذاهب الاربعة (۲) الحنفية: قالوا۔ الاستطاعة هي القدرة على الزاد والراحلة الخ ويعتبر في الراحلة ما يليق بالشخص عادةً وعرفاً۔ ويختلف ذالك باختلاف احوال الناس۔

چوتھی شرط: دین سے محفوظ ہونا۔ کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

جواب:۔۔ دین تین قسم پر ہے۔ مال زکوٰۃ کا نصاب اس دین سے زائد ہو جس کا بندوں میں سے کوئی مطالبہ کا حق رکھتا ہو۔

اول:۔۔۔ وہ دین خالص اللہ کا ہو، جیسے زکوٰۃ وخراج کہ اس دین کا مطالبہ کا حق خلیفۃ المسلمین کے عامل کو ہوتا ہے۔

دوم: وہ دین خالص بندہ کا ہو، جیسے بطور کفالت ہو یا وہ میعادی قرض ہو، اگرچہ وہ اس کی بیوی کا مہر مؤجل ہو، جس کا موت یا طلاق کے وقت ادا کرنا ضروری ہوتا ہو یا اس کے ذمہ قرض ایسا نفقہ ہو جو اس پر قاضی کے فیصلہ کی وجہ سے یا باہم رضامندی سے لازم ہو چکا ہو،

سوم: وہ دین خالص اللہ کا ہو، جیسے نذر، کفارہ اور حج کے دین لیکن بندوں میں سے کوئی دنیا میں طلب کرنے والا نہیں ہے۔

قسم اول ودوم دین مانع زکوٰۃ ہے اور قسم سوم مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

كما في كتاب الفقه على المذاهب الاربعة (۲): الحنفية قالوا ينقسم الدين بالنسبة ذلك إلى ثلاثة اقسام۔ اول ان يكون ديناً خالصاً للعبد الثاني ان يكون ديناً للّٰه تعالىٰ ولكن له مطالب من جهة العباد

---

(۱) كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۲۳۳ (۲) ايضاً ۱/۵۹۴

کدین الزکوٰة والمطالب هو الامام فی الاموال الظاهرة وهی السوائم وما یخرج من الارض او نائب الامام فی الاموال الباطنة وهو اموال التجارة کالذهب والفضة۔ ونائب الامام هم الملاك لان الامام کان یأخذ ها الی زمن عثمان رضی اللّٰه عنه ففوضها عثمان إلی اربابها فی الاموال الباطنة۔ الثالث ان یکون دیناً خالصاً للّٰه تعالی لیس له مطالب من جهة العباد کدیون اللّٰه تعالی الخاصة من نذور وکفارات وصدقة فطر ونفقة حج۔ فالدین الذی یمنع وجوب الزکوٰة هو دین القسمین الاولین .... اما القسم الثالث فانه لایمنع وجوب الزکاة۔

جواب ۱: زراعت یا تعمیر مکان وغیرہ کے لیے اگر میعادی قرض لیا جائے وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے سالانہ واجب الادا قسط کو وضع کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی۔ کیوں کہ اس وقت دائن کی طرف سے پورے قرض کو ادا کرنے کے لیے مدیون پر مطالبہ نہیں۔ لہٰذا جب زکوٰۃ ادا کرنے کا وقت ہوگا اس وقت جو قسط واجب الادا ہوگی، اسی کو وضع کرکے حساب لگایا جائے گا۔ اور اس کو مہر موجل پر قیاس کیا جائے گا، جس کو زوج فی الفور ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے لہٰذا وہ عدم مطالبہ کی وجہ سے مانع زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوگا۔

جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱)

ومنها الفراغ عن الدین قال اصحابنا رحمهم اللّٰه کل دین له مطالب من جهة العباد یمنع وجوب الزکاة سواء کان الدین للعباد کالقرض وثمن المبیع وضمان المتلفات وارش الجراحة وسواء کان الدین من النقود او المکیل او الموزون او الثیاب او الحیوان وجب بخلع او صلح عن دم عمد وهو حال او مؤجل .... وذکر البزدوی فی شرح الجامع الکبیر قال مشائخنا رحمهم اللّٰه فی رجل علیه مهر مؤجل لامرأته وهو

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۱/۸۸-۸۹

لانہ یرید اداؤہ لایجعل مانعا من الزکاۃ لعدم المطالبۃ فی العادات وانہ حسن ایضا ھکذا فی جواھر الفتاوی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

احناف کے نزدیک مال مشترک میں زکوٰۃ واجب نہیں یعنی ہر شخص کا جدا جدا مال نصاب کو نہ پہونچے مگر جب شرکاء کا مال ملایا جائے تو نصاب پورا ہوجاتا ہے اور الگ الگ شریک کا مال نصاب کو پہونچ جائے تو ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ الغرض اس قسم کے مال مشترک میں ہر ایک شخص پر اپنے شیر کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کما فی رد المحتار علی الدر المختار(۱)

لاتجب الزکاۃ عندنا فی نصاب مشترک من سائمۃ ومال تجارۃ وان صحت الخلطۃ فیہ باتحاد اسباب الاسامۃ التسعۃ التی یجمعہا اومن من یشفع وبیانہ فی شرح المجمع وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ویتراجعان بالحصص وبیانہ فی الحاوی بلغ نصیب احدھما نصابا زکاہ دون الآخر ولو بینہ وبین ثمنین رجلا ثمانون شاۃ لاشئ علیہ لانہ مما لایقسم خلافا للثانی۔ سراج۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے موتی جواہرات چاہے جتنی قیمت کی ہو، تجارت کی اگر نیت نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اس لیے کہ پیدائش کے اعتبار سے ثمن میں شمار نہیں۔ اسی طرح اگر مال جمع کرنے کی غرض سے خریدا کیا تھا پھر نفع حاصل کرنے کے خیال سے بیچ ڈالا تب بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ ایسا ہی اگر عورتوں نے زینت وآرائش کی غرض سے زیورات کے طور پر استعمال کیا تب بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

کما فی کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ(۲)۔ وکذا لاتجب فی الجواھر

---

(۱) رد المحتار علی الدر المختار ۲/۳۴-۳۵ (۲) کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ۱/۵۹۵

كاللؤلؤ والياقوت والزبرجد ونحوها اذا لم تكن للتجارة باتفاق المذاهب

وفي ردالمحتار على الدرالمختار:(۱) ولازكوٰة اللآلي والجواهر وان ساوت الفا اتفاقا الا ان تكون للتجارة -

وفي الطحطاوي على مراقي الفلاح :(۲) - ولازكاة في الجواهر واللآلي الا ان يتملكها بنية التجارة كسائرالعروض (قوله ولازكاة في الجواهر واللألي) قال في الدر الاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة عند العقد - فلو نوى التجارة بعد العقد او اشترى شيئاً للقنية ناويا انه وجد ربحًا باعه لازكاة عليه اهـ ملخصا -

وفي الجوهرة : (۳)- واما اليواقيت واللآلي والجواهر فلازكاة فيها وان كانت حليا الا ان تكون للتجارة -

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارت کا سامان جس کی قیمت نصاب کو پہونچتی ہو زکوٰۃ واجب ہے، یعنی جس طرح نقود میں زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح تجارتی اراضی پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن خراجی زمین میں تجارت کی نیت صحیح نہ ہوگی، کیوں کہ زکوٰۃ کا دوبارہ دینا لازم آتا ہے۔

اختتام سال پر زکوٰۃ نکالنے کے وقت بازار کا جو نرخ ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور چوں کہ زکوٰۃ مجموعی نصاب پر واجب ہوگی، اس لیے تھوک کے بھاؤ کا اعتبار کرنا مناسب تھا، لیکن زکوٰۃ نکالنے میں نفع فقیر کا لحاظ مطلوب ہے اس وجہ سے پھٹکر فروختگی کا اعتبار کیا جائے گا۔

كما في ردالمحتار على الدرالمختار(۴)- وفي عرض تجارة قيمته نصاب الجملة صفة عرض وهو هنا ماليس بنقد واما عدم صحة النية في

(۱) ردالمحتار على الدرالمختار ۱۴/۲ (۲) طحطاوی /۳۹۱ (۳) الجوهرة ۱۱۲/۱ (۴) ردالمختار ۳۰/۲-۳۱

نحو الارض الخراجية فليقام المانع كما قدمنا لا لان الارض ليست من العروض

نتنبه . (قوله لا لان الارض الخ) ردعلى ما في الدرحيث اجاب عما اورده الزيلعي

بان الارض ليست من العروض بناءً على مانقله عن الصحاح قال في البحر

وهو مردود لما علمت من ان الصواب تفسيره هنا بما ليس بنقد، اهـ

وايضاً[۱] وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم

يوم الاداء اجماعاً وهو الاصح ويقوم في البلد الذي المال فيه ولوفي مفازة

ففي اقرب الامصار اليه۔ فتح۔ (قوله وهو الاصح) اي كون المعتبر في

السوائم يوم الاداء اجماعاً هو الاصح فانه ذكر في البدائع انه قيل ان

المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء اهـ

وفي المحيط، يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح اهـ فهو

تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون

متفقا عليه عنده وعندهما۔

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز تین قسم کے ہوں گے۔

(۱) کمپنی ذریعۂ آمدنی کے لیے کوئی چیز خرید کرلیتی ہے اور اسی کے استعمال سے نفع حاصل کرتی رہتی ہے تو اس صورت میں صرف منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اصل سرمایہ پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ ذریعۂ معاش اور حوائج اصلیہ کی چیزیں بن گئی ہیں، جس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(۲) ایسی کمپنی جو شیئرز کے روپیوں سے تجارت کرتی رہتی ہے اس صورت میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ وہ تجارتی رقم ہے اور تجارتی رقم میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

---

(۱) رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۲۲، ۲۳

(۳) شیرز ہولڈرس، شیرز خرید و فروخت کرنے کو ایک تجارتی پیشہ بنا لیوے تو اختتام سال پر بوقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس شیر کا جو نرخ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

شیرز اور بونڈس پر تجارتی سرمایہ کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور یہ دین قوی میں شامل ہوگی۔ اس وجہ سے بعد القبضہ گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی، جیسا کہ مذکورۃ الصدر ادلہ سے مستفاد ہے۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار[1]: وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعيينها للتجارة باصل الخلقة فتلزم الزكاة كيف ما امسكهما ولو للنفقة۔

وفی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه[2]: الحنفية قالوا الاوراق المالية، البنكنوت، من قبيل الدين القوى الا انها يمكن صرفها فضة فورًا فتجب فيها الزكاة فورًا۔

محور ثانی نصاب زکوٰۃ

نصاب زکوٰۃ کے سلسلہ میں سامان تجارت کی قیمت سونا یا چاندی کا نصاب جس سے حساب لگانے سے فقیر کا نفع زیادہ ہو اسی کی قیمت سے حساب لگایا جاتے گا۔ مثلاً مال تجارت کی قیمت اگر چاندی کے نصاب سے لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے اور اگر سونے کے نصاب سے قیمت لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، تو اس صورت میں چاندی کے نصاب سے قیمت لگائی جائے گی، اس لیے کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے پاس کچھ سونا اور کچھ چاندی موجود ہو تو اس صورت میں دونوں کی قیمت نکال کر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اس نصاب کے برابر اگر قیمت ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔

كما فی رد المحتار علی الدر المختار[3]: ولو بلغ باحدهما نصابا دون الأخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا وبالأخر اقل قومه بالانفع للفقراء۔ سراج۔

---

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۱۰۱ (۲) کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ۱/۶۰۶ (۳) ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۳۰

وفی خلاصة الفتاوی[1]: والفلوس والدراهم المموهة علی هذا لا زکاة فیها الا ان تکون للتجارة وقیمتها تبلغ نصابا کذا روی الکرخی عن ابی حنیفة رح .... واصل هذا ان الذهب یضم إلی الفضة لتکمیل النصاب عندنا استحسانا .... والضم عند ابی حنیفة رح باعتبار القیمة وعندهما باعتبار الأجزاء حتی لوکان احدهما ثلث النصاب لابد ان یکون الأخر ثلثی النصاب وغیر الذهب والفضة انما یکون مال الزکوٰة اذا کان معدا للتجارة ویعتبر النصاب فیها بالقیمة ان شاء قومها بالذهب وان شاء قومها بالفضة وعن ابی حنیفة رح انه یقوم بما هو الانفع للفقراء۔

وفی کتاب المبسوط[2]: ثم عند ابی حنیفة رح یعتبر فی التقویم منفعة الفقراء کما هو اصله حتی روی عنه انه اذا کان للرجل مأة وخمسة وتسعون درهما ودینار یساوی خمسة دراهم انه تجب الزکاة وذلک بان یقوم الذهب بالفضة .... وابوحنیفة رح یقول هما عینان وجب ضم احدهما الی الأخر لایجاب الزکاة فکان الضم باعتبار القیمة کعروض التجارة وهذا لان کمال النصاب لایکون إلا عند اتحاد الجنس وذلک لایکون الا باعتبار صفة المالیة دون العین فان الاموال اجناس باعتبار اعیانها جنس واحد باعتبار صفة المالیة فیها۔

محورِ ثالث مصارفِ زکوٰۃ

جواب ۱: مصارفِ زکوٰۃ کی آٹھ قسموں میں سے پہلی قسم فقراء کی ہے، یعنی مسلمان محتاج کو اس مال کا مالک

---

(۱) خلاصة الفتاوی ۲۳۹/۱ (۲) المبسوط ۱۹۲/۱

بنا دینا جس کا نکالنا شرعاً معلوم ہے، اس شرط کی بنا پر اگر ناظم یا مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے رقم یا چیک بطور تملیک دے دیں گے اور وہ وصول کر کے اپنے ذمہ جو دین ہے وہ ادا کر دیں گے تو زکوٰۃ کی ادائے گی ہو جائے گی۔ یا تو مستحقین زکوٰۃ طلباء سے مدرسہ میں داخلہ لیتے وقت مہتمم مدرسہ ان کی طرف سے زکوٰۃ کا روپیہ قبول کر کے ان کی ضروریات میں خرچ کرنے کا تحریری وکالت حاصل کر لیں گے تو مہتمم مدرسہ مد زکوٰۃ سے ادا کر سکیں گے ورنہ عدم تملیک کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ کما مر دلیلہ۔

لہٰذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان اور فقراء و مستحقین زکوٰۃ دونوں کی طرف سے بہ حیثیت وکالت مختار کل بن جائیں گے اور ایسا ہی ایک آدمی دونوں طرف سے وکیل بن سکتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے،

الواحد يتولى طرفي النكاح۔

اور درمختار میں ہے:[1]

ولو خلط زكاة موكليه ضمن وكان متبرعا الا اذا وكله الفقراء۔

جواب ۲: (الف) مدارس اسلامیہ کے محصلین اور سفراء کی اجرت اپنے اعمال کے تناسب سے بطور کمیشن دینے کے جواز کی کوئی دلیل کتب فقہ کی کتاب الاجارہ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بلکہ اس طریقہ کے عدم جواز کی دلیل ملتی ہے۔

مضاربت اور مزارعت پر چندہ کے کمیشن کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ مضاربہ میں رب المال راس المال کو دیتا ہے اور مضارب تجارت کرتا ہے اور چندہ کی صورت میں مہتمم یا ناظم مدرسہ محصل کو کوئی ملکیت کی چیز سپرد نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح مزارعہ میں بھی رب الارض اپنی ملکیت کی زمین حوالہ کرتا ہے اور تحصیل میں ایسی کسی چیز کی ملکیت سپرد نہیں کی جاتی ہے، لہٰذا ان دونوں پر قیاس کر کے محصلین مدرسہ کے لیے کمیشن کو جائز نہیں قرار دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں فقہاء کرام نے مزارعت کے جواز کو مزارعہ ہی کے ساتھ محدود کر دیا اور اس کا جواز خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اور کسی چیز کا مقیس علیہ نہیں بن سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ محصلین مدرسہ کو اپنے کسب کے تناسب سے اسی سے اجرت دینا جائز نہیں، اس لیے

---

(۱) درمختار ۲/۱۱

کہ اس صورت میں اجرت الاجیر عن عملہ لازم آتی ہے اور اسی کو اجارۂ فاسدہ میں شمار کیا گیا۔ دوسری ایک اور نظیر ہدایہ جلد رابع کتاب الاضحیہ[1] میں ملتی ہے :

ولا یعطی اجر الجزار من الاضحیة لقوله علیه السلام لعلیؓ تصدق بجلالها وخطامها ولا تعط اجر الجزار منها شیئا۔ متفق علیه۔

(ب) شرعی عامل زکوٰۃ تو وہ ہوتا ہے جس کو امام یعنی امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین زکوٰۃ، عشر اور خراج وصول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔

کما فی البدائع[2] :۔ والعاملین علیها فهم الذین نصبهم الامام بجبایة الصدقات۔

وفی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة[3] : والعامل هو الذی نصبه الامام لاخذ الصدقات والعشور فیأخذ بقدر ما عمل۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے مہتمم صاحب کا مقرر کردہ عامل یا سفیر العاملین علیها کے تحت داخل نہیں مانا جائے گا کیوں کہ وہ امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے منتخب کردہ نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شرعی عامل کی کوئی اجرت امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے بطور کفایہ دیا جاتا ہے، اور مہتمم مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کی خاص ایک اجرت اور تنخواہ مقرر ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقت میں وہ والعاملین علیها کے تحت داخل نہیں مانے جائیں گے اور ان کی اجرت بھی مد زکوٰۃ سے نہیں دی جائے گی۔

کما فی شرح النقایة[4]، فیعطی بقدر عمله ای ما یکفیه ولاعوانه ذهابا وایابا لانه فرّغ نفسه لعمل من امور المسلمین فیستحق الکفایة۔

وکذا فی البدائع[5] :۔ انما یستحق بعمله لکن علی سبیل

---

(۱) هدایة کتاب الاضحیة ۴۳۴/۴ (۲) البدائع ۴۴/۲ (۳) کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ۶۲۱/۱

(۴) شرح النقایة ۱۶۱/۱ (۵) البدائع ۴۴/۲

الکفایۃ لہ ولاعوانہ لاعلی سبیل الاجرۃ لان الاجرۃ مجھولۃ اما عندنا فظاھر لان قدر الکفایۃ لہ ولاعوانہ انہ غیر معلوم وکذا عندہ لان قدر ما یجتمع من الصدقات بجبایۃ مجھول فکان ثمنہ مجھولا لامحالۃ وجہالۃ احد البدلین یمنع جواز الاجرۃ فجہالۃ البدلین جمیعا اولی فدل ان الاستحقاق لیس علی سبیل الاجرۃ بل علی طریق الکفایۃ لہ ولاعوانہ۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کو اخذ کرنے کا حق امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کا ہے۔ وہ اپنا عامل بھیج کر زکوٰۃ وصول کرسکتا ہے۔ اب اگر عامل کے ہاتھ زکوٰۃ کا مال ہلاک ہوجائے صاحب نصاب کی جانب سے واجب ساقط ہوجائے گا، لیکن اگر صاحب مال عامل کے ہاتھ پر زکوٰۃ نہ دے کر فقیر کو دے دے گا تو ان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ نفل صدقہ ہوجائے گا۔ امیر کا عامل آنے پر دوسری مرتبہ ان کو زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ اور اسی کو زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کے ہاتھ سے اگر مال زکوٰۃ ہلاک ہوجائے، تو صاحب نصاب سے واجب ساقط نہیں ہوگا، بلکہ فقیر کی تملیک کے بعد واجب ساقط ہوگا۔

کما فی فتح القدیر[1]: وفی الفصل الرابع وھو ما اذا قال ادیت بنفسی إلی الفقراء فی المصرف لایصدق وان حلف وقال الشافعیؒ یصدق، لانہ اوصل الحق إلی المستحق ولنا ان حق الأخذ للسلطان فلایملک ابطالہ بخلاف الاموال الباطنۃ. (قولہ لنا ان حق الأخذ للسلطان) یمکن ان یضمن منع کونہ اوصل إلی المستحق بل المستحق الامام والحق ان الامام مستحق الأخذ والفقیر مستحق التملك والانتفاع فحاصلہ ان ھناك مستحقین فلایملك ابطال حق واحد منھما ثم قیل زکاۃ ھو الاول والثانی سیاسۃ وقیل ھو الثانی والاول ینقلب نفلا وھو الصحیح۔

---

(۱) فتح القدیر ۱/۵۳۲

وفی البدائع (۱) :- ولو قال ادیت زکاتها الی الفقراء لایصدق وتوخذ منه عندنا وعند الشافعیؒ لاتوخذ۔ وجه قوله ان المصدق لایاخذ الصدقة لنفسه لیوصلها إلی مستحقها وهوالفقیر وقد اوصل بنفسه ولنا ان حق الأخذ للسلطان فهوبقوله ادیت بنفسی اراد ابطال حق السلطان فلایملك ذلك وكذلك العشر علی هذا الخلاف۔

وفی البحرالرائق (۲) ، ویسقط الواجب عن ارباب الاموال لو هلك المال فی یده لان یده کید الامام وهو نائب عن الفقراء ولاتکون مقدرة۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا عامل اگر کسی مزارع سے خراج وصول کرنا چھوڑ دے سلطان کے علم کے بغیر تو اس کے لیے ایسا کرنا حلال ہے جیسا کہ سلطان کسی کا خراج چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن مدرسہ کی جانب سے مقرر کردہ عامل کو یہ حق نہیں ہے۔

کما فی البحرالرائق (۳) : ومن احکام العامل ماذکره فی البزازیة ان العامل اذا ترك الخراج علی المزارع بدون علم السلطان یحل له ولومصرفا کالسلطان اذا ترك الخراج له۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ عامل شرعی کے لیے چند شرائط ہیں جیسے آزاد غلامؑ نہ ہو، مسلمانؒ ہو کافر نہ ہو، غیر ہاشمیؒ ہو۔ یہ قدرتؒ ہو کہ وہ تجارت کے مالوں کو چور اور ڈاکو سے بچا سکے کیوں کہ تاجروں سے عشر اس لیے لیا جاتا ہے کہ حکومت ان کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ امامؒ یا خلیفۃ المسلمین ان تمام شرائط کے مدنظر عامل کے تقرر کا حق رکھتے ہیں۔

ان شرائط میں سے اگر کوئی ایک بھی شرط مفقود ہوگی تو اس کو شرعی عامل نہیں قرار دیا جائے گا، حالانکہ مدرسہ کی جانب سے اس قسم کا عامل مقرر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ تو پھر شرعی مصرف میں شامل کرکے مدزکوٰۃ سے اس کو کیا دیا جائے گا۔ جیسا کہ شامی نے ذکر کیا ہے :

وفی البدائع (۴) : واما شرط ولایة الأخذ فانواع۔ منها وجود الحمایة

---

(۱) بدائع ۲/۳۶-۳۷ (۲) بحرالرائق ۲/۲۴۴ (۳) ایضاً (۴) البدائع ۲/۳۶-۳۷

من الامام حتی لو ظهر اهل البغی علی مدینة من مدائن اهل العدل و قریة من قراهم وغلبوا علیها فاخذوا صدقات سوائمهم وعشور اراضیهم وخراجها ثم ظهر علیهم اما العدل لایأخذ منهم ثانیا لان حق الاخذ للامام لاجل الحفظ والحمایة ولم یوجد الا انهم یفتون فیما بینهم وبین ربهم ان یؤدوا الزکاة والعشور ثانیا۔۔۔۔۔۔

ومنها وجوب الزکاة۔۔۔۔۔۔۔۔ ومنها ظهور المال وحضور المالك۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس بات میں سب متفق ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صاحب نصاب خود بخود زکوٰۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا دیتے تھے اور عاملین کے ذریعہ سے بھی جمع کر لیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں بھی یہ نظام باقی رہا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انھوں نے اموال باطنہ کو صاحب مال کے حوالہ کر دیا اور یہ اموال تجارت اور سونا چاندی ہیں اس کے بعد جب خلافت سلطنت سے بدل گئی اور امراء سلطنت پر صحابہ وتابعین وغیرہ اہل علم حضرات کا اعتماد کم ہونے لگا تو دین کے ایک اہم رکن کی ادائیگی کا ذمہ دار امراء کو قرار دینے میں ان حضرات کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض حضرات شرعی نظام کی خاطر اس کو ان کے ہاتھ میں دینے کے قائل ہو گئے اور بعض حضرات ان سے حلف لے کر دینے کے قائل ہوئے کہ وہ شرعی طور پر اس امانت کو صحیح مصرف میں رکھیں گے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے، اگر اس کو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے بتائے ہوئے پورے طریقہ پر ادا نہیں کیا جائے گا تو اموال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی نہ دینے والوں میں شمار ہو کر دوزخ میں جانے کا ایک سبب بن جائے گا۔ بنا بریں مدارس کے ذمہ دار حضرات تحصیل زکوٰۃ کے لیے جو سفراء بھیجتے ہیں ان کو والعاملین علیہا کے تحت عامل قرار دے کر مد زکوٰۃ سے ان کی تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

وفی عمدة القاری شرح بخاری[1]: الحادی عشر قوله (تؤخذ من اغنیاء هم) دلیل علی ان الامام یرسل السعاة إلی اصحاب الاموال

---

(۱) عمدة القاری ۸/۲۳۸

لقبض صدقاتهم وقال ابن المنذر اجمع اهل العلم علی ان الزکاۃ کانت ترفع إلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وإلی رسلہ وعمالہ وإلی من امر بدفعہا الیہ واختلفوا فی دفع الزکاۃ إلی الامراء فکان سعد بن ابی وقاص وابن عمر وابو سعید الخدری وابو ھریرۃ وعائشۃ و الحسن البصری والشعبی ومحمد بن علی وسعید بن جبیر وابو رزین والاوزاعی والشافعی یقولون تدفع الزکاۃ إلی الامراء۔ وقال عطا یعطیہم اذا وضعوھا مواضعہا۔ وقال طاؤس لا یدفع الیہم اذا لم یضعوھا مواضعہا۔ وقال الثوری احلف لہم و عدھم واکذبہم ولا تعطیہم شیئا اذا لم یضعوا ھا مواضعہا۔

وفی البدائع (۱): قولہ ان الذی یعطی للعامل اجرۃ عملہ ممنوع وقد بینا فسادہ واما حدیث علی رضی اللہ عنہ فلا حجۃ فیہ لان فیہ انہ فرض لہ ولیس فیہ بیان المفروض انہ من الصدقات او من غیرھا فیحتمل انہ فرض لہ من بیت المال لانہ کان قاضیا واللّٰہ اعلم۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں کہ

" فائدہ: تفصیل مذکورسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جا سکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ مالداروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لیے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو

---

(۱) البدائع ۲/۴۴ (۲) معارف القرآن ۴/۳۹۹

مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المؤمنین کو ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کر کے اس کو سالہا سال رکھتے رہتے ہیں اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہو گئی، حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہو گی جب ان کی زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لیے جائز ہے نہ لینے والوں کے لیے۔"

محور ثالث، مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصارف زکوٰۃ والی آیت کا حصر حقیقی ہے اور یہی قول راجح ہے۔

(۲) ہاں بندہ جمہور فقہاء کے اس دعوی سے متفق ہے کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب وسنت میں مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے مراد غزوہ وجہاد ہی ہوا کرتا ہے۔

(۳) قرون اولیٰ میں زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کی تشریح میں جب دو ہی قول ملتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔ تیسرا اور چوتھا قول ہم کو اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

(۴)۔ الف: فی سبیل اللہ سے مراد غازی و مجاہد ہے جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو۔ یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو، مگر اس کے پاس اب مال باقی نہ رہا، جس سے وہ حج فرض ادا کرے۔

ب: فی سبیل اللہ کا مصداق جو لوگ بھی ہوں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر و حاجت مندی

شرط ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہے اسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ اگر قیاس کیا جائے تو پھر بھی جہاد قلمی، جہاد فکری، جہاد ثقافتی وغیرہ کو شامل نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ جب فقر وحاجت بھی شرط ہے تو جہاد کے لیے مجاہد جو ہوگا، فقیر ہونا پڑے گا، ہاں اگر کوئی فقیر شخص اس قسم کا دینی کام کرنا چاہے تو اس کام کو انجام دینے کے لیے مد زکوٰۃ سے تائید کی جا سکتی ہے۔

(۶) دورِ حاضر میں مختلف دینی اور دعوتی کاموں کے لیے بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے اس واقعہ کے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب مصارف زکوٰۃ کے اصول وضوابط میں اس کو تسلیم کرنے کا کوئی سراغ ملتا ہو، حالاں کہ سوائے حیلۂ تملیک فقراء کے کوئی گنجائش ہی نہیں، کیوں کہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضۂ خدمت کے دیا جائے۔ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضؓ کو یہ ہدایت دی تھی کہ خذ ها من اغنيائهم وردها في فقرائهم۔ الغرض میری نظر میں مصارف زکوٰۃ کی تعمیم وتوسیع والا کوئی قول اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

(۷) فی سبیل اللہ کے مصرف میں جمہور فقہائے کرام اور مفسرین عظام جو مراد لیتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ مراد لینے کی کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ توسیع کے خلاف ہی ہے۔ کیوں کہ صحابۂ کرام جنھوں نے قرآن کریم کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی قول میری نظر میں قابل قبول نہیں ہے۔

———— ⁖ ————

زکوٰۃ

از:۔ مفتی محمد عبد الرحیم قاسمی، جامعہ حسینیہ خیر العلوم
نور محل روڈ، بھوپال۔

زکوٰۃ کے معنی طہارت و پاکیزگی اور زیادتی و بڑھوتری کے ہیں۔ اسلام کی نظر میں مال کے مقرر فرمودہ شرعی حصہ کا مسلمان غیر سید فقیر کو مالک بنا دینا اور اپنی ملکیت سے خارج کر دینا زکوٰۃ ہے۔

جواب، سوال ۱:

زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اور کامل مکمل ملک قبضہ سے ہوتی ہے:

" فقد ذکر فی البدائع من الشروط الملك المطلق وقال وهو الملك یدا و رقبة " (۱)

لہٰذا مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور وہ قیمت جو ادا کی جا چکی خریدار کے تصرف سے نکل کر بائع کے قبضہ میں داخل ہو گئی اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔

در مختار میں ہے:

---

(۱) رد المحتار ۲/۴ ۔

" فتجب زکاتہا اذا تم نصابا وحال علیه الحول لکن لافورًا بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة قال الشامی والحاصل ان مبنی الاختلاف فی الدین المتوسط علی انه هل یکون مال زکوة بعد القبض اوقبله فعلی الاول لابد من مضی حول بعد قبض النصاب وعلی الثانی ابتداء الحول من وقت البیع الخ " (۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ دارالعلوم میں قول اول کو ترجیح دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت جس قدر حصہ ثمن کا وصول ہوگا اسی وقت سے اس کا سال لگایا جائے گا بعد سال بھر کے ادائے زکوٰۃ واجب ہوگی اور بعض روایات میں بقدر وصول مقدار نصاب زکوٰۃ لازم ہوگی اور اسی کو ظاہر الروایہ اور مفتیٰ بہ قرار دیا گیا ہے اور بعض روایات میں قول اول کی تصحیح کی گئی ہے دھو الاقیس کذا فی الشامی۔ (۲)

جواب سوال (۲) :-

مالک مکان کو دی جانے والی رقم کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پیشگی کرایہ کے نام سے دی گئی ہو اور اس کو کرایہ میں وضع کرانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ مکان دار کے ذمہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ زرِ ضمانت (ڈپوزٹ) کے نام سے مالک مکان کے پاس رقم جمع کی جائے، لیکن عقد اجارہ فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے کے وقت کرایہ دار کو واپس کیے جانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہے۔ رقم واپس ملنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ لازم ہوگی۔

درمختار میں ہے :

" وکذا الودیعة عند غیر معارفه قال الشامی فلو عند معارفه تجب الزکوة " (۳)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

---

(۱) رد المحتار ۳۶/۲ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۱۳۶/۶ (۳) رد المحتار ۹/۲

" اس روپیہ کی زکوٰۃ بعد واپسی کے تمام گزشتہ سالوں کی ادا کرنا لازم ہے، اگر اس خیال سے کہ بعد واپسی کے بہت برسوں گزشتہ کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اور رقم کثیر ہو جاوے گی ہر سال موجود روپئے کے ساتھ زکوٰۃ کو دے دیا کرے تو یہ بھی درست ہے۔ (۱)

جواب سوال (۳) :-

مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کا کوئی معین مالک نہیں ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

" کما فی الدر المختار : و سببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی قال الشامی : فلا زكوٰة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك " (۲)

فتاویٰ دار العلوم میں ہے:

" مدرسہ کا چندہ جو بقدر نصاب جمع ہوتا ہے اور سال اس پر گزر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے " (۳)

مدرسہ وغیرہ کے مال میں کسی کو بھی کامل مکمل ملکیت حاصل نہیں اگرچہ ظاہراً کچھ تصرفات کا اختیار ہو مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے بھی وجوب زکوٰۃ کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

جواب (۴) :

رشوت، سود اور حرام طریقہ پر قبضہ میں آنے والے مال کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیوں کہ یہ قابض مالک نہیں، اس لیے قابض پر لازم ہے کہ یہ مال مالک کو واپس کرے اور واپسی نہ ہو سکتی ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کر دے، جب پورے مقبوضہ مال کو واجب التصدق قرار دیا گیا ہے تو اس کے بعض کو زکوٰۃ میں ادا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

" قال الشامی : لو کان الخبیث نصابا لا یلزمه الزکوٰة لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه " (۴)

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم ۶/۱۳۰ (۲) رد المحتار ۲/۹ (۳) فتاویٰ دار العلوم ۶/۴۹، ۵۱

(۴) رد المحتار ۲/۲۵ - وکذا فی عمدة الحج ص ۲۳۳ -

مال حرام کو حلال مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دینا کہ تمیز مشکل ہو جائے موجب ملک ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

"ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملکه فتجب الزکوٰۃ فیه ویورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم یکن تمییزه عند ابی حنیفة رحمه اللّٰه وقوله ارفق" (۱)

فتاویٰ دار العلوم میں ہے:

"مال حرام تمام کو بشرائط صدقہ کرنا لازم ہے زکوٰۃ اس میں نہیں ہے مگر خلط مال حرام کا موجب ملک ہے اس وقت اس میں زکوٰۃ بھی لازم ہوگی" (۲)

جواب سوال (۵):۔

قرض کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

اول یہ لے کہ نقد روپیہ یا سونا چاندی قرض دینے یا تجارتی مال فروخت کرنے کے بعد لینے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی رہے اور ایک سال یا کئی سال کے بعد وصول ہو تو ایسا قرض فقہی اصطلاح میں دین قوی ہے۔ بقدر نصاب باقی رہنے کی صورت میں اس قرض پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ فرض ہے اور یک مشت وصول نہ ہو تو مقدار نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوگی اور ہر پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی، اسی طرح پورے سالوں کی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

درمختار میں ہے:

"عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارة فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم قال الشامی وذکر فی المنتقیٰ رجل له ثلثمائة درهم دین حال علیها ثلثة احوال فقبض مأتین فعند ابی حنیفة یزکی للسنة الاولیٰ خمسة

---

(۱) درمختار علیٰ هامش رد المحتار ۲/۲۵ (۲) فتاویٰ دار العلوم ۶/۳۹ و ۸۲۔

وللثانية والثالثة اربعة اربعة عن مأة وستين ولا شئ عليه في الفضل لانه دون الاربعين "(۱)"

دوسری قسم یہ ہے کہ مال تجارت کے علاوہ خانگی سامان یا استعمالی اشیاء کی قیمت خریدار کے ذمہ باقی ہو تو یہ دین متوسط ہے ایک سال یا متعدد سالوں کے بعد وصول ہونے پر اس کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی فرض ہوگی اور یکمشت وصول نہ ہو تو جب تک مقدار نصاب کے برابر قرض وصول نہ ہو اس کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی اور وصولی کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی، اگرچہ یہ وصول شدہ قرض بقدر نصاب نہ ہو، لیکن دیگر مال کے ساتھ مل کر نصاب بن جائے تو اس کو شامل کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

" قوله في الاصح قد علمت انه ظاهر الرواية وعبارة الفتح والبحر في صحيح الرواية قلت لكن قال في البدائع ان رواية ابن سماعة انه لا زكوٰة فيه حتى يقبض المأتين ويحول الحول من وقت القبض هي الاصح من الروايتين عن ابي حنيفة رح " (۲)

تیسری قسم یہ ہے کہ نقد روپیہ اور اشیاء کی فروختگی کے علاوہ کسی اور سبب سے دوسرے کے ذمہ قرض ہو جائے مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر یا بیوی پر شوہر کا بدل خلع یا قاتل پر دیت خوں بہا، یا ملازم کی تنخواہ تو یہ قرض دین ضعیف ہے، وصولی کے بعد مالک کے پاس سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ وصول شدہ مال بقدر نصاب نہ ہو اور دیگر مال کے ساتھ شامل کر کے نصاب بن جائے تب زکوٰۃ فرض ہوگی مگر حق دار کو وصول ہونے سے پہلے گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ اس پر فرض نہیں۔

درمختار میں ہے:

" وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده أي بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده مايضم إلى الدين الضعيف قال الشامي والحاصل انه اذا قبض منه شيئا وعنده نصاب يضم المقبوض

---

(۱) ردالمحتار ۲/۳۵ (۲) ردالمحتار ۲/۳۶

الی النصاب ویزکیہ بحولہ ولا یشترط لہ حول بعد القبض"(۱)

قرض کے اقسام واحکام کی مذکورہ تفصیل سے یہ مسئلہ واضح ہوجاتا ہے کہ قدرت کے باوجود مدیون دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کررہا ہو تب بھی مدیون پر زکوٰۃ کو فرض نہیں کیا جاسکتا، البتہ قرض کی وصولی سے سال پورا ہونے پر مستقبل کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ فرض ہوگی، گزشتہ سالوں کی نہیں۔

"قلت وقدمنا اول الزکاۃ اختلاف التصحیح فیہ ومال الرحمتی الی ھذا وقال بل فی زماننا یقر المدیون بالدین وبملاءتہ ولا یقدر الدائن علی تخلیصہ منہ فھو بمنزلۃ العدم" (۲)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

"دوسرا آدمی اجازت لے کر اپنی رقم سے صاحبِ مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے مگر بکر نے زید سے روپیہ قرض لیا ہے اس وجہ سے اس کا ادا کرنا سود شمار ہوگا، لہٰذا زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، زید کے ذمہ زکوٰۃ باقی رہے گی" (۳)

جواب سوال (۶):-

دین کی تینوں قسموں قوی، متوسط، ضعیف کی تفصیل سے پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت واضح ہوگئی، مزید تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ مال تجارت کا معاوضہ نہیں اس لیے دین قوی میں داخل نہیں، البتہ خدمت حر کا معاوضہ ہے اس کو دین متوسط قرار دیں یا دین ضعیف بہرحال اصح روایت کے مطابق اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ دین قوی میں داخل ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ عبد تجارت کی خدمت یا دار تجارت یا ارض تجارت کا معاوضہ ہو، اس کے سوا کوئی دین اجرت دین قوی میں باتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کیا گیا یا بطور انعام گورنمنٹ کی طرف سے جمع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں اس لیے

---

(۱) ردالمحتار ۳۶/۲ (۲) ردالمحتار ۶۲/۲ (۳) ۱۴۸/۵

اس میں صرف دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دین متوسط ہو یا دین ضعیف اور دین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لیے مشکل ہے کہ دو روایتیں جو بحوالہ محیط منحۃ الخالق میں لکھی ہیں وہ دونوں عبد کی خدمت کے متعلق ہیں، حر کی خدمت کا وہاں ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ حر کی خدمت کو عبد کی خدمت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ حسب تصریحات فقہاء خدمتِ عبد فی الجملہ مال ہے اور خدمتِ حُر مال نہیں ہے، اس لیے ظاہر یہی ہے کہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور اگر اس کو دین متوسط بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اصح روایت کے مطابق امام اعظم ابو حنیفہ رح کے نزدیک دین متوسط بھی بحکم دین ضعیف ہے، اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کما صرح بہ فی البدائع۔ الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ دین قوی میں تو داخل نہیں ہو سکتا اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔"(۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

" ملازمان کی تنخواہ میں سے جو کچھ روپیہ وضع ہوتا ہے اور پھر اس میں کچھ رقم ملا کر بوقت ختم ملازمت ملازموں کو ملتا ہے وہ ایک انعام سرکاری سمجھا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ گزشتہ برسوں کی واجب نہیں ہوتی، آئندہ بعد وصول کے جب سال بھر نصاب پر گزر جاوے گا اس وقت زکوٰۃ دینا لازم ہوگا۔" (۲)

پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی مرضی سے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر ملی ہوئی زائد رقم سود ہے جیسا کہ فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

" جو نو روپئے لازماً کٹتے ہیں اور اس پر جو مزید رقم ملے گی یہ سب سرکاری انعام ہے اس پر زکوٰۃ کا مسئلہ ملنے اور قبضہ میں آنے کے بعد جاری ہوگا، ملنے سے پہلے نہیں، البتہ جو رقم ماہانہ جمع کرنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے اس میں زکوٰۃ کا حکم جاری ہوگا، اگرچہ وہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۹ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۶/۳۳۱تا۳۳۲

آپ کے قبضہ میں نہیں ہے جس طرح ہم کسی کو اپنی مرضی سے قرض دیتے ہیں اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہوتا مگر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح ہم نے جو رقم کسی کے پاس امانت رکھی ہے اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہے مگر وہ ہماری ملک ہے اور ہم نے اپنی مرضی سے امانت رکھوائی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح صورت مذکورہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اور اس رقم پر سود کے نام سے جو رقم ملے گی وہ سود ہوگی، کیوں کہ وہ آپ کی ذاتی رقم کے حساب میں دی گئی ہے۔" (۱)

نماء کی حقیقت اور اس کی صورتیں

مال میں زیادتی نماء ہے۔ مویشی سے نسل چلانا یا تجارت سے مال کمانا یہ ظاہری بڑھوتری ہے، سونے چاندی اور قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قیمتوں میں اضافہ ہونا بھی نماء کی ایک صورت ہے، شئیرز اور مکانات سے آمدنی حاصل کرنا بھی نماء ہے۔

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ

" مال نامی ایسے مال کو کہتے ہیں جس سے آدمی کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے، جو مکانات یا دکانیں تجارتی مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جائے خواہ فروخت کر کے خواہ کرایہ پر چلا کر وہ مال تجارت ہیں اور ان کی مجموعی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اگر وہ آمدنی آدمی کے پاس بچتی ہے یعنی اس کے اخراجات میں صرف نہیں ہو جاتی اور وہ سال بھر تک محفوظ رہتی ہے تو اس پر الگ زکوٰۃ فرض ہوگی۔ ہمارے علماء کو بعض ان روایات اور ائمہ فقہاء کے ان ارشادات سے غلط فہمی ہوئی ہے جن میں مکانات پر زکوٰۃ نہ ہونے کی تصریحات آگئی ہیں۔ حالاں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے ائمہ فقہاء کے عہد میں مکانات تجارتی مقصد کے لیے نہیں بنائے جاتے تھے لوگ صرف اپنی رہائش کے مکانات بناتے تھے، موجودہ صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے جو قدیم زمانہ میں پائی جاتی تھی لہٰذا

---

(۱) فتاویٰ رحیمیہ ۱۴۲/۵

ان ارشادات کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ آج کل جو مکانات کرایہ پر چلانے کے لیے بنائے جاتے ہیں وہ قطعاً مال تجارت ہیں اور وہ رہائشی مکانات کے ضمن میں نہیں آتے ان کی جو کچھ بھی مجموعی قیمت ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی کیوں کہ آپؐ کے عہد میں تجارتی بنیاد پر گھوڑوں کی پرورش نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے پالے جاتے تھے اس عہد میں گھوڑوں کا وجود غزوہ وجہاد کے لیے آلاتِ حرب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں پر زکوٰۃ نہ لینے کا حکم دیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد کی وسعت کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور لوگوں نے تجارتی مقاصد کے لیے گھوڑوں کی پرورش شروع کردی تھی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد میں گھوڑوں پر زکوٰۃ لگانی پڑی تھی۔ بعینہٖ یہی صورت مکانات کے سلسلہ میں بھی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں بلکہ ہمارے ائمہ فقہاء کے زمانہ میں بھی مکانات کی تعمیر نے کمرشیل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، لہٰذا اس وقت ان پر زکوٰۃ عائد نہیں فرمائی گئی، لیکن آج یہ صنعت تجارتی صورت اختیار کر چکی ہے لہٰذا انھیں مال زکوٰۃ تصور کرکے ان پر زکوٰۃ عائد کرنی ہوگی۔" (۱)

اور مشنریز کے متعلق مولانا عمر کی رائے یہ ہے کہ

"اسی طرح کارخانوں اور فیکٹریز پر کوئی زکوٰۃ عائد نہیں کی جاتی اور فقہاء کے اس قول کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے اصحاب حرفہ کے آلات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، موجودہ کارخانے اور فیکٹریاں بھی آلات حرفہ میں شامل ہیں لہٰذا ان پر زکوٰۃ نہیں لی جاسکتی، البتہ کارخانہ دار اس کارخانہ سے جو منافع کماتا ہے صرف اس پر زکوٰۃ لی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے، آلات حرفہ سے مراد دست کاری کے وہ آلات ہیں جو اہل حرفہ استعمال کرتے ہیں، یعنی جن سے وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعہ کام لیتے ہیں، مثلاً لوہار کے اوزار معمار کے آلات، جولاہے کی دستی کھڈی، حجام کے اوزار وغیرہ وغیرہ ان آلات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، کیوں کہ ان اوزار کے ذریعہ ہی سے وہ اپنی روزی حاصل ــــــــــ

(۱) فقہ القرآن ص۲۵۳

کرتا ہے ان کے بغیر وہ اپنی روزی حاصل نہیں کرسکتا ان آلات کو وہ اپنے ہاتھوں سے استعمال کرتا ہے لیکن کارخانوں کی مشینری اس زمرہ میں نہیں آتی قدیم زمانہ میں نہ صنعت و حرفت کی یہ اجتماعی اور تجارتی صورت تھی جو آج ہے اور نہ ہمارے فقہاء نے ان کے متعلق کوئی حکم دیا تھا صنعت و حرفت نے اس عہد میں یہ تجارتی اہمیت حاصل نہیں کی تھی اور پھر کارخانوں اور فیکٹریوں کی مشینیں یوں بھی آلات حرفہ نہیں ہیں کہ انھیں کارخانہ دار اپنے ہاتھوں سے استعمال کرکے اپنی روزی نہیں کماتا بلکہ مشین مینوں اور تربیت یافتہ افراد کو ملازم رکھتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ان مشین مینوں سے کام لیتا ہے اور مختلف مصنوعات بنواتا ہے۔ اگر یہ مشین آلات حرفہ ہیں تو وہ ان اہل حرفہ کے آلات ہیں جو انھیں اپنے ہاتھوں سے چلا رہے ہیں کارخانہ دار کے آلات حرفہ نہیں جو ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے دفتر میں بیٹھ کر ان تربیت یافتہ مزدوروں سے کام لیتا ہے اور ان کے خون پسینے سے بنائی ہوئی مصنوعات کو ملک کی منڈیوں میں چوگنے اور پانچ گنے داموں پر فروخت کرتا ہے اور اس طرح اپنی تجوریاں بھر رہا ہے اور یوں سرمایہ جمع کرکے یکے بعد دیگرے کارخانے پر کارخانے اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں بناتا چلا جا رہا ہے اور زکوٰۃ میں ایک پائی نہیں دیتا، یاد رکھیے یہ تمام کارخانے اور فیکٹریاں سامان تجارت ہیں اور ان کی قیمت پر نصاب کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔(۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

" کرایہ پر مکان چلانے کے لیے لینا یعنی کرایہ پر دینے کے لیے مکان خریدنا یہ بھی تجارت کے لیے ہی خریدنا ہے پس زکوٰۃ اس کی قیمت پر واجب ہوگی "

درمختار میں ہے :

" والأصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المودى إلى الثنى وبشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو كسب المال بالمال بعقد شراء او اجارة قوله ما عدا الحجرين الخ

---

(۱) فقہ القرآن / ۲۵۷

وما عدا ما ذکر کالجواهر والعقارات والمواشی العلوفة والعبید والثیاب والامتعة ونحوذلك من العروض۔ (شامی)۔

قوله مالم یبعه ای یوجره الخ" (شامی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ پر دینے کے لیے خریدنا بھی تجارت کے لیے خریدنا ہے۔ (۱)

سوال (۲۲۴) ایک شخص نے آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہے اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب: اس مشین کی قیمت پر زکوٰۃ ہے"۔ (۲)

فتاویٰ دارالعلوم سے بھی مولانا عمر عثمانی کی تائید ہوتی ہے، لہٰذا علماء کرام کو حالات حاضرہ اور دلائل مندرجہ کی روشنی میں کرایہ کے مکانوں اور مشنریوں کی قیمتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کے متعلق غور و خوض کرنا چاہیے۔

حاجتِ اصلیہ

خانگی ساز و سامان، رہائشی مکان، تجارتی دکان، زراعتی زمین، استعمالی سواری، ستر پوشی، روزی جسمانی ضروریات کا جن چیزوں پر دار و مدار ہے، حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں۔

"قال الشامی سئل عمن له ارض یزرعها اوحانوت یستغلها او دار غلتها ثلاثة آلاف ولاتکفی لنفقته ونفقة عیاله سنة یحل له اخذ الزکوٰة وان کانت قیمتها تبلغ الوفا وعلیه الفتویٰ وعندهما لایحل" (۳)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کو امام محمد رح کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور خود بھی احقر کا اسی پر عمل ہے مگر اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس عقار سے یہ شخص استغلال نہیں کرتا تب تو خود اس کی قیمت کا اعتبار ہے، پس اگر وہ فاضل از حاجتِ اصلیہ

---

(۱) فتاویٰ دارالعلوم ۹۱/۶ (۲) ایضاً ۱۴۳/۶ (۳) ردالمحتار ۶۵/۲

قیمت میں بقدر نصاب ہے تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اضحیہ ہے اور اگر اس سے استغلال کرتا ہے تو اس کے غلہ کا اعتبار ہے اور اگر اس کا غلہ سال بھر کے خرچ سے بمقدار نصاب نہیں بچتا تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطر و اضحیہ نہیں، اور امام صاحبؒ کے قول کا تقدم علی الاطلاق نہیں کما فصل فی رسم المفتی "(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ کا تعین دور حاضر میں حالات کا جائزہ لے کر علماء ہی کو کرنا چاہیے۔ کفایت، مؤنت، علاقہ اور ماحول اور گرانی و ارزانی کے اعتبار سے مختلف ہونے کی بناپر حاجت اصلیہ کا معیار مقرر کرنا ضروری ہے۔

" قال الشامی وسئلت عن المرأۃ هل تصیر غنیة بالجهاد الذی تزف به إلی بیت زوجها والذی یظهر مما مر ان ماکان من اثاث المنزل وثیاب البدن واوانی الاستعمال ممالابد لامثالها منه فهو من الحاجة الاصلیة ومازاد علی ذلك من الحلی والاوانی والامتعة التی یقصد بها الزینة اذا بلغ نصابا تصیر به غنیة "(۲)

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟

دین عبد یعنی بندے جس کا مطالبہ کرنے والے ہوں ایسا قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے، لہٰذا اس کو مال سے منہا کر کے باقی ماندہ کی زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

" ومدیون للعبد بقدر دینه فیزکی الزائد ان بلغ نصابا " (۳)

طویل الاجل کثیر دین کی جب تک کل قسطیں ادا نہ ہوجائیں غناء کا تحقق نہیں ہوگا اور زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

" قال الشامی ولایتحقق الغنی بالمال المستقرض مالم یقبض "(۴)

---

(۱) امداد الفتاوی ۲/۳۱ (۲) شامی ۲/۶۵ (۳) درمختار علی هامش رد المحتار ۲/۶

(۴) رد المحتار ۲/۸

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی فرماتے ہیں :

" اگر کسی کے پاس اس قدر مال ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی مقروض بھی ہے تو اگر اس پر قرض اتنا ہو جو اس کے مال کو محیط ہو جائے، یعنی دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے لیکن دس ہزار روپے ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی البتہ اگر دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے اور پانچ ہزار روپیہ کا قرض ہے تو اسے صرف پانچ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ دینی ہوگی، اسی زمرہ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو بنکوں سے قرض لے کر کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتے ہیں اگر کارخانہ اور فیکٹری کی قیمت کے برابر سرا بر ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی، البتہ اگر قرض کی مقدار کم ہے تو جس قدر فیکٹری اور کارخانہ کی قیمت قرض سے زیادہ ہے اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اس سے زیادہ پر نہیں"[1]

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت خواہ کتنی ہی ہو اس کے مالک شرکاء ہیں لہٰذا وجوب زکوٰۃ میں ان میں سے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب مالیت کے ہوں گے ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی باقی پر نہیں۔ امداد الفتاویٰ میں ہے :۔

" سوال (۸۰) مشترک تجارت میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ مشترک واجب ہوگی ؟

الجواب : نہیں۔

بقیہ سوال : یا انفراداً ؟ ——— الجواب : ہاں۔

بقیہ سوال : یعنی کل شرکاء مل کر زکوٰۃ کا روپیہ نکالیں ؟ ——— الجواب : نہیں۔

بقیہ سوال : اور اگر بعض حصہ دار زکوٰۃ نہ دینا چاہیں تو ہر شخص انفراداً اپنے روپے و مال جو حولان حول کے بعد اس کے حصہ میں آوے اس کی زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے ؟

الجواب : ہاں " (۲)

---

(۱) فقہ القرآن / ۲۶۶   (۲) امداد الفتاویٰ ۲/ ۵۳

مندرجہ بالا فتویٰ سے معلوم ہوا کہ تمام شرکاء کے مجموعی حصول میں زکوٰۃ نہیں بلکہ ہر شریک انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کا ذمہ دار ہے۔

"وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولی نسبة للحول لحولانه علیه تام بالرفع صفة ملك" (۱)

جن شرکاء کی ملکیت میں بقدر نصاب مالیت کا شیئر ہو، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس شیئر کی مالیت اتنی نہ ہو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات کی تجارت کی جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہونا ظاہر ہے۔ دور حاضر میں ہیرے جواہرات قیمتی مال ہیں ان کی ذخیرہ اندوزی سے قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ہیرے جواہرات کی شکل میں سرمایہ محفوظ کرنے پر بھی زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے۔

مولانا عمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے نزدیک امام ابویوسفؒ اور امام عنبری کا قول زیادہ صحیح ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام جواہرات یا تو معدنیات سے تعلق رکھتے ہیں یا سمندری برآمدات سے۔ معدنیات کے متعلق تمام صحیح روایات میں خمس کے وجوب کا حکم آیا ہے، سمندری برآمدات مثلاً مروارید، مونگا وغیرہ بھی معدنیات ہی کے مثل ہیں لہٰذا ان میں خمس واجب ہونا چاہیے، لیکن یہ خمس ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو ان چیزوں کو زمین سے یا سمندر سے برآمد کرتے ہیں۔ جو ان کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرتے ہیں یا بطور زیورات کے انھیں استعمال کرتے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ مال متقوم ہیں اور سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ فیصلہ فرماتے وقت کہ جواہرات وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اس نکتہ کو کیوں نظر انداز فرمادیا کہ یہ بھی سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ جہاں تک

---

(۱) درمختار علیٰ هامش الرد ۲/۴

ہمارا خیال ہے ہمارے فقہاء کے دور میں ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے اور ان کے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ خال خال کچھ لوگ دو چار موتی یا زمرد یا یاقوت وغیرہ کے نگینے اپنی انگوٹھی وغیرہ میں لگوا لیتے تھے اسی لیے انھوں نے یہ فیصلہ فرمایا ورنہ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ آدمی اپنے سرمایہ کو سونے اور چاندی کی شکل میں جمع کرے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر اسی سرمایہ کو جواہرات کی شکل میں محفوظ کرے تو اسے زکوٰۃ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ حالاں کہ سرمایہ دونوں جگہ موجود ہے، محض اس کی حفاظت کے طریقے مختلف ہیں۔ اس طرح تو ہم سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لیے سونے چاندی کو ذخیرہ نہ کریں بلکہ جواہرات کو ذخیرہ کرلیں اس کا ثبوت کہ فقہاء کے عہد میں جواہرات کی صورت میں سرمایہ کو ذخیرہ کرنے کا عام رواج نہ ہوا تھا یہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی آیت :

" وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ "

یقیناً جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر اسلام) آپ انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے۔

میں سونے اور چاندی کے ذخیرہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ عہد قدیم میں جواہرات کو ذخیرہ کرنے اور سرمایہ کو اس شکل میں محفوظ کرنے کا طریقہ رائج نہیں تھا، اس لیے اگر فقہاء کرام کے عہد تک بھی یہی صورت حال تھی تو بڑی حد تک انھیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے اس لیے ان ارشادات کو حرف آخر قرار دے کر سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اس طریقہ کو اپنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" (۱)

ہیرے جواہرات کے زیورات سے اگرچہ تمول مقصد نہ ہو صرف زینت کے طور پر ہی استعمال کیے جائیں تب بھی ان پر زکوٰۃ فرض ہونا چاہیے۔ ردالمحتار میں ہے:

---

(۱) فقہ القرآن / ۲۶۴ -

" سئل الحسن بن علی عمن لها جواهر واللآلی تلبسها فی الاعیاد وتتزین بها للزوج ولیست للتجارة هل علیها صدقة الفطر قال نعم اذا بلغت نصابا " (۱)

علامہ شامی فرماتے ہیں:

" وما زاد علی ذالك من الحلی والاوانی والامتعة التی یقصد بها الزینة اذا بلغ نصابا تصیر به غنیة " (۲)

سامانِ تجارت یا اراضی تجارت کی زکوٰۃ

جو سامانِ تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے ادائے گی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے اس کی زکوٰۃ نکالی جائے گی، تھوک بیوپاری کو زکوٰۃ دیتے وقت تھوک قیمت کا اعتبار کرنا چاہیے اور پھٹکر تجارت کرنے والے کو پھٹکر قیمت سے ہی زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے۔ تجارتی کاروبار کے لیے خریدی گئی زمینوں کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان زمینوں کی مارکیٹ میں جو قیمت ہو وہی معتبر ہونا چاہیے۔

" وتعتبر القیمة یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وهو الاصح " (۳)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی شیرز کے اصل سرمایہ اور اس سے حاصل شدہ نفع دونوں پر زکوٰۃ فرض ہے، کرایہ وصول کرنے والی کمپنیوں کے شیرز میں صرف نفع پر ہی زکوٰۃ ہے۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

" شیرز پر زکوٰۃ ہے۔ شیرز پر جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسا کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے اور بجلی کمپنی وغیرہ تو اصلی رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو کمپنی تجارت

---

(۱) ردالمحتار ۲/۶۵ (۲) شامی ۲/۶۵ (۳) درمختار علی هامش الرد ۲/۲۲

نہیں کرتی محض کرایہ وصول کرتی ہے جیسا کہ ریلوے کمپنی وغیرہ تو زکوٰۃ صرف نفع پر واجب ہے۔ اصلی رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔" (۱)

ادائے گی زکوٰۃ کے وقت مارکیٹ میں شیئر کی جو قیمت ہوگی اسی کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم میں ہے کہ جو قیمت اس وقت ہے یعنی پانچ سو روپئے کی زکوٰۃ دیوے۔ (۲)

دوسری جگہ اس طرح ہے:

"سوال (۲۱۸) زید نے ایک کمپنی کے پندرہ حصے پانچ ہزار کے خریدے اس میں جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سالانہ تقسیم ہوکر حصہ داروں کو ملتا ہے زید کو بھی پانچ سو روپئے ملے آیا زید کے ذمہ پانچ ہزار کی زکوٰۃ دینا لازم ہے یا منافع سالانہ کی رقم پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

الجواب: زید کو اس رقم پانچ ہزار کی زکوٰۃ بھی دینی لازم اور فرض ہے۔ کذا فی الدر المختار" (۳)

قرض حاصل کرنے والی حکومت یا کمپنی کی طرف سے دیے گئے سرٹیفکٹ کا نام بونڈ ہے لہٰذا یہ قرض دین قوی ہے، مدت معینہ گزرنے کے بعد بونڈ کیش کرانے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی لازم ہوگی۔ کما فی فتاویٰ دارالعلوم (۱۳۶/۶)۔

نصاب زکوٰۃ

"ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به إلى قوله تؤمه بالانفع للفقير" (۴)

فریضہ کی ادائے گی میں احتیاط کا تقاضہ اور انفع للفقرا، یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور حرمت کے لیے چاندی کے نصاب کو معیار مقرر کرنا مناسب ہے۔

کما فی عامة کتب الفتاوی

---

(۱) فتاویٰ رحیمیہ ۱۱/۳ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۱۴۶/۶ (۳) ایضاً ۱۴/۶

(۴) درمختار علی الرد ۳۱/۲

مصارفِ زکوٰۃ

(۱) غیر مستطیع طلبہ کو نقد یا چیک کی شکل میں مقررہ خرچ دے کر اس کو فیس کے نام سے وصول کیا جائے تو شرعاً زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے اس لیے زکوٰۃ پر مہتمم کا قبضہ ہو جانا زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے کافی ہے۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"مدرسہ کا مہتمم وکیل ہوتا ہے طلبہ فقراء کی طرف سے کہ ارباب اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے طلبہ پر صرف کرے اس صورت میں بلاشبہ مختلف اربابِ اموال کی زکوٰۃ کو خلط کرنا مہتمم کے لیے درست ہے۔ درمختار کی جو عبارت سوال میں نقل کی گئی اس کے متصل ہی ایک استثنا بھی مذکور ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو ارباب اموال کی طرف سے اذن کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

خلط زکوٰۃ موکلیہ ضمن وکان متبرعا الا اذا وکلہ الفقراء اھ۔

(درمختار) وصار خالطا مالھم بعضہ من بعض اھ" (شامی ۲/۱۴)۔(۱)

حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت فیوضہم نے اسی فتویٰ پر اشکال کے جواب میں تذکرۃ الرشید(۲) سے نقل فرمایا ہے کہ:

"مہتمم مدرسہ کا نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسے امیر نائب جملہ عام کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضہ سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول الکیت والذات ہوں، مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطی کے ملک ورثہ معطی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے، بہرحال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہو گی اور نہ خود معطی کی ملک رہے گی۔" (۳)

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۲۱۶ (۲) تذکرۃ الرشید ۱/۱۶۴، ۱۶۵

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۲۱۹

فتاویٰ محمودیہ جلد سوم میں ہے کہ :

" مہتمم مدرسہ کو ارباب اموال نے صراحۃً وکیل بنایا ہے کہ ہمارا مال حسب صواب دید مصارف میں صرف کردیں۔ غرباء کا بھی وکیل ہے اس طرح کہ طلبہ نے جب اس کے اہتمام کو تسلیم کرلیا تو گویا یہ کہدیا کہ آپ ہمارے واسطے ارباب اموال سے زکوۃ وغیرہ وصول کرکے ہماری ضروریات (کھانا کپڑا وغیرہ) میں صرف کردیں۔ امداد الفتاویٰ جلد ۳ کے اخیر میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کے متعلق سوال کیا ہے اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے جواب دیا ہے نہایت مفید علمی سوال ہے اور ایسا ہی جواب ہے جس سے شبہ مرتفع ہوجاتا ہے۔"[1]

(۲) مدارس کے سفراء عاملین کے حکم میں نہیں، جیسا کہ امداد الفتاویٰ[2] میں ہے، نیز صحت عقد کے لیے عمل اور اجرت دونوں کا متعین ہونا ضروری ہے، جب کہ کمیشن کے معاملہ میں دونوں مجہول ہیں، لہٰذا کمیشن پر چندہ کے لیے سفراء کو مقرر کرنا درست نہیں۔ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں :

" اس طرح معاملہ کرنا کہ جس قدر چندہ لاؤگے اس میں سے نصف یا ثلث وغیرہ تم کو ملے گا شرعاً درست نہیں، اس میں اجرت مجہول ہے، نیز اجرت ایسی چیز کو قرار دیا گیا ہے جو عمل اجیر سے حاصل ہونے والی ہے کہ یہ دونوں چیزیں شرعاً مفید اجارہ ہیں۔ وتفسد الاجارة بجهالة المسمّیٰ كله وبعضه ولودفع غزلا لأجر لينسجه بنصفه و استاجر بغلا ليحمل له طعامه ببعضه الخ " (درمختار)[3]

اور فتاویٰ محمودیہ جلد عاشر میں دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

" اس کو روپیہ ملنا ارباب اموال کے دینے پر موقوف ہے، گویہاں اجارہ ایسے عمل پر ہے جو اجیر کے اختیار سے خارج ہے اس کے اختیار میں لوگوں کے پاس جانا اور مدرسہ کی ضروریات بتا کر چندہ کی ترغیب دینا ہے مگر اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۴۸/۳ (۲) امداد الفتاویٰ ۵۸/۲

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۵۲۴/۱

کے پاس جاتا ہے لہٰذا یہ منفعت بھی مجہول ہے اور اجرت ایسی چیز کو قرار دیا جائے گا، جو اجیر کے عمل سے حاصل ہوگی۔ وقت معاملہ وہ معدوم ہے، مستاجر کے پاس نہیں اس کے تسلیم کرنے پر مستاجر کو قدرت نہیں، یہ بھی معلوم و متعین نہیں کہ کتنا چندہ سفیر کی ترغیب و محنت سے حاصل ہوگا، اس لیے اس کا نصف بھی معلوم و متعین نہیں، پس اجرت و ماجور دونوں مجہول ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑے وقت میں زیادہ روپیہ وصول ہوجائے اور سفیر زیادہ رقم کا مستحق قرار پائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ وقت اور محنت میں بھی تھوڑا روپیہ ملے یا بالکل نہ ملے اور سفیر تھوڑی رقم کا مستحق قرار پائے یا بالکل ہی محروم رہے، اس کا نتیجہ بھی معلوم۔" (۱)

زکوٰۃ سے تنخواہ حساب کتاب کے عملہ کو دی جائے یا دیگر ملازمین کو اس میں دینا جائز نہیں۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۱۰/۲۳۶۔

مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر

از :— مفتی حبیب اللہ القاسمی، جامعہ عربیہ ریاض العلوم، جون پور

زیر نظر مقالہ مسئلہ زکوٰۃ کے محوراول پر مشتمل ہے، اختصار کے ساتھ زیر بحث عنوان پر روشنی ڈالی جائے گی۔ وباللہ استعین وھو الموفق للصواب۔

زکوٰۃ جن اموال پر واجب ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔(۱) سوائم۔(۲) مال تجارت۔

چوں کہ وجوب زکوٰۃ کے شرائط میں سے مال کا نامی ہونا ہے اور نما بڑھوتری من حیث العین اسامت سے ہوتی ہے اور من حیث المعنیٰ تجارت سے ہوتی ہے، پھر مالِ تجارت کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اثمان مطلقہ جسے ثمن خلقی بھی کہا جاتا ہے، جیسے سونا چاندی۔ (۲) سلع۔

البتہ دونوں میں فرق ہے وہ یہ کہ سونا چاندی کی تخلیق ہی دراصل تجارت کے لیے ہوئی ہے اس لیے اس میں تجارت کی نیت وجوبِ زکوٰۃ کے لیے ضروری نہیں، لہٰذا خواہ تجارت کے لیے کوئی شخص رکھے ہوئے ہو یا خرچ کے لیے بہرحال اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بخلاف سونے چاندی کے علاوہ دوسرے سامان کہ اس میں جس طرح تجارت کی صلاحیت ہے اسی طرح اس کے عین سے بھی نفع اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد اصلی اس کے عین سے انتفاع ہے، اس لیے اس پر وجوب زکوٰۃ کے لیے نیت تجارت ضروری ہے تاکہ یہ مالِ تجارت ہو جائے۔ (۱)

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/ ۲۶۳، ۲۶۴

اور سونا چاندی خواہ جس شکل میں ہوں مضروب ہوں یا غیر مضروب، زیورات ہوں یا تبر، استعمال جائز ہو یا نہ ہو، تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو۔ (۱)

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے ان کا بقدر نصاب ہونا بھی ضروری ہے اور نصاب مختلف ہیں مثلاً چاندی میں دو سو درہم، سونے میں بیس مثقال اور اگر مال از قبیل عروض ہے تو وہ سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر ہو اور اگر مال از قبیل حیوانات ہے تو ان کا متعینہ مقدار کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ (۲)

مال بقدر نصاب ہونے کے بعد اس میں اوصاف اربعہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) حولان حول (۲) نصاب کا دَین اور حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا۔

(۳) نصاب کا نامی ہونا خواہ نما حقیقۃً ہو یا تقدیراً۔

(۴) نصاب پر ملکِ تام کا حاصل ہونا۔ (۳)

اوصاف اربعہ میں سے ایک وصف ملک تام ہے، کسی بھی نصاب پر ملک تام کا تحقق اس وقت ہوگا جب ملک اور ید (قبضہ کا تحقق ہو، اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو گئی تو ملک تام نہیں کہلائے گا۔ مثلاً مہر قبضہ سے پہلے ملک تو موجود ہے لیکن ید مفقود ہے اور مال مکاتب و مدیون میں ید تو ثابت ہے، لیکن ملک مفقود ہے، لہٰذا صداق قبل القبض اور مال مدیون میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کما فی سراج الوھاج۔ (۴)

(۱) صاحب السراج الوہاج کی تشریح کے مطابق وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو، لیکن مال کی وصولی اب تک نہ ہو سکی ہو اس کی زکوٰۃ مشتری (خریدار) پر واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ ملک تو ثابت ہے لیکن قبضہ میں ابھی نہیں آیا اس لیے ید کا تحقق نہیں ہوا اور وجوبِ زکوٰۃ کے لیے ملک اور ید دونوں کا تحقق ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے بھی بحوالہ بحر اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

"وخرج به ایضاً کما فی البحر المشتری للتجارة قبل القبض" (۵)

---

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۶۴ (۲) ایضاً ۱/۲۶۶ (۳) ملتقی الابحر ۱/۱۹۳

(۴) فتاویٰ ھندیہ ۱/۱۷۲ و مجمع الانھر ۱/۱۹۳ (۵) رد المحتار ۲/۲۶

لیکن علامہ سرخسی علیہ الرحمۃ کی عبارت محل غور ہے جو بحوالہ محیط عالمگیری میں موجود ہے،

"واما المبیع قبل القبض فقیل لایکون نصاباً والصحیح انہ یکون نصاباً" (۱)

اس جزئیہ سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خریدار پر صحیح قول کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فلیتأمل۔

(۲) کرائے کی مد میں دی گئی پیشگی رقم (ڈپوزٹ) پر کرایہ دار و مالک مکان میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی چاہیے، مالک مکان پر تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو صرف ید حاصل ہے ملک نہیں، چوں کہ یہ رقم عقدِ اجارہ کے فسخ یا تکمیل مدت کے بعد واجب الرد ہوتی ہے، اور کرایہ دار پر زکوٰۃ اس وجہ سے نہیں کہ اس کو ملک تو حاصل ہے ید نہیں، اور وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مال پر ملک و ید دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مسئلہ رہن کے تحت بیان کردہ تعلیلاتِ فقہاء سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"ولا فی مرھون ای لا علی المرتھن لعدم الملك الرقبة ولا علی الراھن لعدم الید" (۲)

ابن نجیم صاحب البحرالرائق فرماتے ہیں:

"ومن الموانع الوجوب الرھن" (۳)

البتہ اس رقم کی واپسی کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ زیر غور ہے، اگر ڈپوزٹ کو مسئلہ رہن پر قیاس کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ راہن پر استرداد کے بعد واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر مسئلہ رہن پر قیاس نہ کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"واذا استردہ الراھن لایزکی عن السنین الماضیۃ" (۴)

(۳) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ جب تک وہ رقم

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۲ (۲) شامی ۲/۲۶۳ (۳) ایضاً

(۴) ردالمحتار ۲/۲۶۳

مستحقین پر صرف نہیں ہوئی، وہ حکماً ملکِ معطی میں ہے تو یہ نظراً انتہا؛ انظار دقیقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لایخل ہے اس لیے ایسر واسہل یہی ہے کہ اس کو ملکِ معطی سے خارج قرار دے کر ملکِ مدرسہ قرار دیا جائے اور اس کی تائید کتاب الوقف کی بعض جزئیات سے بھی ہوتی ہے۔ (۱)

لہٰذا معطی پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح مدرسہ کے مہتمم پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ رقوم غلۃ الوقف کے درجہ میں ہے اور جس طرح غلۃ الوقف پر زکوٰۃ واجب نہیں، مدارس واداروں کی رقوم پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

البتہ فقہی سمینار اہل مدارس سے سفارش کرے کہ بقدر ضرورت ہی مال کی فراہمی کریں تاکہ مال زکوٰۃ اس طرح محبوس نہ ہو اور مستحق مدارس محروم نہ ہوں، لیکن اگر اہل مدارس کے پاس زکوٰۃ کی رقم پسماندہ ہو تو احوط یہ ہے کہ اس کو بذریعہ تملیک رقومات غیر واجبہ میں شامل کر لیا جائے اور اس کی احسن صورت یہ ہے کہ کوئی فقیر مہتمم مدرسہ کی ضمانت پر قرض لے کر مدرسہ کو عطیہ دے اور مہتمم مدرسہ مدِ زکوٰۃ سے فقیر کو قرض کی ادائےگی کے لیے دیدے۔

(۴) اگر پورا نصاب مال حرام ہو تو اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ضروری ہے اور مال حرام جو اس کے پاس ہے اس کا وہ مالک نہیں، چوں کہ مالِ حرام واجب الرد ہے لہٰذا مالک کا پتہ لگا کر وہ یہ مال واپس کرے اور اگر مالک معلوم نہ ہو سکے تو وہ مال واجب التصدق ہے، بلا نیتِ ثواب فقراء مسلمین کو دیدے۔ (۳)

اور اگر حرام وحلال مخلوط ہو گئے ہوں تو مال حرام نکالنے کے بعد باقی مال اگر بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۴)

لیکن اگر مال حرام مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ تمیز مشکل ہو تو تحری کر کے ظن غالب پر عمل کرے اور ظن غالب کے بہت سے نظائر کتب فقہ میں موجود ہیں، نیز اس انداز کے

---

(۱) ھندیہ ۲/۴۶۰ کتاب الوقف باب ۱۱ فصل ۲ وباب ۵ ص۴۱۸ (۲) الکلام البدیع فی احکام التوزیع

(۳) در مختار ۲/۲۹۱ ، کما لو کان الکل خبیثاً کما فی النہر فی القنیۃ لو کان الخبیث نصابا لا یلزمہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیہ الخ ۔ (۴) درمختار ۲/۲۹۱ ، وھذا اذا کان لہ مال غیر ما استھلکہ بالخلط منفصل عنہ یوفی دینہ والا فلا زکوٰۃ الخ

مواقع التباس میں تحری کے نظائر بھی کتب فقہ میں ہیں، گو اعلیٰ وافضل یہ ہے کہ اس طرح کا پورا مال صدقہ کردے جیسا کہ ہمارے اکابر کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

۵ــــ حضرت امام ابوحنیفہ رحہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین وسط (۳) دین ضعیف۔

(۱) دین قوی وہ دین ہے جو مال زکوٰۃ (دراہم ودنانیر) یا مالِ تجارت یا مالِ تجارت سے حاصل شدہ آمدنی ونفع کے عوض میں واجب ہوا ہو۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ۱. بقدر نصاب ہو، ۲. سال مکمل گذر چکا ہو، لیکن ادائے گی اسی وقت واجب ہوگی جب دین سے کم از کم چالیس درہم وصول ہو جائے، تب چالیس درہم سے ایک درہم بمد زکوٰۃ نکالے اور اگر چالیس درہم سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی، لیکن بقدر نصاب حولان حول چالیس درہم کی شرط اسی وقت ہے جب دین کے علاوہ کوئی دوسرا مال زکوٰۃ نہ ہو اور اگر اس کے پاس اموال زکوٰۃ میں سے کوئی مال ہو تو اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس کے پاس موجود مالِ زکوٰۃ بقدرِ نصاب ہے تو دین سے جتنی رقم بھی حاصل ہوگی خواہ قلیل ہو یا کثیر وہ نصابِ سابق میں ضم کردی جائے گی اور نصاب سابق کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی اور اگر مال بقدر نصاب نہ ہو مگر دین قوی سے حاصل شدہ رقم کو شامل کرنے کے بعد نصاب کامل ہو جائے تو دین قوی سے چالیس درہم یا اس کے بقدر وصول ہونے کے بعد ایک درہم بمد زکوٰۃ واجب الادا ہوگا، اور جب سے نصاب کامل ہوا ہے اس وقت سے سال کی ابتدا ہوگی۔ (۱)

قرض جو اصطلاح شریعت میں دین ہے اور عرف عام میں قرض ہے اگر مقروض وسعت کے باوجود ادا نہ کر رہا ہو تو "مطل الغنی ظلم" کے تحت گنہ گار ہوگا، لیکن اس کی زکوٰۃ مقروض پر واجب نہیں بلکہ قرض خواہ پر واجب ہے بشرطیکہ اس کے ملنے کا یقین ہو اور اس کی ادائے گی کا وہی طریقہ ہے جو دین قوی کا ہے جس کی تفصیلات ابھی آچکی ہیں، چوں کہ یہ دین قوی میں داخل ہے اور اگر نہ ملنے کا یقین ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے وہ مال جو سمندر میں گر کر ضائع ہو جائے۔ اور اگر یک مشت وصول ہو تو سنین ماضیہ

---

(۱) ردالمحتار ۳۰۶/۲

کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

" لوکان الدین علی مقر ملئ الی ان قال فوصل الی ملکہ لزمہ زکوٰۃ ما مضیٰ "[1]

(۲) دین وسط وہ دین ہے جو اسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو، اگر مالک کے پاس سال بھر رہ جائے تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے خدمت کے غلام، ثیاب بذلہ، مال خدمت کا غلہ۔

دین وسط کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن ادائے گی اس وقت واجب ہوگی جب دین سے دوسو درہم وصول ہو جائے، اگر اس سے کم وصول ہوا تو زکوٰۃ واجب الادا، نہ ہوگی، لیکن دوسو درہم وصول ہو جانے کی صورت میں سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، یہ حضرت امام ابوحنیفہ کی دو روایتوں میں سے روایت اصل ہے۔

دوسری روایت جو ابن سماعہ عن ابی حنیفہ ہے وہ یہ ہے کہ قبضہ کے بعد حولان حول شرط ہے یعنی دوسو درہم وصول ہونے کے بعد جب تک اس پر سال نہ گذر جائے اس میں زکوٰۃ واجب الادا، نہ ہوگی۔ دین وسط میں بھی وہی تفصیلات ہیں جو دین قوی کے تحت گذر چکی ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دونوں روایتوں میں صحیح اور مفتیٰ بہ روایت ابن سماعہ ہے۔[2]

(۳) دین ضعیف: وہ دین ہے جو کسی چیز کے عوض میں واجب نہ ہوا ہو، اس کے دین ہونے میں اس کے کسی فعل کا دخل نہ ہو جیسے میراث یا اس کے فعل کو دخل ہو، جیسے وصیت یا ایسی چیز کے عوض میں واجب ہوا ہو جو مال نہ ہو جیسے دیت علی العاقلہ، مہر، بدل خلع، صلح عن دم العمد، بدل کتابت،۔

دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔

(۱) دین سے حاصل شدہ رقم بقدر نصاب (دوسو درہم) ہو۔

(۲) قبضہ کے بعد اس پر سال گذر جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الادا، نہیں، یہ ساری تفصیلات حضرت امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کے مطابق ہیں۔

---

(۱) درمختار ۲/۲۶ (۲) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۹۴ ۔ ردالمحتار ۲/۳۰

حضرت امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک دیون کی صرف دو قسمیں ہیں۔

۱۔ دین مطلق۔ ۲۔ دین ناقص۔

دَین ناقص: جیسے بدل کتابت، دیت علی العاقلہ ان دونوں دیون کے علاوہ باقی دیون دَین مطلق میں داخل ہیں۔

دین مطلق کا حکم ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک دین وصول نہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، خواہ وصول یابی قلیل ہو یا کثیر، جتنی وصول ہوگی، اتنے کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

اور دین ناقص میں وجوب زکوٰۃ کے لیے دو شرطیں ہیں:

(۱) حاصل شدہ رقم بقدر نصاب ہو۔ (۲) اس پر سال گذر جائے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دین ناقص میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ دَین کے سلسلہ کی ساری تفصیلات تحفۃ الفقہاء لعلاء الدین السمرقندی اور درمختار و ردالمحتار سے ماخوذ ہیں۔ (۱)

۶۔۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ دو طرح کے ہیں:

۱۔ سرکاری ۲۔ پرائیویٹ۔

(۱) سرکاری پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف کے حکم میں ہے لہٰذا جو حکم دین ضعیف کا ہے وہی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کا ہے یعنی سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الادا نہیں، البتہ وصولی کے بعد اگر وہ بقدر نصاب ہو اور سال گذر جائے تو اس رقم کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

(۲) پرائیویٹ کمپنیوں کا پراویڈنٹ فنڈ چوں کہ مستقل ایک ایسی کمپنی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جس میں ملازمین کا بھی ایک نمائندہ ہوتا ہے اور یہ کمپنی ملازمین کی وکیل ہوتی ہے اس لیے کمپنی کا قبضہ ملازم کے قبضہ کے درجہ میں ہے اس طرح فنڈ کی رقم گویا کہ ملازم کی ملک ہو گئی، اس لیے یہ دین نہیں کہلائے گا۔ اور اس پر سال بہ سال زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر ہر سال زکوٰۃ نہیں ادا کی گئی تو وصولی کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اور اگر پرائیویٹ کمپنیوں کا حال بھی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہو تب جو حکم سرکاری فنڈ کا

---

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۹۳، ۲۹۴۔ ردالمحتار ۲/۳۵

ہے وہی حکم پرائیویٹ فنڈ کا بھی ہوگا۔ (۱)

نصاب کے اوصافِ اربعہ میں سے وصفِ ثانی نصاب کا نامی ہونا ہے، نماء کے لغوی معنی اضافہ وبڑھوتری کے ہیں اور اضافہ کبھی حقیقۃً ہوتا ہے، جیسے حیوانات میں توالد وتناسل کے ذریعہ اور دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ اور کبھی تقدیرًا ہوتا ہے، جیسے سونا چاندی اور سکۂ رائج الوقت، وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مال کا نامی ہونا ضروری ہے خواہ حقیقۃً نامی ہو یا تقدیرًا، لہٰذا ایسا مال جسے اپنے یا اپنے نائب کے پاس رکھ کر استنماء پر قادر نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

نصاب کے اوصافِ اربعہ میں سے وصفِ ثالث نصاب کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے۔ حاجتِ اصلیہ کی تفسیر ابن ملک کے حوالہ سے علامہ علاء الدین حصکفی اور صاحب مجمع الانہر نے یہ کی ہے:

• ایسی چیزیں جو انسان کو ہلاکت سے دور کرنے والی ہوں خواہ تحقیقاً جیسے اس کا اور اس کی بیوی اور بال بچوں کا نفقہ یعنی کھانا، خوراک، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے کپڑے، رہائشی مکان، گھریلو ساز وسامان، سواری کا جانور، خدمت کے لیے غلام، جنگی ساز وسامان، آلاتِ صنعت وحرفت اہل علم کے لیے کتابیں، چوں کہ اہل علم کے نزدیک جہالت باعث ہلاکت ہے یا تقدیرًا جیسے دین چوں کہ مدیون نے اگر موجود مال سے دین ادا نہیں کیا تو یہ دین اس کو جیل میں ڈلوا سکتا ہے جو ہلاکت کے درجہ میں ہے، لہٰذا اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہے، لیکن وہ مذکورہ بالا حوائج کی تکمیل میں مشغول ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وہ حاجتِ اصلیہ سے فارغ نہیں اور اگر بقدر نصاب یا اس سے زائد مال مذکورہ بالا اشیاء کی شکل میں موجود ہو، تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ چیزیں نامی نہیں ہیں، حتی کہ وہ برتن جو گھر کی زینت کے لیے رکھے جاتے ہیں، بشرطے کہ وہ سونے چاندی کے نہ ہوں اور ایسے ہی وہ آلات جن کی ذات سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور اس کا اثر معمول میں باقی نہ رہتا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں جیسے صابون اور اگر اس کا اثر معمول میں باقی رہے، جیسے کپڑا رنگنے کے لیے رنگ

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ واحسن الفتاویٰ (۲) مجمع الانہر ۱/۱۹۳

کھال میں لگانے کے لیے تیل، نمک وغیرہ تو اگر یہ بقدر نصاب ہوں اور سال گذر جائے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ تفصیلات مجمع الانہر، ہندیہ، شامی، درمختار سے ماخوذ ہیں۔" (۱)

حضرات فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ حاجت اصلیہ کی کوئی ایسی تحدید نہیں جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہ ہو، بلکہ وسعت ہے البتہ لفظ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرے میں جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، مثلاً کچے مکان کی جگہ پختہ مکان، نل کی جگہ پر ٹنکی، سواری کے جانور کی جگہ پر موٹر سائیکل، جیپ کار، تیر کمان کی جگہ پر رائفل، بندوق وغیرہ، آلات صنعت وحرفت میں دست کاری کی جگہ مشینیں۔ اسی طرح ضروریات زندگی میں بڑے مکانات میں لفٹ، ٹیلیفون، کاروباری لوگوں کے لیے باکس بڑلود (فریج) کولر، موسم کے اعتبار سے ہیٹر یا اے سی، پنکھا، الغرض اس طرح کی جدید چیزیں جو روزمرہ کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ اور جن کی اصل تصریحات فقہاء میں بنیادی حیثیت سے موجود ہیں، وہ سب حاجتِ اصلیہ میں داخل ہیں۔ البتہ ٹی وی۔ وی سی آر جیسی فحش اور ناجائز چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں، فلیتامل۔

نصاب کے اوصافِ اربعہ میں سے وصف رابع نصاب کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ دین سے مراد ہر وہ دین ہے جس کا مطالب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں ہی کا ہو جیسے قرض، ثمن مبیع، ضمان متلفات زخم کا تاوان، بدل خلع، بدل صلح عن دم العمد، نیز خواہ از قبیل نقود ہو یا مکیل وموزون یا از قبیل ثیاب اور حیوانات، نیز خواہ حال ہو یا مؤجل یعنی بالفعل اس کی ادائے گی ضروری ہو یا بعد زمان کچھ دنوں کی مہلت ہو، لہٰذا صداق زوجہ اگرچہ وہ مؤجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، وہ بھی دین میں داخل ہے اور مانع وجوبِ زکوٰۃ ہے۔ یا وہ دین اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسے دین زکوٰۃ اور ہر وہ دین جس کا مطالب بندہ نہ ہو، جیسے دین نذر، کفارات صدقۃ الفطر، وجوب حج یہ دین میں داخل نہیں، یعنی مانع وجوبِ زکوٰۃ نہیں۔

"والمراد دین لہ مطالب من جہۃ العباد سواء کان الدین لھم او للہ تعالٰی وسواء کانت المطالبۃ بالفعل او بعد زمان فینتظم الدین المؤجل ولو صداق زوجتہ المؤجل الی الطلاق او الموت۔" (۲)

---

(۱) مجمع الانہر ۱/۱۹۳، رد المحتار ۲/۲۶۲، الفتاویٰ الہندیہ ۱/۱۷۲ (۲) مجمع الانہر ۱/۱۹۳

" سواء كان الدين للعباد كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلفات وارش الجراحة و سواء كان الدين من النقود او المكيل او الموزون او الثياب او الحيوان وجب بخلع او صلح عن دم عمد وهو حال أو موجل او لله تعالى كدين الزكوٰة " (۱)

وكل دين لا مطالب له من جهة العباد .... لا يمنع كذا في المحيط السرخسي " (۲)

دیون مذکورہ بالا میں جو مال مشغول ہو وہ معدوم کے درجہ میں ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

" لان المشغول بها كالمعدوم " (۳)

اور دیگر حضرات فقہاء کے نزدیک عدمِ وجوبِ زکوٰۃ کی علت اس مال کا حوائج اصلیہ کی تکمیل میں مشغول ہونا ہے اور جو مال حوائج اصلیہ میں مشغول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

" وقد عللوا سقوط الزكوٰة بالدين بان المديون محتاج إلى هذا المال حاجة اصلية لان قضاء الدين من الحوائج الاصلية والمال المحتاج إليه حاجة اصلية لا يكون مال الزكوٰة، تأمل " (۴)

لیکن وہی دین مانعِ وجوبِ زکوٰۃ ہے جو وجوبِ زکوٰۃ سے پہلے کا ہو، اگر مال بقدر نصاب ہو اور حولانِ حول ہو گیا اس کے بعد یہ مقروض ہو گیا تو یہ قرض مانع نہیں بلکہ زکوٰۃ واجب الادا ہو گی۔

" وهذا اذا كان الدين فى ذمته قبل وجوب الزكوٰة فلو لحقه بعده لم تسقط الزكوٰة لانها تثبت فى ذمته فلا يسقطها الحق من الدين بعد ثبوتها " (۵)

چوں کہ دینِ عبد لاحق ہے اور دینِ زکوٰۃ سابق ہے اور لاحق سابق کو ساقط نہیں کر سکتا، فقہاء کرام کی تصریحات میں یہ بات بھی آچکی ہے کہ دین بالفعل واجب الادا ہو یا بعد زمان یعنی دین طویل المدت

---

(۱) هندیه ۱۷۳/۱ (۲) ایضاً (۳) مکب الانهر ۱۹۳/۱ (۴) ردالمحتار ۲۶۱/۲

(۵) جوهره، ردالمحتار ۲۶۰/۲

ہو، دونوں طرح کے دیون مانع وجوبِ زکوٰۃ ہیں، لہٰذا مروّج طویل الاجل دیون خواہ زراعتی ہوں یا تعمیراتی، جن کی ادائے گی کے لیے پانچ سال سے لے کر چالیس سال تک کی مدت مقرر کی جاتی ہے وہ بھی دین میں داخل ہیں اور مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، پورے دین کو بھی اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جا سکتا ہے اور اس کی نظیر مہر ہے جو مؤجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، نیز تصریح ہے بالفعل یا بعد زمان، البتہ احوط یہ ہے کہ صرف سالانہ واجب الأدا قسط وضع کر کے باقی اموالِ زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، یہ خیال کر کے گویا کہ اس سال واجب الأدا دین صرف یہی ہے اور باقی مال میرا ہے لیکن یہ تقویٰ ہے۔ اگر کسی نے عمل کر لیا تو ان شاء اللہ ماجور ہوگا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شرکاء نے اگر کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا وکیل بنا دیا ہو تو کمپنی پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، البتہ اگر اثاثے از قبیل آلات (مشینری) ہیں تو وہ مالِ زکوٰۃ میں شمار نہ ہوں گے، چوں کہ آلاتِ صنعت کا استثناء حضراتِ فقہاء نے کیا ہے اور اگر اثاثے از قبیل آلات نہ ہوئے تو مالِ زکوٰۃ میں اس کو بھی شمار کیا جائے گا، اور اگر شرکاء نے کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا وکیل نہ بنایا ہو تو ہر حصہ دار اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے، جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب ہو یا دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر وہ بقدر نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب الأدا ہوگی، اور جس حصہ دار کا حصہ بہ قدر نصاب نہ ہو اور نہ ہی دوسرے اموال زکوٰۃ اس کے پاس ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو بالاتفاق اس میں زکوٰۃ نہیں، چاہے جواہرات کی قیمت جتنی بھی ہو، لہٰذا جو لوگ انکم ٹیکس یا دیگر قوانین سے بچنے کے لیے اپنے سرمائے کو ہیرے و جواہرات کی شکل میں محفوظ کر دیتے ہیں اگر ان کے پاس ہیرے و جواہرات کے علاوہ دیگر اموال زکوٰۃ نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں، اسی طرح خواتین کے پاس اگر ہیرے جواہرات ہوں خواہ تزئین کے لیے ہوں یا تموّل کے لیے

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۳/۴۰

بہ شرطے کہ تجارت کے لیے نہ ہوں ان پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں، چوں کہ ہیرے جواہرات از قبیل احجار ہیں اور احجار میں حجرین (ذہب وفضہ) کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں، چوں کہ ذہب وفضہ کو ثمن خلقی (ثمن مطلق) کی حیثیت حاصل ہے اور ان کے علاوہ باقی از قبیل عروض وسلع ہیں، ہیرے جواہرات بھی از قبیل عروض ہیں اور عروض میں زکوٰۃ نیت تجارت ہی سے واجب ہوتی ہے اس لیے جب تک نیت تجارت نہ ہو ہیرے وجواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفاً اتفاقاً الا أن تکون للتجارۃ والاصل ان ماعدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ" (۱)

"وماعدا ماذکر کالجواهر والعقارات والمواشی العلوفۃ والعبید والثیاب والامتعۃ ونحو ذلک من العروض (۲) ـــــــ وان کانت حلیاً"

لیکن اگر کوئی ہیرے جواہرات کی بھی زکوٰۃ ادا کردے تو یہ تقویٰ ہے وہ ماجور ہوگا، البتہ شرعاً واجب نہیں۔

آراضی کی زکوٰۃ

سونا چاندی کے علاوہ باقی چیزیں عروض میں داخل ہیں اور عروض کے مال زکوٰۃ بننے کے لیے نیت تجارت شرط ہے لہٰذا اگر کوئی شخص زمین بہ نیت تجارت خریدے تو اس کا بھی شمار اموال زکوٰۃ میں ہوگا اور حولان حول کے وقت اس کی جو قیمت مارکیٹ میں ہوگی اسی میں زکوٰۃ فرض ہوگی، قیمت خرید کا اعتبار نہیں۔

"وتعتبر القیمۃ عند حولان الحول الخ" (۳)

لیکن اگر کسی نے زمین رہائش کے لیے خریدی پھر تجارت کی نیت ہوگئی یا تجارت کے لیے خریدی پھر رہائش کی نیت ہوگئی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کی تفصیل در مختار میں موجود ہے۔ (۴)

اموال زکوٰۃ میں کون سی قیمت معتبر ہے؟

اموال زکوٰۃ میں حضرات فقہاء انفع للفقراء کی رعایت کرتے ہیں، چنانچہ بہ کثرت ایسی جزئیات ہیں

---

(۱) درمختار ۲/۲۷۳ (۲) شامی ۲/۲۶۳، الفتاویٰ الهندیۃ ۱/۱۸۰ (۳) هندیہ ۱/۱۶۹ (۴) ۲/۲۶۳

جن میں اس کی تصریح ہے۔ تقویم بالدراھم والدنانیر میں بھی اسی کلیہ کی رعایت کی گئی ہے۔

"انظرھما للفقراء، ومشائخنا حملوا روایۃ کتاب الزکوٰۃ علی ما اذا کان لا یتفاوت النفع فی حق الفقراء بالتقویم بایہما کان" (۱)

ثم ان المعتبر عند محمد الانفع للفقیر من القدر والقیمۃ وعندھما القدر" (۲)

اس لیے مال کی قیمت لگاتے وقت اس پہلو کی رعایت تاجر حضرات کے ذہنوں میں رہنی چاہیے ان کو دیکھنا چاہیے کہ تھوک میں فقراء کا زیادہ نفع ہے یا پھٹکر کی قیمت لگانے میں جس میں فقراء کا زیادہ نفع ہو وہ قیمت لگائیں، لیکن بعض دکانیں تھوک ہی کی ہوتی ہیں وہاں پھٹکر سامان نہیں ملتا، اس صورت میں پھٹکر دکان دار پھٹکر کی قیمت لگائیں اور قیمت کی تعیین لاگت سے نہیں بلکہ حولان حول کے وقت اس کی جو قیمت ہوگی وہی معتبر ہوگی۔

"الزکوٰۃ واجبۃ فی عروض التجارۃ کائنۃ ما کانت اذا بلغت قیمتہا نصابًا من الورق والذھب، کذا فی الھدایہ۔ ویقوم بالمضروبۃ کذا فی التبیین وتعتبر القیمۃ عند حولان الحول الخ" (۳)

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم الوجوب کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا یا یوم الادا، کی قیمت کا، حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک یوم الوجوب کی قیمت معتبر ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک یوم الادا، کی قیمت معتبر ہے، نیز اس شہر کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا جس شہر میں مال ہے، ہیڈ آفس کا اعتبار نہیں۔

"وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء........ ویقوم فی البلد الذی المال فیہ" (۴)

شیئرز

شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ وہ خود بقدر نصاب ہوں یا دیگر اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر بقدر نصاب ہوجائیں اور اصل پونجی میں زکوٰۃ اس وقت فرض ہوگی، جب کمپنی نے اس کو کسی عین میں لگا رکھا ہو، مثلاً

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۸۳ (۲) رد المحتار ۲/۲۸۵ (۳) الفتاوی الہندیہ ۱/۱۶۹ (۴) در مختار ۲/۲۰۶، عالمگیری ۱/۱۸۰

لوہا، سیمنٹ، سامانِ الکٹرک، ریشم وغیرہ، اور اگر کمپنی نے اس کو آلات میں لگا رکھا ہے، مثلاً نقل وحمل کے لیے ٹرک یا بس وغیرہ، تب اصل پونجی میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، چوں کہ آلاتِ صنعت کو حضرات فقہاء نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، چوں کہ سکہ رائج الوقت ثمن خلقی کے حکم میں ہے اور ثمن مطلق میں تقدیراً قوتِ نمو کی وجہ سے مطلقاً زکوٰۃ فرض ہے خواہ تجارت میں وہ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے اور صورتِ مسئولہ میں یہ ثمن مطلق تجارت میں مشغول ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ ہے۔

" غیر ان الاثمان خلقت فی الاصل للتجارۃ فلاتحتاج إلی تعیین العباد للتجارۃ بالنیۃ فتجب الزکوٰۃ فیہا وان لم ینو للتجارۃ او امسك للنفقۃ الخ " (۱)

حولانِ حول کے وقت شیئرز کی جو قیمت ہوگی اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

" وتعتبر القیمۃ عند حولان الحول " (۲)

بونڈ

پرائز بونڈ ہو یا بونڈ سرٹیفکٹ، فکس ڈپوزٹ ہو یا انشورنس یہ سب سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں، اس طرح رقم کو محفوظ کر دینا روحِ شریعت کے خلاف ہے۔

فقہی سمینار عوام کو اس پر متنبہ کرے۔ بونڈس پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے اصل رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ منافع حرام ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہیں۔ بونڈ جب کیش ہوگا اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

" لو کان الدین علی مقر ملئ أو علی معسر أو مفلس إلی أن قال فوصل إلی ملکہ لزم زکوٰۃ ما مضی الخ " (۳)

---

(۱) تحفۃ الفقہاء ۲۶۴/۱

(۲) عالمگیری ۱۷۹/۱

(۳) درمختار ۲۶۶/۲

خلاصۂ جوابات

۱ــــــ ملکِ تام سے مراد ملک و ید (قبضہ) ہے۔

۲ــــــ مالِ مُشتری قبل القبض پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ علامہ سرخسیؒ کی عبارت قابلِ غور ہے۔

۳ــــــ ڈپوزٹ کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر واجب ہے نہ مالکِ مکان پر، وصولی کے بعد دونوں احتمال ہے وجوب وعدمِ وجوب۔

۴ــــــ مدارس واداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

۵ــــــ مالِ حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۶ــــــ مالِ قرض میں مقروض پر زکوٰۃ نہیں، قرض خواہ پر زکوٰۃ ہے، وصولی کے بعد سنینِ ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

۷ــــــ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، آئندہ سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۸ــــــ نامی سے مراد بڑھنے والا مال ہے خواہ وہ حقیقۃً نامی ہو یا تقدیراً۔

۹ــــــ حاجتِ اصلیہ سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کرنے والی ہوں خواہ حقیقۃً دافع ہوں یا تقدیراً۔

۱۰ــــــ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی فحش ومنکر چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔

۱۱ــــــ دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مُطالب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا۔

۱۲ــــــ طویل الأجل دین خواہ زراعتی ہو یا تعمیراتی، دین میں داخل ہے، لہٰذا نصاب سے یہ بھی مستثنیٰ ہوگا۔

۱۳ــــــ اگر کمپنی ادا، زکوٰۃ کی وکیل ہو تو مجموعی مالیت معتبر ہوگی، ورنہ ہر فرد اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے۔

۱۴ــــــ ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں، خواہ اس کی کتنی ہی مالیت ہو، مرد کے پاس ہو یا عورت کے پاس، تمول کے لیے ہوں یا تزین کے لیے۔

۱۵ــــــ سامانِ تجارت کی قیمت حولانِ حول کے وقت کی معتبر ہے، جس نوع کی دکان ہو اس کی نوعیت تقویم میں معتبر ہوگی۔ انفع للفقرا، کی بھی رعایت کی جائے گی۔

۱۶ــــــ اراضی اگر بہ نیت تجارت خریدی گئی ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے اور حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔

۱۷ــــــ شیئرز میں منافع اور اصل پونجی دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے بہ شرطے کہ پونجی آلاتِ صنعت میں نہ لگی ہو، حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔

۱۸ــــــ بونڈس میں لگائی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، نفع واجب التصدق ہے۔ بونڈس جب کیش ہو اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی، اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سوال نامہ کا جواب

از: ——— مولانا سلیمان بلند شہری، ہریانہ

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

(۱) قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک ناتمام رہی اور ملک ناتمام ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ جو رقم مبیع کی قیمت میں بطور پیشگی دی گئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"لأن المراد بالتمام المملوك رقبةً ويداً" (۱)

(۲) کرایہ دار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ یہ ڈپوزٹ صاحب مکان کے ذمہ کرایہ دار کو واپس لوٹا دینا واجب ہے اور کرایہ دار کی ملک ہے جو کہ از قسم دین ہے اور ظاہر ہے کہ زکوٰۃ دین دائن پر ہے نہ کہ مدیون پر۔

(۳) ان پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔

"وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي قوله ملك نصاب فلا زكوٰة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك" (۲)

(۴) اس میں کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔ لعدم الملک۔

---

(۱) شامی ۲/۵ (۲) ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ ۲/۹

ہاں البتہ اگر اس مال حرام میں حلال مال اس طرح مخلوط ہوگیا کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں امام اعظم رح کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ حلال مال مخلوط حرام مال سے بقدر نصاب زائد ہو۔

" ودخل ما ملك بسبب خبيث كمغصوب خلطه اذا كان له غيره منفصل عنه يوفى دينه (قوله دخل) اى فى ملك النصاب المذكور نخ- (وقوله ما ملك بسبب خبيث) .... والمراد بالغير ما تجب فيه الزكوٰة " كذا فى الشامى- (۵/۲)-

(۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوتی ہے نہ کہ مدیون پر۔

کل دیون جن کا مدیون اقراری ہو تین قسم ہے۔

(۱) دین ضعیف (۲) دین قوی (۳) دین متوسط۔

دین ضعیف: ہر وہ قرضہ جس کا دائن بغیر اپنی کوشش اور بغیر کسی چیز کے بدلے مالک ہوا ہو، جیسے میراث کہ یہ بدل مال نہیں۔ یا اپنی کوشش سے تو مال حاصل ہوا مگر بغیر بدلے کے جیسے وصیت یا اپنی کوشش اور بدلے میں مال حاصل ہوا مگر بدل مال نہیں، جیسے مہر۔ بدل خلع۔ بدلِ صلح۔ اس قسم دین میں امام اعظم رح کے تئیں زکوٰۃ واجب نہیں۔

دین متوسط: جو ایسے مال کے بدلے حاصل ہو جو مال تجارت نہ ہو، جیسے خدمت کے غلاموں کی قیمت اور عام استعمال کے کپڑے۔ بقدر نصاب حاصل ہونے پر گزشتہ ایام کی زکوٰۃ لازم ہے۔

دین قوی: وہ قرض ہے جو مال تجارت کے بدلے میں ہو، اس قرض کے نصاب زکوٰۃ کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر ایام گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کرنی لازم ہے۔

" قال فى الفتاوى الهندية [1]: اما سائر الديون المقربها فهى على ثلث مراتب عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلاً عن شئ نحو الميراث او بفعله لا بدلاً عن شئ كالوصية او بفعله بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل

(۱) الفتاوى الهندية ۹/۱

الخلع وبدل الصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لا زكوٰة فيه عنده حتى يقبض نصابًا وحال عليه الحول۔

ووسط[2]: ما يجب بدلا عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة وثياب البذلة اذا قبض مأتين زكى لما مضى فى رواية الاصل۔

وقوى[3]: وهو ما يجب بدلا عن سلعة التجارة اذا قبض اربعين زكى لما مضى، كذا فى الزاهدى۔"

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم دین ضعیف کی فہرست میں آتی ہیں لہٰذا ان رقوم میں زکوٰۃ کا لزوم نہیں آتا جب تک قدر نصاب پر قبضہ نہ ہو اور حولان حول نہ ہو۔

دوسری شرط نما۔

حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے ہوگا۔

" وليس فى دور السكنى او ثياب البدن واثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوٰة لانها مشغولة بحاجته الاصلية. كذا فى الشامى ۲/۶۔"

دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے۔ دین کی قسمیں اور اس کے احکام۔

سوال میں پیش کردہ صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا نہیں کیا جائے گا، بلکہ سالانہ واجب الادا قسط وضع کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ لازم قرار دی جائے گی۔

شامی[1] میں مرقوم ہے:

"(قوله أو مؤجلا) .... والصحيح انه غير مانع"

---

(۱) شامی ۲/۶

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ کمپنی کے ہر شریک کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر ہر شریک کا اپنا حصہ قدر نصاب کو پہونچا ہوا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، مثلاً کمپنی کے دس شرکا، ہیں، اور ان دس شرکا، میں سے دو شریکوں کے حصہ کی مقدار صرف تین تین ہزار ہے تو ان تین تین ہزار روپیہ والے حصہ داروں پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، اور جن کے حصے بقدر نصاب ہیں ان کے ذمہ زکوٰۃ لازم و واجب ہوگی۔

کما فی الدر المختار[1]، فان بلغ نصیب احدھما نصابا زکاہ دون الآخر۔

ہیرے اور جواہرات

جو لوگ انکم ٹیکس اور سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیہ یا سونے چاندی کی صورت میں محفوظ کرنے کی بجائے لاکھوں روپیوں کے ہیرے جواہرات خرید کر کے محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ہیرے جواہرات حاجت اصلیہ میں داخل نہیں ہیں اور بڑی مالیت (جو کم از کم بقدر نصاب ضرور ہوتی ہے) چنانچہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"قال فی الشامی[2]: فی السطر التاسع وھی ھذہ ما زاد علی ذلك من الحلی والاوانی والامتعۃ التی یقصد بھا الزینۃ اذا بلغ نصابا تصیر بہ غنیۃ"

اور بسا اوقات خواتین محض تزئین اور آرائش کے لیے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا۔ ایسے ہیرے، جواہرات پر زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے، اور صحیح تر بات یہ ہے کہ ان ہیرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ شامی میں مرقوم ہے:

" لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفا الا ان تکون للتجارۃ " (۳)

---

(۱) درمختار ۳۶/۲ (۲) شامی ۷/۲ (۳) ایضاً ۱۵/۲

اموال تجارت پر زکوٰۃ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ امداد الفتاویٰ(۱) میں رقم طراز ہیں اور حضرت والا کی یہ تحریر بعینہٖ سوال نامہ کے سوال کا جواب ہے۔

تحریر یہ ہے:

" اس تاجر کو اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ دیتے وقت اس مال تجارت کی قیمت عام نرخ سے لگانی ہوگی، یعنی بیچنے کا نرخ لگانا ہوگا"

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

سوال میں تحریر کردہ عبارت سے واضح ہے کہ بونڈس درحقیقت مقروض کی جانب سے قرض خواہ کے پاس ایک سند ہے، جو اس بات کی شہادت ہے کہ مقروض اتنے قرض کا اقراری ہے اور جس قرض کا مقروض اقراری ہو، نیز وہ قرض بعوض مال تجارت ہو یا بعوض سونا چاندی ہو تو وہ قرض قوی کہلاتا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ اس قرض قوی کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینا قرض خواہ کے ذمہ واجب ہے، مگر ادائیگی بوقت وصولیابی لازم ہوگی، اور چالیس درہم سے کم کی وصولیابی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، لہٰذا وجوب ادا کے لیے کم از کم چالیس درہم پر قبضہ ہونا چاہیے۔ الغرض جتنا وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ایام ماضیہ بھی دینی ہوگی۔

اس فقہی اصول سے معلوم ہوا کہ بونڈس کے کیش کرانے سے قبل اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے، جس وقت بونڈس کو کیش کرایا جائے گا اس وقت اس کی تمام سالہائے ماضیہ کی زکوٰۃ نیز سال رواں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

شامی میں ہے: (۲)

"(قوله عند قبض اربعين درهمًا) قال فى المحيط لان الزكوٰة

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۲ (۲) شامی ۲/۳۸، مکتبہ رشیدیہ، پاکستان

لا تجب فی کسور من النصاب الثانی عنده مالم یبلغ اربعین للحرج فکذلك لا یجب الادا مالم یبلغ اربعین للحرج ذکر فی المنتقیٰ رجل لہ ثلاث مأۃ درهم دین وحال علیها ثلاثة احوال فقبض مأتی (درهما) فعند ابی حنیفة رح یزکی للسنة الاولیٰ خمسة وللثانیة والثالثة اربعة اربعة من مأۃ وستین ولاشئ علیها فی الفضل۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں چاندی کا نصاب اصل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی دونوں ہیں تو اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ کی حرمت وحلت کا مدار چاندی کا بقدر دوسو درہم ہونا معتبر ہوگا یعنی سونے اور چاندی دونوں کی قیمت مل کر اگر دوسو درہم چاندی کی قیمت کو پہونچ گئی تو یہ شخص مذکور صاحب نصاب (غنی شرعی) محسوب ہوگا، اور اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ حرام ہوگی، ورنہ نہیں۔

البحر الرائق[1] میں مرقوم ہے:

"وتضم قیمة العروض إلی الثمنین والذهب إلی الفضة .... حتی ان من کان لہ مأۃ درهم وخمسة مثاقیل ذهب قیمتها مأۃ درهم فعلیہ الزکوٰۃ عنده۔"

مصارف زکوٰۃ

(۱) ملحوظ خاطر رہے کہ ادائے گی زکوٰۃ کے لیے شرط فقیر شرعی کا مالکانہ قبضہ ہے، بصورت مذکورہ فی السوال میں مفقود ہے کہ مال زکوٰۃ پر نہ فقیر شرعی کا قبضہ ہوا اور نہ اس کے وکیل کا۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ فقیر شرعی (طالب علم) نے اہل مدرسہ اپنا چیک سپرد کردیا تو گویا ان کو اپنا وکیل

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۳

بالقبض بنادیا۔ تو جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ اس فقیر شرعی کا قبضہ اصالۃً یا وکالۃً ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اوّل وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ سے خالی ہو اور بعد ازاں اس مال زکوٰۃ پر فقیر شرعی کا قبضہ اصالۃً یا وکالۃً ہو، کہ قبضہ ثانی (فقیر شرعی کا قبضہ) کے لیے قبضہ اول (مزکی کا قبضہ) کا ختم ہونا شرط ہے اور وہ یہاں مذکورہ صورت میں مفقود ہے کہ ابھی وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ میں ہے۔

چنانچہ سوال میں ذکر کی گئی صورت درست نہیں ہے۔

اور یہ صورت بعینہٖ ایسی ہے جیسے مثلاً زید پر بکر کا ایک ہزار روپیہ قرض چاہیئے اور بکر اپنی زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے زید کا ہزار روپیہ پر قبضہ کرائے بغیر اس روپیہ زکوٰۃ کو اپنے پاس رکھے اور ادا زکوٰۃ کی نیت کرلے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں بکر کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

درمختار میں ہے: (۱)

"(هي تمليك) خرج الاباحة فلو اطعم يتيما ناويا الزكاة لم يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم (قوله الا اذا دفع اليه المطعوم) لانه بالدفع اليه يملكه فيصير آكلا من ملكه الخ"

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ امداد الفتاویٰ میں اور حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی صاحب علیہ الرحمۃ مفتیٔ اول دار العلوم دیوبند فتاویٰ دار العلوم میں رقم طراز ہیں کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہوتا ہے اور مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہوتا۔

سوال دوم میں ذکر کی گئی دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

(الف): زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق راقم الحروف کے نزدیک غازی اور مجاہد ہے۔

(ب): صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو اور اس شخص کو اس کام کی انجام دہی میں مال کی ضرورت ہو تو وہ شخص بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس مال سے اس کام کو انجام دے سکے، مثلاً دینی تعلیم اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت۔

---

(۱) درمختار علی هامش رد المحتار ۲/۳-۲

یعنی فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ان امور اسلامیہ کو انجام دینے والے حضرات اسی وقت مستحق زکوٰۃ ہوں گے جب کہ وہ فقیر شرعی ہوں۔

شیخ ابن ہمام رح نے بھی یہ بات فتح القدیر میں کہی ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ کو قیاس شرعی کا محل قرار دے کر آٹھ مصارف کے علاوہ کچھ دوسری قسموں کو مصارف زکوٰۃ سے ملحق کرنے پر فقر کا خاص لحاظ رکھا جائے گا۔

اس شرط کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاد فکری اور اس کی دوسری اقسام میں صرف زکوٰۃ کی جا سکتی ہے جب کہ مستحقین زکوٰۃ کا اس مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ ہو، اگر مالکانہ قبضہ نہ ہوا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اور آیت "انما .... میں حصر راقم الحروف کے خیال میں حصر حقیقی ہے حصر اضافی نہیں۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح نے آیت میں حصر کو جو حصر اضافی بیان کیا ہے وہ بہ نسبت طلب منافقین کے ہے۔

نیز حضرت شاہ صاحب نے جو دلیل حصر اضافی کی بیان فرمائی ہے وہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے۔

مزید برآں جملہ فقہا، مجتہدین جب مصارف زکوٰۃ کو ان ہی آٹھ اصناف میں محصور فرماتے ہیں تو ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی بات کہاں قابل قبول ہو سکتی ہے۔

(۶) ہر امر میں تو قوت دلیل ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر اس قوت دلیل ہی سے صرف نظر کر لی جائے تو پھر قابل اعتبار کیا چیز رہے گی، کسی چیز کا معیار اعتبار باقی نہ رہنے پر سقم وصحت ہی لاپتہ ہو جائے گی۔ چنانچہ مجتہدین کی طے کی ہوئی راہ کو حالات سے متاثر ہو کر ترک کر دینا اپنے کو بے راہ روی میں مبتلا کرنا ہے۔

بنابر ہذا راقم الحروف کے خیال میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت کی گنجائش نہیں کہ اس وسعت کی وجہ سے ہم جیسے لوگ مجتہد فی الشرع تک کا ساتھ چھوڑ دیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم

زکوٰۃ کے متعلق سوالات کے جوابات

از ——— مولانا افضال الحق — مہتمم دارالعلوم گورکھپور

ا ——— زکوٰۃ کے چند مسلمہ اصول ہیں انہیں مستحضر رکھیے تو تمام سوالات حل ہو جائیں گے ۔

اصول:— زکوٰۃ ہر اس مسلمان آدمی پر فرض ہے جو مالک نصاب ہو .... وغیرہ ۔

اصول:— زکوٰۃ کے لیے نصاب کی ملکیت اور قبضہ دونوں لازم ہیں دونوں کا نام ہے ملکیت تامہ ۔

اصول:— مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب تین طرح ہے ۱؎ اگر پالتو ہیں تو ان کی تعداد پر ہے ۲؎ اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان کی سال ادائے گی کی مارکیٹ رٹ پر ہے ۳؎ اگر ان کے دودھ، انڈے، بال کی تجارت مقصود ہے تو ان چیزوں کی مارکیٹ قیمت پر ہے ۔

اصول:— زمین، مکان یا جائداد کی تجارت کرنے والے پر زکوٰۃ ان کی قیمت پر ہے کہ جس دن سال پورا ہوا اس روز کل مالیت کیا تھی ۔

اصول:— آلاتِ تجارت یا زراعت یا معاش پر زکوٰۃ نہیں اس کی پیداوار پر ہو گی، اور پیداوار پر موسم زمین کی نوعیت اور حکومت کی حیثیت کے مطابق ہو گی ۔

اصول:— اس حکومت کا مالی نظام سود پر ہی چل رہا ہے، جب کہ شریعت سود کو ہر طرح حرام قرار دیتی ہے اس لیے جب دونوں قانون ٹکرائیں تو بھی شریعت کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے، الّا اینکہ کوئی شدید خطرہ ہو تو حتیٰ المقدور سود سے پرہیز کرنا چاہیے ۔

ان اصولوں کی روشنی میں آپ کے سوالوں کے جوابات عرض ہیں :

سوال۱۔ زکوٰۃ شیئرز کی قیمت پر ہے یا اس کی آمدنی پر؟

جواب • حصص کی خریداری کے لیے آپ نے پانچ ہزار کی رقم جو کمپنی کو دی ہے وہ رقم آپ کی ملک ہے مگر قبضہ کمپنی کا ہے اس لیے ملک تام کے بغیر اس پر زکوٰۃ ابھی واجب نہیں ہے۔

• اس رقم کی جو اس پر آپ کو ملی ہے وہ رقم نہیں ہے بلکہ شیئر ہے، جو رقم دلا سکتی ہے۔ اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

• حصص اگر فرد تجارتی سامان بن جائیں تو بھی زکوٰۃ اس رقم پر آئے گی جو آپ کے قبضے میں آیا ہے اور باقی ہو کیوں کہ آلات تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

• اگر حصص کمپنی کے اندر رہیں اور بطور سامان اس کی قیمت کم و بیش ہو سکتی ہے تو آپ کے قبضے میں جو رقم آئے گی اس رقم مقبوضہ پر زکوٰۃ ہوگی، اور اگر آپ نے پیشگی زکوٰۃ دیدی تو بہتر ہے اگرچہ واجب اس وقت ہوگی جب رقم آپ کے قبضے میں آئے گی۔

سوال۲۔ مشترکہ کاروبار پر زکوٰۃ

- کمپنی کا مینجر تمام سرمایہ کا امین ـــ مالک نہیں ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔
- ہاں اگر فیکٹری ہے اور شخصی ملکیت ہے تو اس پر سالانہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- ہر حصہ دار پر زکوٰۃ ہے مگر اس رقم پر جو اس کے قبضے میں آگئی جس سے ملکیت تام ہوتی ہے۔
- حصے دار کی جو رقم کمپنی میں ہے وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے صرف ملکیت ہے اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

سوال۳۔ زکوٰۃ انڈے پر ہے یا مرغیوں پر؟

- اگر مرغی فارم میں ہے اور مرغیاں فروخت ہوتی رہتی ہیں تو مرغیوں کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ وہ سامان تجارت ہیں۔
- اگر صرف انڈے فروخت ہوتے ہیں تو مرغیوں سے مطالبہ نہیں کیوں کہ وہ آلات تجارت ہیں۔

• اگر دودھ کا فارم ہے تو دودھ کی قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، بھینس کی قیمت وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں کیوں کہ وہ اب آلہ تجارت ہیں ہے سامانِ تجارت نہیں ہے۔

• مرغی فارم میں اگر انڈے اور مرغی دونوں کی فروختگی ہوتی ہے تو دونوں کی صرف مالیت پر زکوٰۃ ہے اور انڈے مرغیوں کے لیے پھل کے طور پر ہوں گے جو شامل ہوں گے۔

جواب تجارت خواہ کسی چیز کی ہو تاجر کا کھانا، کپڑا اور مکان تینوں پر جو بھی خرچ ہوا ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں تھا، اس خرچ کے سوا بچی ہوئی آمدنی پر جس کی ضرورت سال بھر نہیں ہوئی اس پر زکوٰۃ ہے یا جو تجارت ہوتی رہی اس پر زکوٰۃ ہے۔

• کھانے، کپڑے اور مکان کی حیثیت مالک یا تاجر کی اپنی حیثیت کے لوگوں میں مڈل کلاس اور اوسط درجے کے لوگوں کی مانی جائے گی، لہٰذا انڈے کا دوکاندار سائیکل رکھ سکتا ہے اور پولٹری فارم والا اسکوٹر، مل مالک کی حیثیت موٹر والے کی حیثیت ہے یہ سب ذاتی اخراجات ہوں گے۔

سوال۔ زمین داری بانڈ کا سود؟

زمین شرعی طور پر میری ملک ہے مگر کیمونزم میں ملکیت ختم اس لیے خاتمۂ زمین داری کے بعد زمین سے بے دخل کرنا شرعاً غلط تھا اور قانوناً صحیح تھا، اگرچہ اب قانون میں بھی غلط ہو جائے گا۔

اور جب زمین کا مالک ہی تھا تو میری مرضی کے بغیر اسے لینا غصب کرنا ہے، ایسے میں جو رقم ادا کی جا رہی ہے یا بانڈ دیا گیا اور اس پر انٹرسٹ دیا گیا، وہ سب کا سب میری زمین کا معاوضہ ہے۔ اس میں سود کچھ نہیں ہے، بنیادی غلطی قانون کی ہے۔

• اگر ظلم اور زیادتی سے بانڈ خرید کر بیچ سکتے ہیں تو خریدنا جائز ہوگا تاکہ اپنا مال بچایا جا سکے لیکن اس رقم پر جو انٹرسٹ ہوگا وہ سود ہوگا اسے حاصل کر کے غرباء پر تقسیم کر دے۔

• فکس ڈپازٹ میں ہماری اپنی رقم سے جو بھی زائد ملتا ہے وہ بلا معاوضہ ہے، اس لیے سود ہے اسے بھی حاصل کر کے غرباء کو تقسیم کر دینا لازم ہے۔

• زمین، جائداد اور مکان خریدنا صرف مال کی حفاظت کے لیے یا تجارت کر کے نفع کے لیے درست ہے اور اس سے نفع کمانا بھی درست ہے، زکوٰۃ مالیت پر ہوگی زمین پر نہیں اس کا نفع انٹرسٹ

نہیں ہے نفع ہے ۔

• جوا اور قمار حرام ہے اس لیے کہ اس میں نفع و نقصان متعین نہیں، لیکن اگر دونوں کا امکان ہے اور ہم اس میں دخل دے کر یا بصیرت پیدا کر کے اس پر قابو پا سکتے ہیں تو وہ جواز نہیں ہے اس لیے حصص کی قیمت، کمپنی کی ساکھ، بازار کے دباؤ یا بین الاقوامی حالات سے گھٹتے بڑھتے ہیں اس کی خرید فروخت میں عقل، تجربہ اور بصیرت کی ضرورت ہے، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، الا اینکہ کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

زکوٰۃ

از: ——— محمد محی الدین بڑوودوی، دارالافتاء دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر (سورت) گجرات

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذی یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اُوتی
خیرا کثیرا، والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد المبعوث کافۃ للناس
بشیراً ونذیراً ٥ وعلیٰ آلہ وصحبہ الذین ھم اتفقوا فی الدین فصاروا
ھداۃ واسوۃ للفقہاء المجتہدین لیلاً ونہاراً ٥

اَمّا بَعدُ :

محترم قارئین کرام! امسال اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے جو سوالنامہ جاری کیا گیا اس کے جواب میں مختصر سی معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ امید کہ بنظر تحقیق و تصحیح مطالعہ فرمائیں گے۔ فان کان صوابا فمن اللہ وان کان خطاء فمنی۔

محور اوّل

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے وہ تین قسم پر مشتمل ہیں:

اوّل: اثمان مطلقہ، سونا اور چاندی جو طبعی طور پر اموال تجارت ہیں۔ دوم: اموال تجارت یعنی وہ سامان و اسباب جو تجارت کی غرض سے تیار کیا گیا یا خرید ا گیا ہے۔ سوم: سوائم وہ جانور جو سائمہ ہیں [۱]

مذکورہ اموال پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے پانچ شرائط ہیں: (۱) مطلق ملک (۲) ملکِ مطلق یعنی ملکِ تام (۳) نماء، خواہ حقیقۃً ہو جیسے اموال تجارت اور سوائم، خواہ نماء حکماً ہو جیسے

---

[۱] بدائع ۲/۱۱

سونا اور چاندی (۴) مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا جس کی وجہ سے غنا کا تحقق ہوتا ہے (۵) حولان حول، اس لیے کہ مال میں نماء کے حصول کی خاطر مدت درکار ہے اور استنماء کے لیے کم از کم ایک سال چاہیے،

ملک تام کی تعریف

"وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويدًا وهذا قول اصحابنا الثلاثة، وقال زفرؒ اليد ليست بشرط وهو قول الشافعيؒ"

"ملک تام یہ ہے کہ مال کی ذات پر ملک ہو اور وہ مال قبضۂ مالک میں بھی ہو، حضرت زفرؒ و شافعیؒ کے یہاں ملک تام میں قبضہ مشروط نہیں ہے"۔

"والمراد بالملك التام القدرة على التصرف من غير ان يلزم بهذا التصرف تبعة في الدنيا ولا في العقبى"[1]

"ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو تصرف پر اس طرح قدرت حاصل ہو کہ تصرف سے اس پر کوئی مواخذہ دنیوی یا اخروی عائد نہ ہوتا ہو"۔

ملک تام کی روشنی میں آپ کے سوالات کے جواب مطالعہ فرمائیں:

جواب ۱ ــــ مبیع کے قبضہ مشتری میں نہ آنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱ ــــ بیع سلم میں قیمت کی ادائیگی کے بعد مبیع سپرد کرنے کا وقت آنے تک مبیع مشتری کے قبضہ میں نہیں ہے۔

۲ ــــ خیار شرط کی بنا پر بائع کے قبضہ میں ہو۔

۳ ــــ بلا کسی شرط کے مبیع بائع کے قبضہ میں ہو۔

۴ ــــ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو چکی ابھی راہ میں ہے۔

۵ ــــ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو کر گم ہو گئی ابھی مشتری تک نہیں پہونچی، البتہ ریلوے یا ٹرانسپورٹ وغیرہ کا وثیقہ (رسید) موجود ہے۔

---

[1] حاشیۃ رد المحتار ۲/۲۶۰۔

۶ــــــــ راہ میں گم ہوئی لیکن کوئی وثیقہ موجود نہیں، جیسے آنگڑیا کی معرفت۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں ملک تام کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر بائع کو جو قیمت پہونچ چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر قیمت مستفاد فی النصاب ہے۔ تو حولان حول کے بغیر زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی قیمت سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ بائع رقبۃً و یداً قیمت میں متصرف ہے۔

اور مذکورہ بالا جملہ صورتوں میں مشتری پر قبضہ مبیع سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ مشتری متصرف نہیں ہے۔ قبضہ سے پہلے مشتری کے لیے مبیع کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگرچہ قبضہ سے پہلے پورا سال گزر جائے تب بھی مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مبیع خواہ ریلوے سے بائع نے روانہ کی ہو یا ٹرانسپورٹ سے خواہ راہ میں گم ہوکر وثیقہ موجود ہو یا نہ ہو، یہ بائع کی طرف سے روانگی ترسیل ہے۔ اور ترسیل بائع کی صورت میں مبیع جب تک مشتری کے پاس پہونچ نہ جائے تسلیم مبیع ثابت نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں رقمطراز ہیں:

"ولذا لم يجب في مال الضمار ويخرج ايضاً المال المشتراة للتجارة اذا لم يقبض حتى حال حول لا زكوٰة فيه اذ لم يستفد ملك التصرف"[1]

اور علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

"وخرج به ايضاً كما في البحر المشتري التجارة قبل القبض والأبق المعد للتجارة"[2]

ریلوے ٹرانسپورٹ کے ذریعہ بائع مال بھیجتا ہے تو یہ ترسیل ہے، ترسیل میں تسلیم نہیں ہوتی، ہاں توکیل میں تسلیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر مشتری نے ایک شخص کو معین کر دیا کہ مال اس کو دیدینا اور اس معین شخص نے ذمہ داری لے لی تو یہ شخص مشتری کا وکیل ہوگیا۔ جب اس نے مال پر قبضہ کر لیا تو اصیل کا قبضہ شمار ہوگا۔ اس لیے اس صورت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

---

[1] فتح القدیر ۱/۴۸۲ [2] رد محتار ۲/۲۶۰۔

چنانچہ حضرت علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :

" قال للبائع زنه لهٗ وابعثهٗ مع غلامك او غلامي فعل وانكسر الوعاء في الطريق فالتلف من البائع الا ان يقول ادفعه الى الغلام لانهٗ توكيل للغلام والدفع اليه كالدفع الى المشتري[1] "

" مشتری نے بائع سے کہا کہ تم اس کو تول لینا اور اپنے یا میرے غلام کے ساتھ اس کو بھیج دینا بائع نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں برتن ٹوٹ گیا، تو بائع کا نقصان شمار ہوگا مگر یہ کہ مشتری نے بائع سے اس طرح کہا کہ اس غلام کو مال دیدینا (اور غلام نے ذمہ داری لے لی) تو یہ غلام کو وکیل بنانے کی صورت ہوگئی اور غلام کو دیدینا مشتری کو دیدینے کے حکم میں ہوگا، پہلی صورت ترسیل کی ہے دوسری صورت توکیل کی ہے۔ "هذا توكيل والاول ترسيل"[2]

اسی طرح فرماتے ہیں :

" اشترى في المصر حطبا فغصبه غاصب حال حمله الى منزله فمن البائع لان عليه التسليم في منزل الساري للعرف[3] "

" شہر میں لکڑیاں خریدیں پھر مشتری کے گھر پہونچاتے وقت کسی غاصب نے لکڑیاں غصب کرلیں۔ تو بائع کی لکڑی گئی۔ اس لیے کہ بائع پر مشتری کے گھر پہونچا کر سپرد کرنا ضروری ہے، عرف کی بناء پر۔

علامہ رافعیؒ فرماتے ہیں :

" لا دخل لهذا العلة في الحكم بل العلة هي تحقق الهلاك قبل التسليم ولا فرق بين كون المبيع حطبا او غيره "

" عرف کو اس میں دخل نہیں ہے بلکہ اصل علت تسلیم سے پہلے ہلاکت کا تحقق ہے، اسی طرح مبیع لکڑی ہو یا دوسری چیز حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا"

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر مشتری نے کسی کو وکیل بنا دیا ہے تو وکیل کا قبضہ مؤکل

---

[1] رد المحتار ۴/۵۶۳ [2] تقریرات رافعی ۴/۱۱۹ [3] رد المحتار ۴/۵۶۳۔

کا قبضہ شمار ہوگا، اور تسلیم کامل ہو جائے گی، اور اگر مشتری نے کسی کو وکیل نہیں بنایا تو اس صورت میں اگرچہ مشتری کے امر سے مال بھیجا ہو وہ ترسیل میں داخل ہے، اور ترسیل کی صورت میں تسلیم الی المشتری اس وقت متحقق ہوگی جب مال مشتری کے قبضہ میں پہونچ جائے۔

اس لیے ریلوے ٹرانسپورٹ، آنگڑیہ وغیرہ ذرائع سے بائع کا مال بھیجنا ترسیل ہے، اس صورت میں قبضہ مشتری سے پہلے تسلیم ثابت نہیں ہوتی اور قبضہ بھی نہیں ہے، اور جو مال مشتری کے قبضۂ تصرف میں نہ آیا ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے اگرچہ مشتری نے قبضہ کرنے کے بعد مال روانہ کیا یا مشتری نے ریلوے ٹرانسپورٹ وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے بائع سے مال منگوایا ہے تو ریلوے وغیرہ مشتری کے وکیل ہوں گے، ایسی صورت میں مال وصول ہونے پر قبضہ کے وقت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جملہ صورتوں میں بائع پر مبیع کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ مبیع بائع کی ملک سے نکل گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جوابؐ — ڈپوزٹ: ڈپوزٹ میں مالک مکان کو عرفاً حق تصرف حاصل ہوتا ہے اور ڈپوزٹ سے مقصد بھی تصرف وانتفاع ہے اس لیے ودیعت ورہن سے اس کی حیثیت کچھ مختلف ہے۔ اس لیے مالک پر دین دقرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے اور خود کرایہ دار (صاحب ڈپوزٹ) کے لیے بھی مالک مکان پر قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے۔

مستقرض قرض کا مالک ہو جاتا ہے، طرفینؒ کے یہاں تو صرف قبضہ سے مالک ہو جاتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرض میں تصرف سے مالک ہو جاتا ہے، اس لیے صاحب مکان پر اس رقم کی زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر یہ رقم مشغول بالدّین نہ ہو۔ یعنی اس کے پاس ڈپوزٹ کے علاوہ رقم ضرورت سے زائد بقدر نصاب موجود ہو، جو ڈپوزٹ کے دین کو ادا کرنے کے لیے کافی ہو، اس صورت میں اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو ڈپوزٹ مال مستفاد میں داخل ہو کر سال رواں کے حساب میں آجائے گی، ورنہ حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر ڈپوزٹ مؤجل ہے، طویل مدت مقررہ تک کرایہ دار کی طرف سے مطالبہ کا اندیشہ نہیں ہے تو دین مؤجل کے حکم میں آجائے گی۔ جس کا بیان دین کے ذکر میں آرہا ہے۔

اور کرایہ دار کا مالک مکان پر یہ دین قوی ہے۔ قرض دین قوی میں داخل ہے، اس لیے واپس ملنے کی صورت میں سالہائے گذشتہ کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔

حضرت علامہ علاءالدین حصکفی فرماتے ہیں:

"ويملك المستقرض القرض بنفس القبض عندهما اى الامام ومحمد خلافا للثانى. القرض لا يتعلق بالجائز من الشروط فالفاسد منها لا يبطله ولكنه يلغو شرط شئ آخر"[۱]

جواب ــــ اجارہ کی رقم پیشگی ادا کر دینے کی صورت میں مالک مکان پوری رقم کا مالک فوراً نہیں ہو جاتا، بلکہ اجارہ میں ملک ساعۃً فساعۃً بدلین میں ثابت ہوتی ہے اس لیے کم از کم ایک دن گزرنے پر ایک روز کے کرایہ کا مالک بنے گا، بقیہ رقم ودیعت سمجھی جائے گی، کرایہ دار کی رقم کرایہ دار کی ملک سے نکلی نہیں ہے۔ فسخ کرایہ پر واپس مل سکتی ہے اس لیے کرایہ دار پر اپنی رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کرایہ دار کی جس قدر رقم حولان حول سے قبل کرایہ میں مستحق بنے گی، زکوٰۃ سے خارج ہو جائے گی، اور حولان حول کے وقت جو رقم مستحق نہیں بنی ہے حساب زکوٰۃ میں معدود ہوگی۔

مالک مکان پر پوری رقم کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، بلکہ جس قدر کرایہ کا وہ مستحق بن رہا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس قدر رقم کا مستحق بن گیا ہے وہ رقم مال مستفاد میں شمار ہو کر دوسرے مال زکوٰۃ کے ساتھ حساب میں آجائے گی، حولان حول شرط نہیں۔ اگر وہ پہلے سے صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ مستحق کرایہ سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو زکوٰۃ کی دیگر شروط کے ساتھ حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

"وحكمها وقوع الملك فى البدلين ساعة فساعة (درمختار) لان المنفعة عرض لا تبقى زمانين فاذا كان حدوثه كذلك فى ملك بدله كذلك قصدا للتعادل"[۲]

جواب ــــ مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم وقف ہے کسی کی ملک میں نہیں ہے زکوٰۃ کی رقم ہے تو اس پر دوبارہ زکوٰۃ نہیں، اس کی تملیک کے بعد مالکین پر صاحب نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ آئے گی۔ وقف کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اس لیے کہ (مطلق ملک (شرط) مفقود ہے۔

"واما الشرائط التى ترجع الى المال فمنها الملك فلا تجب الزكاة فى سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لان فى الزكاة تمليكا والتمليك فى غير الملك لا يتصور"[۳]

---

[۱] درمختار مع الشامی ۱۶۳/۵ [۲] شامی ۵/۶ [۳] بدائع ۹/۲۔

جوابؒ ـــــ جو مال بطور حرام کسی کے پاس آیا، جیسے رشوت کا مال یا سود کا مال یا مغصوب مال اگر علیحدہ محفوظ ہو تب تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، ہاں اگر اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ تمیز مشکل ہے تو اب حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق اس شخص کے ذمہ میں مال غیر کا ضمان لازم ہو گیا کیوں کہ مال غیر مستہلک ہو گیا اور جب مال غیر کا ضمان ذمہ میں واجب ہو گیا تو مخلوط مال پورا اس کا مملوک بن گیا، اس لیے اس مال پر زکوٰۃ لازم ہو گی، پورے مال پر زکوٰۃ آئے گی، وراثت بھی جاری ہو گی۔

اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے مال غیر کے مال سے مخلوط رہتے ہیں، وراثت کی باقاعدہ تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے، قمار، ربوا، رشوت اور غصب کی بنا پر۔ اس لیے مالکین کے لیے تمیز و حساب دشوار ہے تو مالکین پر سہولت کی خاطر، نیز فقراء کے لیے بھی انفع ہے، اس لیے زکوٰۃ پورے مال پر لازم ہو گی۔

لیکن مخلوط مال پر زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہے کہ جب مخلوط مال کے علاوہ حلال مال علیحدہ موجود ہو جو بقدر نصاب بھی ہو اور فاضل عن الحاجۃ والدَّین بھی ہو، جس میں خود مال حرام کا دین بھی شامل ہے اسی طرح اگر مخلوط مال میں حلال حصہ نصاب زکوٰۃ کو پہونچ جاتا ہے اور علیحدہ حلال مال مخلوط مال میں مال حرام کے دیون کو پورا کر دیتا ہو تب زکوٰۃ پورے مال مخلوط پر آئے گی۔

"لو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب فيه الزكوٰة ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تميزه عند ابى حنيفة وقوله ارفق اذ قلما يخلو مال عن غصب وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى دينه والا فلا زكوٰة ـ اى ما اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط يفضل عنه فلا يحيط الدين بماله اھ اى يفضل منه ما يبلغ نصابا كما كون الكل خبيثا" فى القنية لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه اھ ومثله فى البزازية"[1]

یعنی اگر پورا ہی مال خبیث ہو تو واجب التصدق ہی ہے پھر اس کے بعض حصہ کو زکوٰۃ کی حیثیت

---

[1] در مختار۔ رد المحتار ۲/ ۲۹۱۔

سے واجب التصدق کہنے میں کوئی نیا فائدہ نہیں ہے۔

جواب[1] ـــــ " وجملة الكلام في الديون انها على ثلاثة مراتب في قول ابي حنيفة دين قوي ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشائخنا اما القوي فهو الذي وجب بدلاً من مال التجارة كثمن عوض التجارة من ثياب التجارة وعبيد التجارة او غلة مال التجارة ولاخلاف في وجوب الزكاة فية الا انهٗ لا يخاطب باداء شئ من زكات ما مضى ما لم يقبض اربعين درهما فكلما قبض اربعين درهما ادى درهماً واحداً (عند ابي حنيفة) وعند ابي يوسف ومحمد كلما قبض شيئاً يؤدي زكوٰتهٗ قل المقبوض اوكثر، واما للدين الضعيف فهو الذي وجب لهٗ لا بدلاً من شئ سواء وجب لهٗ بغير صنعه كالميراث او بصنعه كالوصية اووجب بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الكتابة ولا زكاة فيه ما لم يقبض كلهٗ ويحول عليه الحول بعد القبض۔

واما الدين الوسط فما وجب لهٗ بدلاً عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه الروايتان عنهٗ ذكر في الاصل انهٗ تجب الزكاة فيه قبل القبض لكن لا يخاطب بالاداء ما لم يقبض مأتي درهم فاذا قبض مأتي درهم زكى لما مضى۔ وروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة انهٗ لا زكاة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنهٗ وقال ابو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوية تجب فيه الزكات قبل القبض الا الدية على العاقلة ومال الكتابة فانهٗ لا تجب فيه الزكاة اصلاً ما لم يقبض ويحول عليه الحول[1]"

دین کی تین قسمیں ہیں۔ دینِ قوی، دینِ ضعیف، دینِ وسط۔ دین قوی وہ ہے جو کسی

---

[1] بدائع ۲/۱۰۔

کے ذمہ میں مال تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہو۔ جیسے مالی تجارت کا ثمن، خواہ کپڑے یا غلام کا ثمن ہو، یا مال تجارت کی آمدنی ہو، دین قوی کے اندر وجوب زکوٰۃ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ مدت کی ادائے گی کا مکلف نہیں ہے جب تک کہ چالیس درہم قبضہ میں نہ آجائیں، جب چالیس درہم قبضہ میں آجائیں تب ایک درہم زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اور صاحبین رح کے نزدیک جس قدر مقبوض ہو کم یا زیادہ مقبوض کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔ دین ضعیف وہ ہے جو کسی کے ذمہ بلا بدل کے واجب ہوتا ہے، خواہ اس کے وجوب میں بندہ کے فعل کو دخل ہو۔ جیسے مال وصیت یا بندہ کا فعل دخیل نہ ہو، جیسے میراث اور دین ضعیف اس حق کو بھی کہتے ہیں جو غیر مال کے بدلہ میں لازم ہوتا ہے۔ جیسے مہر، بدل خلع اور بدل صلح عن القصاص نیز بدل کتابت، اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے دین میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، جب تک پورا مال قبضہ میں آکر اس پر سال گزر نہ جائے۔

دین وسط وہ دین ہے جو مال غیر تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہے۔ جیسے خدمت کے غلام کا ثمن یا روزانہ استعمال کے کپڑوں کی قیمت حضرت امام ابو حنیفہؒ سے اس دین کے حکم کے بارے میں دو روایات ہیں۔ اصل میں مذکور ہے کہ دین وسط میں قبل القبض زکوٰۃ تو واجب ہوتی ہے لیکن ادا کا مکلف نہیں ہے جب تک پورے دو سو درہم مقبوض ہو نہ جائیں، جب دو سو درہم مقبوض ہو جائیں گے، گزشتہ مدت کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

اور ابن سماعہؒ کی روایت عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ یہ ہے کہ دین وسط میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے یہاں تک کہ دو سو درہم (نصاب کامل) مقبوض ہو کر اس پر قبضہ کے بعد ایک سال گزر جائے دونوں روایتوں میں اصح روایت یہی ہے، صاحبینؒ فرماتے ہیں، دین سب برابر اور سب قوی ہیں (فرق درجات نہیں ہے) سب سے زکوٰۃ قبضہ سے قبل ہی واجب ہو جاتی ہے۔ سوائے دیت علی العاقلہ اور مال کتابت کہ اس میں زکوٰۃ بالکل واجب نہیں ہوتی، یہاں تک کہ قبضہ کے بعد سال گزر جائے۔ انتہی۔

دین میں اس حیثیت سے کہ ذمہ میں ایک حق ہے (کوئی مال مملوک رقبۃً ویدًا نہیں ہے) اس لیے زکوٰۃ بالکل واجب ہونا ہی نہ چاہیئے، جس طرح مال ضمار میں قبضہ نہ ہونے کی بنا پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی

اسی طرح تمام دیون میں قبضہ نہ ہونے کی بنا، پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا چاہیئے، لیکن دین قوی (جس میں قرض بھی شامل ہے، فتح القدیر) مال تجارت کا بدل ہے۔ اور مالِ تجارت جو مبدل ہے قبضہ کے قابل ایک عین ہے جس طرح مبدل (مبیع) مملوک رقبۃً و یداً ہے، بدل (ثمن) بھی مملوک رقبۃً و یداً سمجھ لیا گیا، اس لیے اس میں زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔

اسی طرح دین وسط میں بھی صحیح روایت کی بناء پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔ کیوں کہ بدل مال غیر تجارت ہے، چنانچہ مال غیر تجارت جب کہ حقیقۃً مقبوض ہو تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی تو بدل کے اندر بھی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، مقبوض ہونے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئولہ صورت میں اگر دین سے مراد قرض ہے تو قرض پر مقرض کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے کیوں کہ قرض دین قوی ہے اگرچہ ید تصرف اس پر حاصل نہیں ہے، اور مستقرض بھی اس قرض کا مالک بن چکا ہے، اگر یہ قرض مشغول بالدین ہے۔ تو مستقرض پر زکوٰۃ واجب نہیں، اگر قرض مشغول بالدین نہ ہو اور نصاب تک پہونچ جاتا ہو تو مستقرض پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اگر قرض نصاب تک نہیں پہونچتا، اور مستقرض پہلے سے صاحب نصاب خالی عن الدین ہے تو قرض مال مستفاد میں شمار ہو جائے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی، ٹال مٹول مؤثر نہ ہوگی۔ قرض مشغول بالدین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض مؤجل ہو طویل الاجل ہو۔ مثلاً دس سال یا پانچ سال کے بعد ہی ادا کرنا ہے، اس سے پہلے کوئی مطالبہ نہیں ہوگا، تو اس صورت میں جیسے کہ آئندہ آرہا ہے، مستقرض پر قرض کی زکوٰۃ آئے گی۔

اگر قرض کے سوا کوئی اور دین قوی ہے مال تجارت کا بدل ہے تو دائن (بائع) پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جب مشتری کے پاس سے ثمن وصول ہوگا، ماضی کی زکوٰۃ لازم ہوگی، جس قدر وصول ہوتا جائے زکوٰۃ ادا کرتا جائے یا کم از کم چالیس درہم وصول ہونے پر زکوٰۃ ادا کرے گا۔

مدیون (مشتری) کے پاس مال تجارت آچکا ہے اس کا حساب مال تجارت میں ہوگا، مشتری پر بائع کا جو ثمن ذمہ میں باقی ہے۔ مشتری اس کا مالک نہیں ہے، نہ مشتری کا ثمن پر بحیثیت محسوس کوئی قبضہ ہے، مشتری اس لیے مالک نہیں ہے کہ وہ مبیع کا مالک بن چکا اگر بدل کا مالک ہو تو بدلین کا ایک ملک میں اجتماع ہو جائے گا۔ جو ظاہر الفساد ہے اس لیے مشتری پر ٹال مٹول کرنے کی صورت میں کوئی زکوٰۃ ثمن پر نہیں آئے گی، ٹال مٹول کا گناہ ضرور ہوگا اگر بے وجہ ہو۔ کیوں کہ جو مال تجارت میں مشتری

نے لگایا ہے وہ خود مشتری کا ہے۔ "الدَّرَاهِمُ وَالدَّنَانِيرُ لَا تَتَعَيَّنُ فِي العُقُودِ"۔

ہاں اگر ثمن عرض غیر معین ہو تو جب تک مشتری کے عرض تجارت میں شامل ہے تو عرض تجارت کی مجموعی زکوٰۃ میں شامل رہے گا۔ مشتری کے ذمہ زکوٰۃ آئے گی، عرض معین یا منفصل ہو تو مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ مالک نہیں ہے، اور بائع پر دونوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ تسلیم نہیں ہوئی اور ید تصرف حاصل نہیں ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب ـــــ پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف میں داخل ہے کیوں کہ بدل "مَا لَيْسَ بِمَالٍ" ہے اجرت ہے اس لیے اس میں مجموعی رقم میں گزشتہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، وصول ہونے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو مال مستفاد میں شمار ہوگا، اگر ایسا اجیر ہے جس کو ملازمت میں اپنا کچھ مال لگانا پڑتا ہو، جیسے صباغ (رنگریز) کہ رنگ اپنی استعمال کرتا ہے تو رنگ کی قیمت مستاجر پر دین قوی میں داخل ہو کر اس کی زکوٰۃ وصول ہونے پر ادا کی جائے گی۔

دوسری شرط نماء

نماء کا معنیٰ زیادت و اضافہ ہے، مال نامی میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

نماء خواہ حقیقۃً مال میں ہو رہا ہو جیسے اموال تجارت اور سائمہ جانور۔ خواہ نماء حکماً موجود ہو جیسے سونا، چاندی میں۔ لیکن کسی بھی صورت میں نماء کا بالفعل ہونا ضروری نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ مال کو طلب زیادت کے لیے تیار رکھنا، خواہ بالفعل زیادت ہو رہا ہو جیسے دکان کھلی ہے اور بکری جاری ہے، یا تقدیراً نماء موجود ہے جیسے دکان بند ہے آٹھ دس روز کے لیے یا کھلی ہے مگر گاہک نہیں ہے تو اگرچہ بالفعل نماء نہیں ہے لیکن تقدیراً اس کو مال نامی کہتے ہیں، اسی طرح سونا اور چاندی کہ فطرۃً نماء کے لیے ہے، کسی بھی تجارت میں ثمن بننے کی صلاحیت فطری طور پر اس میں موجود ہے، طلب زیادت کی اہلیت رکھتا ہے، اگرچہ مدتہا ئے دراز سے قفل میں بند ہو لیکن بالقوۃ نماء اس میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ وہ اموال جو برائے استعمال ہیں اس میں نماء حاجت اصلیہ سے بڑھ کر نہیں ہوتا اس میں نماء ہو بھی جیسے پالتو جانوروں میں تو زیادت بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہوتی ہے۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

"الحاجة الاصلية وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى والآت الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديراً كالدين فان الديون محتاج الى قضائه بما فى يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكالآت الحرف واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك"[1]

"حاجتِ اصلیہ جو انسان کو ہلاکت تحقیقی یا تقدیری سے محفوظ رکھے، ہلاکت تحقیقی سے حفاظت کی صورت نفقہ میں ہے کہ انسان روزمرہ کے خرچ، رہنے کے لیے گھر آلات جنگ اور سردی و گرمی سے بچنے کی خاطر ضروری کپڑوں کے بغیر ہلاک ہو جائے گا، اور تقدیری ہلاکت جیسے کہ قرض ہے مقروض اگرچہ صاحب نصاب ہو لیکن اس کو اپنا مقبوض نصاب کی ادائیگی کے لیے خرچ کر دینا ضروری ہوتا ہے، اپنی ذات کو قید سے بچانے کے لیے جو ہلاکت کی طرح ہے، کسب معیشت کے لیے آدمی کو ضروری ہے. آلات حرفت کی، گھر کے ضروری سامان کی سواری کے لیے جانور کی اور اہل علم کے لیے کتب علم بھی ضروریات میں شامل ہیں کیوں کہ جہالت ان کے نزدیک موت کی طرح ہے۔"

حاجتِ اصلیہ کی تعریف جامع ہر زمانہ کی حوائجِ اصلیہ پر حاوی ہے اس لیے کوئی نئی تعریف کی جستجو کی ضرورت باقی نہیں رہتی، نفقہ ہر زمانہ کے معیار اور ہر شخص کی اپنی حالت کی لحاظ سے معتبر ہوگا، اسی طرح گھر کا معیار بھی ملحوظ رہے گا، ہاں آلات جنگ صرف مدافعت نفس کی حیثیت و ضرورت کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے کیوں کہ اجتماعی مدافعت کی ذمہ داری اس دور میں جنگ کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ حکومت اور خاص فوجوں کی ذمہ داری میں داخل ہے، عوام کو ایسے آلات جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ کپڑے بھی زمانہ، ملک اور موسم کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے، اسی طرح آلات حرفت، حرفت کی بدلتی ہوئی

---

[1] ردالمحتار ۲/ ۲۲۶۔

شکلوں کے مطابق ملحوظ ہوں گے، اس زمانہ میں بڑی بڑی فیکٹریاں بھی آلات حرفت میں محسوب ہو جائیں گی، امارت منزل ہر شخص کی اپنی ضرورت، رہن وسہن کے تقاضے کے مطابق مطلوب ہوتا ہے، مثلاً فرنیچر ایک ڈاکٹر کے لیے اس کے معیار کا ہوگا، ایک عالم کے لیے اس کے معیار کا ہونا چاہیے۔ جس میں مثلاً کتب کی الماریاں اور ملنے والے احباب کے لحاظ سے گھر کا اسباب ہوگا، تاجر کے لیے فون اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے فرنیچر ہوگا، مطبخ کا اسباب اعلیٰ وادنیٰ شہر ودیہات کے لحاظ سے جدا ہو سکتا ہے، کوکر، گیس، بجلی، فریج وغیرہ جدید کھانے پکانے کے آلات کا معیار ہر شخص کا جدا ہو سکتا ہے، غرض کہ ملک ملک، موسم موسم، عرف عرف اور معیار معیار کا فرق ملحوظ رہے گا، دستی گھڑی بھی اور دیوار یا ٹیبل گھڑی بھی ضروریات میں داخل ہے آج کل عالم کا کل نظام گھڑی سے وابستہ ہے، سواری کے لیے ایک اسکوٹر، یا کم از کم سائیکل یا بس رکشہ وغیرہ کا کرایہ ضروریات میں داخل ہو سکتا ہے، سفر میں آدمی کی شان کے لحاظ سے A کلاس اور B کلاس کا فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے خاص پیشہ والے جن کو کار کی ضرورت ہو ان کے لیے کار بھی ضروریات میں داخل ہو سکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

اگر حکومت کا دین مؤجل ہے جس کی میعاد طویل الاجل ہو اور عام طور پر حکومت کے قرضہ میں اجل سے پہلے مطالبہ نہیں ہوتا اس لیے اس قسم کے طویل المیعاد قرض مؤجل میں مقروض جس قدر ایک سال میں ادا کرتا ہے اس قدر اموالِ تجارت میں سے منہا کر کے کل مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرے، کیوں کہ اس قرض میں بالفعل مطالبہ من جہۃ العباد نہیں ہے نیز جب ہر سال ادا کیے جانے والے قرض کو زکوٰۃ کے اموال میں سے منہا کر دیا گیا تو مثلاً چالیس سال میں جو مجموعی رقم گورنمنٹ کو ادا کی ہے، اس مجموعی قرض کی زکوٰۃ منہا ہو جائے گی، اور یہی مطلوب ہے۔

چنانچہ قرض مؤجل کے بارے میں علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

"او مؤجلا. عزاه إلى المعراج الى شرح الطحاوي وقال عن ابي حنيفة[1] لا يمنع وقال الصدر الشهيد لا رواية فيه ولكل من المنع وعدمه وجه زاد القهستاني عن الجواهر الصحيح انه غير مانع[1]"

---

[1] شامی ۲/۲۶۱۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

اگر تمام یا بعض شرکاء صاحب نصاب ہیں تو ان پر زکوٰۃ لازم ہوگی، ان کے اپنے اپنے اموال کے لحاظ سے خواہ وہ اموال کمپنی میں شامل ہوں یا خارج ہوں اگر کوئی بھی صاحب نصاب نہیں ہے تو کمپنی پر مجموعی لحاظ سے (احناف کے نزدیک) زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ انفرادی حیثیت سے جو بھی صاحب نصاب ہو اس پر زکوٰۃ آئے گی، ایک شخص ایک کمپنی میں اپنے حساب کے لحاظ سے صاحبِ نصاب نہیں ہے لیکن اس حصّہ کو اپنے گھر میں رکھے اموال زکوٰۃ کے ساتھ یا دوسرے اموال تجارت کے ساتھ حساب میں لایا جائے تو صاحبِ نصاب بن جاتا ہے، تو اس حیثیت سے دوسرے اموالِ زکوٰۃ کے ساتھ اس حصّہ کی زکوٰۃ بھی اس شخص پر لازم ہوگی۔

"ولا تجب الزکوٰۃ عند نا فی نصاب مشترک من سائمة ومال تجارة وان تعدد النصاب تجب اجماعاً"[1]

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے جواہرات اور اموال غیر نامیہ پر بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے، اگر چہ ہزاروں کی قیمت پر پہونچیں جس طرح غیر نامی زمین وجائداد پر نہیں ہوتی، اگر تجارت کے لیے ہوں تو اموال تجارت کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اسی طرح عورتوں کے ہیرے جواہرات کے زیور پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں زکوٰۃ وقت ادا میں عام بازاری بھاؤ کے حساب سے ادا کی جائے گی، اگر تھوک ہے تو تھوک کا بازاری بھاؤ، پھٹکر ہے تو پھٹکر کا بازاری بھاؤ، دونوں طرح تجارت ہو تو تمیز ممکن ہو تو دونوں کے لحاظ سے ورنہ غالب جو بھی ہو، اس کا لحاظ کرلیا جائے۔

اگر کوئی شخص گزشتہ کئی سالوں کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ نہ وہ مال اس وقت

---

[1] رد محتار ۲/۳۰۴۔

موجود ہے نہ وہ بھاؤ ہے اس لیے اس کو گزشتہ ہر سال کے (اختتام پر جو اس کے لیے یوم ادا کا حکم رکھتا ہے) لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی :

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم يوم الاداء اجماعًا وهو الصحيح اى كون المعتبر في السوائم يوم الاداء اجماعًا، هو الصحيح فانه ذكر في البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء وفي المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقًا عليه وعندهما[1]"

اراضی تجارت کی زکوٰۃ میں یوم ادا کے بازاری نرخ کا اعتبار کرنا چاہئے۔ متوقع نرخ نہ اس وقت موجود ہے نہ اس کا حصول ضروری ہے۔ سودا ہی نہ ہو ایک دو سال گزر جائیں یا بھاؤ ہی گھٹ جائیں، اس لیے متوقع پر مدار رکھا ہی نہیں جا سکتا، متوقع مل جائے گا تو نقد میں مال مستفاد کی حیثیت سے شامل ہو جائے گا۔

شیرز پر زکوٰۃ

شیرز کی حقیقت کے لحاظ سے یہ اشتراک فی التجارت ہے، اس لیے تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر کمپنی میں حصہ دار آلاتِ حرفت (فیکٹری) میں ہے تو آلاتِ حرفت پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، اس لیے ایسے شیرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، ہاں جو آمدنی شیرز سے حاصل ہوگی، اس پر زکوٰۃ آئے گی وقت ادا میں شیرز کا جو بھاؤ مارکیٹ میں ہوگا وہ معتبر ہوگا۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب۔

بونڈس مذکورہ صورت میں بونڈس قرض ہے، دین قوی ہے اس کی زکوٰۃ جس قدر وصول ہوتا جائے ادا کرنی ہوگی، گزشتہ سالوں کی بھی ادا کرنا ہوگی، اگر پہلے سے صاحبِ نصاب ہے تو حولان حول کی شرط بھی نہیں اگر سال بہ سال کر دیتا ہے اور صاحب نصاب ہے تو جائز ہے، یہ زکوٰۃ مؤجل شمار ہوگی۔

محورثانی سونا اور چاندی میں سے جس نصاب کا بھی مالک ہو جائے صاحب نصاب کو غنی قرار دیا جائے گا، اس بارے میں ادنی نصاب کا اعتبار ہوتا ہے، اسی طرح مال تجارت کے نصاب کی تقویم کے لیے ادنی نصاب کا اعتبار ہوگا، اس زمانہ میں چاندی ادنیٰ ہونے کی وجہ سے تقویم کے لیے متعین ہے، انفع للفقراء بھی یہی ہے:

"ولو بلغ باحدھما نصابا دون الأخر تعين ما يبلغ به"[1]

محور ثالث مصارف زکوٰۃ

غیر مستطیع طالب علم کو اگر زکوٰۃ کا چک دیدیا جائے اور طالب علم اس چک کے وصول کرنے کا مجاز مدرسہ کو بنادے، مدرسہ چک کی رقم وصول کرلے یا خود طالب علم چک کی رقم وصول کرکے مدرسہ میں دیدے تو تملیک کی صورت ہو جاتی ہے یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم کی وکالت مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہے اس لیے کہ طلبہ نے اس کو وکیل نہیں بنایا توکیل نام ہے "اقامۃ الغیر مقام نفسہ"، تو جب تک طلبہ کی طرف سے اپنی خاطر کسی خاص رقم کے وصول کرنے کیلئے مہتمم کو وکیل بنایا نہیں جائے گا، توکیل وجود میں نہیں آئے گی، معین طلبہ یا طلبہ کی انجمن مہتمم کو وکیل بنادے یا ہر طالب علم سے داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں توکیل کرالی جائے تو مہتمم وکیل بن جائے گا۔ وکیل مؤکل کا نائب ہوتا ہے:

"ليس كل اجر توكيلا بل لابد مما يفيد كون فعل المامور بطريق النيابة عن الأخر. فليحفظ"[2]

کیا سفیر "عاملین علیہا" میں داخل ہے؟

چندہ وصول کرنے والا سفیر محض سفیر اور رسول ہے، وکیل و نائب نہیں ہے، رسول کے لیے کسی بھی عقد میں عقد کی اضافت مرسل کی طرف ضروری ہوتی ہے، وکیل کے لیے کسی کام میں مؤکل کی طرف نسبت ضروری نہیں ہے، سوائے امور چند کے (نکاح، خلع، ھبہ وغیرہ)

سفیر نہ معطین زکوٰۃ کا نائب ہے نہ مستحقین کا، اس لیے کہ عمل توکیل حقیقتاً یا حکماً موجود نہیں ہے،

---

[1] درمختار مع الشامی ۲/ ۲۹۹ ۔ [2] درمختار ۵/ ۵۰۹

سفیر صرف مدرسہ کا رسول (قاصد) ہے، سفیر مدرسہ کے نام سے چندہ کرتا ہے، مدرسہ کی رسید پیش کرتا ہے،
تب ہی اس کو معطین معتمد سمجھتے ہیں، یہی رسالت کی حقیقت ہے، نام بھی تو اس کا سفیر ہے۔

جب سفیر کسی کا نائب نہیں ہے تو سفیر کو "العاملین علیہا" کے حکم میں شمار نہیں کیا جا سکتا، عامل زکوٰۃ
سلطان کا نائب ہوتا ہے:

"واما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم الامام لجبایۃ الصدقات"۔

"عاملین وہ ہیں جن کو امام وصول صدقات کے لیے مقرر کرتا ہے" (بدائع)

عامل کا پورا وقت تحصیل زکوٰۃ میں صرف ہوتا ہے، عامل کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ بطور اجرت نہیں بلکہ اپنے اور اپنے اعوان کی کفایت کی حیثیت سے ملتا ہے، عامل خود مصرف میں شامل ہے، اس کا حق اس مال زکوٰۃ سے متعلق ہوتا ہے جو اس نے وصول کیا ہے اگر اس کا وصول کردہ مال ہلاک ہو جائے تو عامل کا حق بھی ساقط ہو جاتا ہے، نیز عامل کا یہ حق مال زکوٰۃ میں اس لیے متعلق ہوتا ہے کہ درحقیقت اصحاب مال کے کام میں وہ مصروف ہے یعنی ان کی زکوٰۃ سلطان یا امیر تک لے جاتا ہے، اس لیے ان کے اموال میں اس کی کفایت متعلق ہوتی ہے۔

اس کی عمالہ کو اجرت قرار نہیں دے سکتے اس لیے کہ عمالہ مجہول ہے کیوں کہ عامل اور اس اعوان کے لیے کفایت کی مقدار متعین نہیں، مجہول ہے، حضرت امام شافعیؒ کے یہاں بھی اس کو اجرت قرار نہیں دے سکتے، اس لیے کہ عامل کا عمل مجہول ہے، وہ کس قدر صدقات لائے گا معلوم نہیں اس لیے اجرت نامعلوم ہو جائے گی، اور اجارہ میں بدلین میں سے کسی کی بھی جہالت اجارہ کے جواز کے لیے مانع ہے تو پھر یہاں تو دونوں بدل مجہول ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ سفیر مدرسہ نہ سلطان کی طرف سے ساعی ہے کہ اس پر ذمہ داری ہے، خود کو تحصیل زکوٰۃ کے لیے فارغ رکھنے کی نہ مدرسہ تحصیل زکوٰۃ کا حق لازم رکھتا ہے نہ معطین پر مدرسہ میں دینا واجب ہے سفیر کی حیثیت محض اجیر کی ہے، عامل کی حیثیت اجیر کی نہیں ہے اس لیے سفیر عامل کے حکم میں نہیں ہے، ہاشمی کو عمالہ سے ممانعت ہے، عمالہ اگر اجرت ہوتی تو ہاشمی کو ممانعت نہ ہوتی۔

لہ بدائع ۲/۴۴

سوالات کے جوابات

مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ

از ——— مولانا انور علی الاعظمی ——— دارالعلوم، مئو، یوپی۔

۱ ——— جس مال کی قیمت ادا کر دی گئی لیکن اب تک مال کی وصولی نہیں ہو سکی ہے اگر بیع مکمل ہے تو قبضہ سے پہلے بیع کو اپنے اموال زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا اور مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، جیساکہ محیط سرخسی کے حوالہ سے عالمگیری میں مذکور ہے:

"واما المبیع قبل القبض لا یکون نصابا والصحیح انہ یکون نصابا"[۱]

اور جو رقم بطور ثمن کے بائع کے حوالہ کی جا چکی ہے اس کا ذمہ دار بائع ہے، اگر بائع صاحب نصاب ہے تو زکوٰۃ میں اس قیمت کو بھی شامل کرے گا، کیوں کہ یہاں ملکیت اور قبضہ دونوں موجود ہے۔

ڈپازٹ کی زکوٰۃ کا حکم

۲ ——— کرایہ کے مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں نہ کرایہ دار پر نہ مالک مکان پر، بلکہ وہ مثل رہن کے ہے، رہن کی زکوٰۃ راہن پر بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ اس کا قبضہ نہیں اور مرتہن پر بھی نہیں، اس لیے کہ اس کی ملک نہیں تو ملک تام جو ملکیت اور قبضہ کے مجموعہ سے وجود میں آتی ہے وہ کسی کے حق میں موجود نہیں۔ لہذا زکوٰۃ کا وجوب کسی پر نہیں ہوگا:

"ولا فی مرهون بعد قبضه ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا علی

---

[۱] محیط السرخسی۔

الراهن لعدم اليد وإذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية[1]

مالِ حرام کی زکوٰۃ کا حکم

۳ ـــــــ سود اور رشوت کے مال کا صدقہ بلا نیت ثواب واجب ہے یا اگر مالک اصلی کی طرف لوٹانا ممکن ہو تو لوٹانا واجب ہے، اس لیے ایسے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے جس کو ثواب ہی کے لیے کیا جاتا ہے۔

حرام مال حلال میں اس طرح گھل مل گیا کہ تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں بھی صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ملکیت ثابت نہیں ہوگی، لہٰذا زکوٰۃ کا وجوب اور وراثت اصل مالک ہی سے متعلق ہوں گے، لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس صورت میں حق غیر کا تعلق ذمہ سے ہوگا، عین مال سے نہیں، لہٰذا عین مال حرام کا امتیاز ختم ہو جانے کی بنا پر پورے مال پر ملکیت ثابت ہوگی، اور زکوٰۃ کا تعلق مجموعہ مال سے ہوگا، علامہ حصکفی فرماتے ہیں امام صاحب کا قول قول ارفق ہے اور قابل عمل ہے[2]

دین کی زکوٰۃ کا حکم

۴ ـــــــ دین کی زکوٰۃ دائن ہی پر واجب ہوگی، مدیون پر نہیں، مدیون صاحب غنا ہونے کے باوجود ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے تو وہ اپنے اس رویہ میں بلا شبہ ظالم ہے، لیکن وہ اس مال کا مالک نہیں، البتہ اس کے ذریعہ جو نفع کما رہا ہے اس کی زکوٰۃ کا وہ ذمہ دار ہے۔

موجودہ تجارتی نظام میں بڑے چھوٹے ہر طرح کے تاجر کے مال کا بڑا حصہ ادھار رہتا ہے، بغیر ادھار کے اس زمانہ میں تجارت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، تجارتی قرض جو فقہاء کے یہاں دین قوی کہا جاتا ہے، اس کی زکوٰۃ واجب ہے، امام ابو حنیفہ قبضہ کے بعد وجوب کے قائل ہیں، لیکن اگر متوقع قرض کی زکوٰۃ مالک اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ادا کر دے تو اس میں اس کے لیے بڑی آسانی ہے اس لیے کہ تجارتی قرض وقفے وقفے سے وصول ہوتا ہے تو ہر قرض کے وصول ہونے پر زکوٰۃ کا اہتمام

---

۱ ردمحتار ۲ شامی ۲/۳۷ ۔

کرنا ایک مشکل امر ہے، ابو عبید نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور جابر بن عبد اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے، اور تابعین میں سے حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ابراہیم بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن اگر قرض دو چار سال تک موصول نہیں ہوتا اور مالک اس کی زکوٰۃ بھی نہیں دیتا، تو ملنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دے گا، البتہ ایسا قرض جس کے ملنے کی امید نہیں ہے جو شریعت کی اصطلاح میں مال ضمار کہلاتا ہے اس کی زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ احناف کے نزدیک واجب نہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ

۵ ــــ "پراویڈنٹ فنڈ" کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی مدت ملازمت میں جب کہ وہ رقم ہماری ملک تام میں نہیں آئی اور اس کا کوئی فائدہ بھی ہم کو نہیں پہونچ رہا ہے تو اس کی مالی ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد نہیں ہوتی، اور اس رقم کی مثال مال ضمار کی سی ہے، اس مال پر صاحب مال کی ملکیت ہے، لیکن اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، اس کی زکوٰۃ بھی وصولیابی اور حولان حول کے بعد واجب ہوگی۔

"لا زکوٰۃ فی مال الضمار وھو ما لا یمکن الانتفاع بہ مع بقاء الملک"[1]

دوسری شرط "نما"

کونسا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ جس دین کا مطالبہ من جہۃ العباد ہو دین مانع زکوٰۃ ہے، مہر مؤجل جس کا عورت کی طرف سے سالہا سال تک کوئی مطالبہ نہیں ہوتا وہ مانع زکوٰۃ نہیں، اس کے علاوہ دوسرے دیون مؤجلہ کے مانع زکوٰۃ ہونے میں مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ تینوں مسلک کے جمہور فقہاء کی آراء اثبات میں ہیں، معراج میں شرح طحاوی کے حوالہ سے منقول ہے کہ مانع نہیں۔ امام ابو حنیفہ سے یہی مروی ہے، لیکن صدر الشہید کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صاحب مذہب سے کوئی روایت نہیں، اور مانع ہونے اور نہ ہونے میں دونوں کی وجہ موجود ہے، اور قہستانی نے جواہر کے حوالہ سے یہ اضافہ کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دین مؤجل مانع نہیں ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والے طویل المیعاد قرضے بھی مؤجل ہوتے ہیں، لہٰذا ایک سال میں جو واجب الاداء

---

[1] درمختار۔

قسط ہے وہ زکوٰۃ سے مانع ہوگی، اور بقیہ اقساط مانع نہیں ہوں گی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی حالت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ شرکا کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، ایک مسلمان کے حصے میں کمپنی کا جو حصہ آتا ہے اس میں جو مقدار محل زکوٰۃ ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ دی جائے گی، اور اگر وہ تنہا نصاب کو نہیں پہونچتی، لیکن حصہ دار کے پاس الگ سے نصاب موجود ہے، یعنی دونوں ملکر نصاب کو پہونچ جاتے ہیں تو وہ زکوٰۃ دے گا ورنہ نہیں۔ الغرض کمپنی کی زکوٰۃ اس کے ڈائرکٹر کو نہیں نکالنی چاہیے، بلکہ حصہ داروں کو اپنا حصہ معلوم کرکے خود اس ذمہ داری پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

۱ــــــ خواتین جو آرائش کے لیے ہیرے اور جواہرات استعمال کرتی ہیں، اس کی ان پر زکوٰۃ نہیں، اسی طرح مرد جو سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جواہرات خرید کر اکٹھا کرتے ہیں، اصولی طور پر ان پر بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کہا جا سکتا لیکن ظاہر ہے اگر ان کا مقصد زکوٰۃ سے فرار حاصل کرنا ہوگا تو چاہے وہ اس حیلے سے اپنی زکوٰۃ بچالیں، مگر اللہ تعالےٰ کے یہاں مواخذہ سے نہیں بچ سکتے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

۲ــــــ اموال تجارت کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ مال جو تاجر خود تیار کرتا ہے اور دوسرے وہ مال جو بازار سے خریدتا ہے، دونوں قسموں پر حولان حول کے بعد تھوک قیمت فروخت کو بنیاد بناکر زکوٰۃ نکالی جائے گی، یعنی زکوٰۃ نکالتے ہیں اصل سرمایہ اور اضافہ شدہ مال یعنی منافع دونوں ہی جوڑے جائیں گے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے، اگرچہ ابن عباسؓ کی رائے میں فروخت ہونے تک انتظار کریں گے اور بقول ابن رشد قیمت خرید کا اعتبار ہوگا، لیکن جمہور فقہاء کی رائے وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ شیرز کمپنی میں لگے ہوئے مال تجارت کا ہی حصہ ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اموال تجارت زکوٰۃ کا محل ہیں اس طرح یہ شیرز بھی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ نصاب کی مقدار کو پہونچنے کے بعد یا اپنے دوسرے مالوں کے ساتھ مل کر واجب ہوگی، شیرز کی مالیت کا تعین ادائے گی کے وقت بازار کے بھاؤ سے ہوگا، کیوں کہ زکوٰۃ اصل مالیت اور منافع کے مجموعہ پر جاری ہوتی ہے۔

بونڈس ایک قرض ہے جو مالک اپنے اختیار سے کسی کمپنی یا حکومت کو دیتا ہے اور یہ قرض دین قوی کے قبیل سے ہے اس لیے تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، چاہے تو اپنے دیگر مالوں کے ساتھ سال بسال دیتے رہیں یا بونڈ کیش کرانے کے بعد سبھی گزرے ہوئے سالوں کی اکٹھا دیں۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب وہی نصاب بنیاد تسلیم کیا جائے گا جو انفع للفقراء ہو، بعض عرب علماء، جیسے علامہ یوسف قرضاوی اور احمد عبدالعزیز المزینی اور دوسرے لوگوں نے بھی اس زمانہ میں سونے کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، استاذ ابو زہرہ، خلاف ابوحسن کی بھی یہی رائے ہے، علامہ یوسف قرضاوی تحریر فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں سونے کے نصاب کو اصل بنانا مبنی بر اعتدال و بلحاظ [illegible] قوی ہے، ہم دیگر اموال کے نصاب کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں تو موجودہ زمانہ میں ہمیں سونے کا نصاب ہی ان سے قریب تر دکھائی دیتا ہے، آج پانچ اونٹ یا چالیس بکریوں کی قیمت تقریبا چار سو دینار[1] ہوتی ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ نقدی کی اتنی قلیل مقدار پر زکوٰۃ عائد کی جائے کہ جس سے ایک بکری بھی نہ خریدی جا سکے، علامہ یوسف قرضاوی کی اس دلیل سے ہمیں اتفاق نہیں، ممکن ہے کہ ان کے ملک میں چاندی بہت سستی ہو، اور بکریاں بہت مہنگی ہوں لیکن ہمارے ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی تقریباً پانچ ہزار روپے کے برابر ہوتے

---

[1] دینار ۱۹۹۰ء کی قیمت کے اعتبار سے ۴۹ ہندوستانی روپے کے برابر ہوتا ہے۔

ہیں اور اتنے روپے میں دس بکریاں با سانی خریدی جا سکتی ہے لہذا چاندی کو نصاب زکوٰۃ کے مسئلہ میں اصل حیثیت آج بھی حاصل ہوگی۔

مصارف زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جو شکل سوال میں تحریر کی گئی ہے وہ بہت موزون اور واقعہ کے مطابق ہے صحیح ہے کہ مدرسہ کا سارا خرچ طلبہ کی خدمت یا متعلقہ انتظامی امور پر ہوتا ہے اس لیے سارے خرچ کو ماہانہ طلبہ پر تقسیم کر دیا جائے اور نقد رقم یا چیک دیکر ان سے وصول کر لیا جائے، بہتر یہ ہے کہ وصول کی جانے والی رقم سے دس بیس روپے زیادہ ہی ان کو دیا جائے تاکہ مکمل طور پر تملیک کا اظہار ہو اور حیلۂ تملیک سے نجات مل جائے، اگر یہ طریقہ اہل مدارس قبول کرلیں تو زکوٰۃ دینے والوں اور مدارس کے ارباب اہتمام دونوں ہی صحیح طور پر اپنے اپنے فرائض منصبی سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

۲۔ ——— مدارس کے سفراء "والعاملین علیہا" کا مصداق نہیں ہیں۔ عامل وہ شخص ہے جس کو مسلمانوں کا امیر وصولی صدقات کے کام پر مامور کرے، جصاص کی احکام القرآن میں اس بات کی صراحت ہے:

"هو الذي يبعثه الامام لاخذ الصدقات"

مدارس کے ذمہ داران امام نہیں اور ان کے متعین کیے گیے ہر شخص کو جبری وصولی کا اختیار بھی نہیں ہے، سفراء کے تقرر اور تنخواہ کے سلسلہ میں دو صورتیں ہیں۔ پہلی دیگر کام کرنے والے ملازمین کی طرح باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پر سفیر رکھے جائیں، یا اگر مدرسین ہی سے چھٹیوں میں کام لیا جا رہا ہے تو ان کی تنخواہ ڈبل کردی جائے پھر ادارہ اپنے حالات کے اعتبار سے ان میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مزید سہولیات، مثلاً سفر خرچ اور انعام واکرام وغیرہ دے سکتا ہے، اس سے آمدنی میں اضافہ کا امکان بھی بحال رہے گا، اور بے اعتدالی نہیں پیدا ہوگی، کمیشن پر چندہ کرنے سے ہمیں اتفاق نہیں، اگرچہ موجودہ حالات میں ہر کاروبار میں کمیشن کا رواج ہو جانے سے اسے جہالت اجرت مفضی الی النزاع کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس لائن سے دوسری بے اعتدالیاں پیدا ہونے کے شدید امکانات ہیں۔ کمیشن کی اجازت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اس کی تحدید کا پیدا ہوگا، بعض چھوٹے مدارس میں پچاس فیصد کمیشن طے کر کے سفراء کا کام نہیں چلے گا، اور بڑے مدارس میں پانچ فیصد کمیشن پاکر ایک مہینہ میں پچاس ہزار کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ کے موضوع پر لمبی گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے، قرآن کے اولین مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں، ان کے علوم کے امین اور محافظ تابعین اور تبع تابعین ہیں، یہ تینوں ادوار مشہود لہا بالخیر جس چیز پر متفق ہیں ان سے تجاوز کرنا ایک بڑے خطرہ کا پیش خیمہ ہے، آج ہم میں تقوی، خشیت الٰہی کا فقدان ہے، الا ماشاء اللہ فی سبیل اللہ پر ایک بندھن اور روک ہے اور اسے ختم کر دیا گیا، اور صحابہ اور تابعین کی فہم سے عدول کیا گیا، تو ہر کس و ناکس فی سبیل اللہ کے نام سے صدقات کھائے گا اور وصول کر کے ذخیرہ کرے گا۔ مستحق افراد یا اداروں کے لیے آج بھی راستے کھلے ہیں اور جو آدمی یا ادارہ خالصۃ للہ کام کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرما رہے ہیں، پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ادارے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان اداروں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اگر فی سبیل اللہ میں توسیع کی گئی تو بدنیت اور حریص عناصر اس کا غلط استعمال کریں گے، آج بھی کرتے ہیں لیکن چھپ کر، اور علماء کی تصدیق کے بعد علی الاعلان کریں گے، اس لیے فی سبیل اللہ کے بارے میں میرا موقف وہی ہے جو صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کا ہے۔

(فقط واللہ اعلم بالصواب)

نصاب زکوٰۃ

از ـــــــ مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی (مدرسہ احمدیہ ابابکرپور، ضلع ویشالی۔

نصاب زکوٰۃ میں قدر مشترک غنا اور مالداری ہے اور مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک ناداری اور افلاس، اس لیے اصل نصاب کی تعیین میں دونوں کے مفاد کی رعایت ضروری ہے تاکہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مالداروں پر غیر ضروری بوجھ بھی نہ پڑے، یہی وجہ ہے کہ احادیث مقدسہ میں مختلف اصناف مختلف انواع اشیاء میں وہ کم سے کم مقدار اور مالیت کی تعیین کردی گئی ہے، جس کی موجودگی میں انسان صاحب نصاب اور مالدار سمجھا جاتا ہے، اور جنہیں فقہ کی متداول کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، یہاں اس تفصیل میں جانے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ موقع، بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مختلف اشیاء کا نصاب الگ الگ اقل حد کو پہونچ رہا ہو تو زکوٰۃ کی ادائے گی مقررہ اور متعینہ مقدار و تعداد میں کی جائے گی، اور اسے ہی اصل مانا جائے گا۔

بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اشیاء موجود ہوں، مگر ان میں سے کوئی الگ الگ نصاب کی اقل حد تک نہ پہونچے یا اموال تجارت ہوں تو ایسے میں کیا کیا جائے، ضم نصاب میں کس کی رعایت کی جائے اور تقویم میں کسے معیار مانا جائے۔

اس سلسلے میں دو اہم اصول فقہاء نے بیان کیے ہیں:

ا ـــــ پہلا یہ کہ تعیین نصاب اور ضم نصاب میں فقراء کی رعایت کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ انفع للفقراء کی صورت کون سی ہے، فقہ کی مشہور کتاب ہدایۃ میں ہے:

"یقوم بما ھو انفع للمساکین احتیاطاً لحق الفقراء" [1]

فخر الدین عثمان بن علی زیلعی لکھتے ہیں:

"ویعتبر فیھما الانفع ایھما کان انفع للمساکین" [2]

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"یجب ان یکون التقویم بما ھو انفع للفقراء قدرًا و رواجًا" [3]

۲ ـــــ دوسرا اصول یہ ہے کہ تقویم میں تخییر کے باوجود اعتبار اس کا ہوگا، جس سے نصاب کی تکمیل ہو سکے ـــــ بنایہ میں ہے:

"لابد ان یقوم بما یبلغ نصابًا حتی اذا قومت بالدراھم تبلغ نصابًا واذا قومت بالذھب لا تبلغ نصابًا یقوم بالدراھم وبالعکس کذالک" [4]

بحر الرائق میں ہے:

"وفی النھایۃ لوکان تقویمہ باحد النقدین یتم النصاب وبالآخر لا فانہ یقومہ بما یتم بہ النصاب بالاتفاق .... فقد قال فی الظھیریۃ رجل لہ عبد للتجارۃ ان قوم بالدراھم لا تجبُ فیہ الزکوٰۃ وان قوم بالدنانیر تجب فعند ابی حنیفۃ یقوم بما تجب فیہ الزکوٰۃ دفعًا لحاجۃ الفقیر وسد الخطیئۃ" [5]

اور آخر میں ساری بحثوں کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فالحاصل ان المذھب تخییرہ الا اذا کان لا یبلغ باحدھما نصابًا تعین التقویم بما یبلغ نصابًا" [6]

درمختار میں ہے:

"ولو بلغ باحدھما نصابًا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ" [7]

صاحب ہدایہ اور کچھ دوسرے فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں اصول الگ الگ نہیں بلکہ

---

[1] ھدایۃ، باب زکوٰۃ الاموال ج ۱/ص ۱۹۵ [2] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق: ۱/۲۷۹ [3] فتاویٰ ھندیۃ: ۱/۱۷۹ ـ [4] بنایہ علی ھامش ھدایہ ۱/۱۰۵ [5] بحر الرائق لابن نجیم: ۲/۲۲۹ [6] [7] درمختار: ۲/۳۱ ـ

ایک ہی ہے اور انفع للفقراء کا مطلب یقومہا بمایبلغ بہ نصابا ہے[1]۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

"واعتبار الانفع مذہب ابی حنیفۃ ومعناہ یقوم بہا یبلغ نصابا"[2]

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

"وعن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ فی الامالی انہ یقومہا بانفع النقدین للفقراء"[3]

بہرکیف ان دونوں اصولوں کے ساتھ اصل نصاب کی تعیین میں ایک اور بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اور اس سلسلے میں واضح احادیث موجود ہیں،

بدایۃ المجتہد میں ہے:

"فانہم اتفقوا علیٰ انہ خمس اواق لقولہ علیہ السلام الثابت لیس فیما دون خمس اواق من الورق صدقۃ"[4]

اس کے برعکس سونے کے نصاب میں کافی اختلاف ہے جس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے صاحب بدایۃ المجتہد لکھتے ہیں:

"وسبب اختلافہم فی نصاب الذہب انہ لم یثبت فی ذالک شیء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما ثبت ذالک فی نصاب الفضۃ"[5]

سوالات کے جوابات

۱۔ ان اقتباسات اور مباحث کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اصل نصاب چاندی کو قرار دیا جائے اس لیے کہ:

(الف) یہ فقراء کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

(ب) سونے کی بہ نسبت سستی ہونے کی وجہ سے نصاب کی تکمیل آسانی سے ہو سکتی ہے،

---

[1] ھدایۃ، ۱/۱۹۵ [2] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ۱/۲۷۹ [3] مبسوط، ۲/۱۹۱، بدائع، ۲/۲۱،

[4] و [5] بدایۃ المجتہد، ۱/۱۸۶۔

(ج) ــــــ اس کا نصاب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور فقہاء سب کے سب متفق ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

زیادہ سے زیادہ چاندی کے نصاب کو اصل تسلیم کرنے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مالدار کی رعایت نہیں کی گئی ہے، حالانکہ معاملہ قطعاً ایسا نہیں ہے صاحب فتح القدیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان المال کان فی ید المالک ینتفع بہ زمانا طویلا فلا بد من اعتبار منفعۃ الفقراء عند التقویم" [1]

بنایہ میں ہے:

"المالک اسقط حقہ بالاستثمار مدۃ الحول فیؤخر حفظۃ الفقراء بالتقویم بالانفع مراعاۃ للحقین بقدر الامکان" [2]

معاصر علماء کی آرا

دوسری فقہی سیمینار میں کرنسی نوٹ کی زکوٰۃ پر معاصر علماء نے جو کچھ لکھا تھا اور جو فیصلے ہوئے تھے اس کا ماصل بھی یہی تھا کہ اصل نصاب چاندی کو جانا جائے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ لکھتے ہیں:

"احکام زکوٰۃ میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ جس پہلو میں فقراء کا فائدہ ہو اس کو اختیار کیا جائے، اس لیے زکوٰۃ کی حد تک ان سکّوں اور نوٹوں کے لیے اصل چاندی ہی ہوگی اور اتنی رقم کا مالک ہونے پر جس سے چاندی کا نصاب خرید کیا جائے زکوٰۃ واجب ہوگی" [3]

مولانا عبد الرحیم لاجپوری کا بھی خیال یہی ہے کہ:

"جتنے روپے میں ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکے اتنے روپے کے مالک کو صاحب نصاب قرار دیا جائے گا" [4]

---

[1] فتح القدیر ۱/۱۶۶ [2] بنایہ علی ہامش ہدایۃ، ۱/۱۱۵ [3] جدید فقہی مسائل، ۲/۲۳ [4] فتاویٰ رحیمیہ، ۴/۲۳۳۔

۲ـــــــ حرمت زکوٰۃ کے لیے کسی بھی نصاب کی مقررہ ومتعینہ حد ومقدار کا مالک ہونا کافی ہے، خواہ الگ الگ مختلف چیزوں کا مالک ہو جو نصاب کے حد تک پہونچ جاتے ہوں، یا مجموعی طور پر وہ اتنی مالیت ان شرائط کے ساتھ رکھتا ہو جو وجوب زکوٰۃ کے لیے کافی ہوں، بہر صورت وہ غنی اور صاحب نصاب قرار دیا جائے گا، زکوٰۃ لینا اس لیے حرام ہوگا، اور زکوٰۃ دینا واجب۔

درمختار میں ہے:

"ولا یصرف الزکوٰۃ الیٰ غنی یملك قدر نصاب ـــــــ من ای مال کان" [1]

"وفی الغایۃ ولا یجوز دفع الزکوٰۃ الیٰ من ملك نصابا سواء کان من النقود او السوائم او العروض" [2]

(ھذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم)

---

[1] شامی: ۲/۶۵ [2] ایضاً۔

نصاب زکوٰۃ

از ——— مولانا افضل حسین (بستی) ———

اس زمانے میں جب کہ چاندی سونا کے مقابلے میں بہت ہی سستی اور سونے کی قیمت بہت زیادہ ہے، لہٰذا نقد روپیہ یا مال تجارت وغیرہ میں چاندی کا نصاب تو جلد تیار ہو جائے گا اور سونے کا نصابِ کافی نقد یا تجارتی مال کے زیادہ ہونے پر تیار ہوگا، کتب فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، کہ مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے وہ نصاب معتبر ہے جو انفع للفقراء ہو اور ظاہر ہے کہ چاندی کا نصاب جلد تیار ہو جانے کی وجہ سے فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے کیوں کہ ساڑھے باون (۵۲ ½) تولہ چاندی کے بقدر مال جب کہ سال گزر گیا ہو اور ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہونے پر فقیروں کو نفع پہونچے گا، برخلاف سونے کے نصاب کے کہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو بہت کم صورتوں میں (یعنی جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا کے بقدر مال ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو) زکوٰۃ واجب ہو سکے گی، کیوں کہ ساڑھے سات تولہ سونا کی قیمت آج کل کے نرخ کے اعتبار سے تقریباً تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپے ہوگی، پس اگر سونے کے نصاب کو اصل قرار دے کر اسی کا اعتبار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس تیس ہزار نقد روپے ضرورت اصلیہ سے فارغ ہوں یا اس کے بقدر مال تجارت ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی جو فقیروں کے لیے کسی طرح بھی نفع بخش نہیں ہے، اور اگر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے تو تقریباً ۴ ½ ہزار نقد روپے یا اس کے بقدر مال تجارت ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، پس

چاندی کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ جلد واجب ہوتی ہے، اور سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ دیر سے واجب ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں نصاب نقدین میں سے اس سے بنایا جائے گا، جو فقیروں کے لیے انفع ہو۔

رہی بات اس کی کہ نقدین میں سے کونسا نصاب اصل ہے تو دونوں نصاب اصل ہیں مگر اس زمانے میں اعتبار چاندی کے نصاب کا کیا جائے گا۔ ہاں اگر پھر وہی زمانہ لوٹ آئے کہ بیسؔ مثقال سونے کی قیمت وہی ہو جائے جو دو سوؔ درہم کی قیمت ہے، تو اختیار رہے گا چاہے جس کو نصاب بنا لیا جائے گا۔

"او اعرض تجارۃ قیمتہ نصاب من ذہب او ورق مقوما باحدہما ان استویا فلو احدہما اروج تعین التقویم بہ ولو بلغ باحدہما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ ولو بلغ باحدہما نصابا وخمسا وبالآخر اقل قومہ بالانفع للفقیر"[1]

اس عبارت میں انفع للفقیر کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر نصاب دونوں سے بن جاتا ہے مگر ایک کیساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بن جاتا ہے، اور دوسرے سے صرف نصاب یا نصاب اور خمس نصاب سے کم بنتا ہے۔ جس نقد کے ساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بنتا ہوا سی سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ (ولو بلغ باحدہما نصابا وخمسا) کے تحت شامی نے اس کی تصریح کی ہے

"بیانہ ما فی النہر عن السراج لو کان بحیث لقومہا بالدراہم مائتین واربعین و لدنانیر بالدنانیر ثلاثا وعشرین قومہا بالدراہم لوجوب ستۃ فیہا بخلاف الدنانیر فانہ یجب فیہا نصف دینار وقیمتہ خمسہ ولو بلغت بالدنانیر اربعۃ وعشرین وبالدراہم ستۃ وثلاثین قومہا بالدنانیر"۔

معلوم ہوا انفع للفقیر کی رعایت بہر صورت کی جائے گی، پس چاندی اور سونے کے نرخ میں تفاوت چاہے جتنا ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل کی حیثیت رکھتے ہیں مگر فی زماننا اموال کے اندر چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔

"مقوما باحدہما" کے تحت علامہ شامی نے تصریح فرمائی ہے کہ اموال کی قیمت لگانے کا اختیار

---

[1] درمختار علی الشامی قدیم ج۲ ص۲۲،۲۳۔

اس وقت ہے جب کہ سونا چاندی دونوں برابر ہوں (یعنی نصف دینار برابر پانچ درہم کے ہو) لیکن اگر دونوں کے نرخ میں تفاوت ہے تو پھر اعتبار انفع کا ہوگا۔ (ای انفع للفقیر لا انفع لصاحب المال)

"قال ومحل التخییر اذا استویا فقط واما اذا اختلفا قوم بالانفع"۔

صاحب بحر نے بھی اس کی تصریح ان لفظوں میں فرمائی ہے:

"وفی عروض تجارۃ بلغت نصاب ورق او ذھب قال بعدہٗ ای یجب ربع العشر فی عروض التجارۃ اذا بلغت نصابًا من احدھما وقال بعد عدۃ سطور واشار بقولہ ورق او ذھب الی انہ مخیر ان شآء قومہا بالفضۃ وان شاء بالذھب لأن الثمنین فی تقدیر قیم الاشیاء بہما سواء، وفی النہایۃ، لوکان تقویمہٗ باحد النقدین یتم النصاب وبالاخرلا فانہٗ یقومہٗ بما یتم بہ النصاب بالاتفاق" [1]

بہر حال اصل مذہب تخییر کا ہے یعنی نصاب چاہے چاندی کو قرار دے کر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے چاہے تو سونے کے نصاب کو مان کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن یہ اختیار اس وقت تک ہے جب کہ نصاب دونوں نقدوں سے بن جاتا ہو، اور اگر نصاب کسی ایک سے بنتا ہے اور دوسرے سے نہیں بنتا تو تقویم ذی نصاب سے متعین ہو جائے گی، جیسا کہ اس کی تصریح درمختار کی عبارت سے آچکی ہے، صاحب بحر نے بھی اس موقعہ پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"فالحاصل ان المذھب تخییرہٗ الا اذا کان لا یبلغ باحدھما نصابا تعین التقویم بما یبلغ نصابًا وھو مراد من قال یقوم بالانفع ولذا قال فی الھدایۃ وتفسیر الانفع ان یقومہا بما یبلغ نصابًا"۔

"انفع" کی تفسیر سے متعلق ایک جزئیہ درمختار کا بھی گزرا ہے کہ اگر نقدین میں ایک کے ساتھ تقویم سے مال نصاب تک پہونچتا ہے اور دوسرے سے نصاب اور خمس تک پہونچتا ہے تو ایسی صورت میں انفع یہ دوسری صورت ہوگی، کیوں کہ خمس نصاب سے کم میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوتی لیکن جب خمس نصاب بعد تکمیل نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ اسی اعتبار سے واجب ہوگی، پس

---

[1] بحر الرائق ص ۲۲۸-۲۲۹ ج ۲۔

ظاہر ہے اس نقد کے ساتھ تقویم میں دوسرے کے مقابلے میں زکوٰۃ زیادہ نکلے گی، جو فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، بہرحال اس جزئیہ سے یہ بات صراحتہ جانی اور سمجھی جاتی ہے کہ جب انفع کا اعتبار بعد تکمیل نصاب بھی کیا جائے گا تو نصاب بناتے وقت کیوں اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ ضرور کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص (جو کہ دونوں نصابوں کا مالک ہے) ایک نصاب کو دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر کل زکوٰۃ سونے سے یا چاندی سے ادا کرنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ اس کا لحاظ ضرور کرنا ہوگا کہ جس کے ساتھ ملانے سے فقیروں کا زیادہ نفع ہو اس کے ساتھ ملایا جائے گا، پس جس کے ساتھ ملانے سے زکوٰۃ زیادہ نکلتی ہو، اسی کے ساتھ ملا کر دونوں کی زکوٰۃ ادا کرے،

"ولو ضم احد النصابين الى الأخر حتى يودى كله من الذهب اومن الفضة لابأس به لكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء قدراً ورواجاً والآ فيودى من كل واحد ربع عشره كذا فى محيط السرخسى،، عالمگیری ج۱ ص۱۷۹ ۔

"وايضا ثم فى تقويم عروض التجارة التخيير يقوم بايهما شاء من الدراهم والدنانير الا اذا كانت لا تبلغ باحدهما نصابا فحينئذ تعين التقويم بما يبلغ نصابا هكذا فى البحر الرائق".

خلاصۂ بحث

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سونے چاندی کے نرخ میں چاہے جتنا تفاوت ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل ہیں، مندرجہ جزئیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اموال کی تقویم میں تخییر اس وقت ہے جب کہ دونوں قیمت میں برابر ہوں (یعنی نصف مثقال برابر پانچ درہم کے ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا) پس اگر تفاوتِ نرخ کی وجہ سے ایک ساتھ تقویم میں نصاب تک نہیں پہونچتا اور دوسرے سے پہونچ جاتا ہے تو دوسرے ہی سے قیمت لگانی ضروری ہوگی۔

لہٰذا نصاب حرمت زکوٰۃ اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی۔

واللہ اعلم بالصواب،

زکوٰۃ

از ــــــ حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب مہتمم دارالعلوم گورکھپور

سوال ۱ ــــــ کا جواب، ملک تام :

(الف) ــــــ اگر وہ رمضان کو سال تمام کا حساب بنایا ہے تو ان کی تجارت کو موجودہ مالیت پر زکوٰۃ ہے یا مال پر ہے۔

(ب) ــــــ آپ نے جو رقم مثلاً بیع سلم کے لیے کسی کو دیدی ہے اور طے کرلیا ہے کہ وہ آپ کی نہیں ہے فریق ثانی کی رقم ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر واجب نہیں، اگر قرض دیا ہوتا تو آپ کی رقم ہوتی، مگر ادائیگی کی ہے تو اس کا مال ہے جس کو دیا ہے۔

(ج) ــــــ جو مال آپ نے بیع سلم میں مثلاً خرید لیا ہے اور ابتک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر اس لیے واجب نہیں کہ آپ کا قبضہ نہیں صرف ملکیت ہے، ملکیت اور قبضہ دونوں ضروری ہے زکوٰۃ کے لیے۔

سوال ۲ ــــــ ڈپازٹ وغیرہ، یہ رقم آپ کی ہے مگر آپ کا قبضہ نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب رقم آپ کے ہاتھ میں آجائے گی، ہاں اگر آپ کے پاس جمع کرنے کا ثبوت پکا ہے تو احتیاطاً ادا کرسکتے ہیں آج ہی۔

سوال ۳ ــــــ مہمل سوال ہے، کیوں مدرسہ کا مہتمم یا ناظم بیت المال کی رقم کا صرف امین اور وکیل ہے جو خرچ کرسکتا ہے، نہ وہ مالک ہے نہ زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم کسی کی ملک ہے وہ تو مال موقوفہ ہے اس لیے غیر متعلق سوال ہے۔

سوال ۴ ــــــ یہ عجیب سوال ہے، مال حرام کا کمانا، وصول کرنا، رکھنا سب حرام

س کو واپس کرنا یا کسی غریب کو دے کر بری الذمہ ہونا واجب ہے پھر اس کی زکوٰۃ کی کیا بحث، زکوٰۃ تو ملکیت پر ہے اور مال حرام شرعاً کالعدم ہے، کیونکہ وہ غاصب ہے آج بھی مالک وہی ہے جس کا مال لیا ہے اس لیے غاصب کا قبضہ بے ملکیت نہیں ہے، زکوٰۃ کیسی ؟

۱ ـــــ اگر حلال مال، حرام مال مخلوط ہے تو حلال کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا، ورنہ تمینہ کرے گا، جیسے بھی کرے۔

۲ ـــــ حرام کی یا حلال کی کثرت وقلت یا غلبہ کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ حرام ہے تو شرعاً کالعدم ہے، اعتبار کیسے ہوگا۔

۳ ـــــ اگر حرام وحلال میں تمیز مشکل ہے تو زکوٰۃ کا سوال ہی کیوں پیدا ہوگا ایسی کمائی والے کے یہاں۔

سوال ۵ ـــــ جو قرض دیا گیا ہے وہ ملک آپ کی ہے مگر قبضہ مدیون کا ہے اب اگر دینے کا ثبوت ہے اور مدیون کو انکار نہیں ہے تو واپسی کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ واجب ہے اور اگر ثبوت کم ہے یا مدیون کو انکار ہے یا مال مفقود ہے تو شرعاً وہ مال ضمار ہے، حدیث میں ہے "لا زکوٰۃ فی الضمار" اب اس کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ دین واپس ہوگا یا مال مل جائے گا اور از سر نو واجب ہوگی، یہ ہے شرعی رحم دلی۔

۱ ـــــ مدیون کے ٹال مٹول سے وہ گناہ گار ہے اس کے انکار سے آپ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی کیوں کہ قبضہ نہیں ہے اور ثبوت بھی کمزور ہے، اصول زکوٰۃ کے لیے ملکیت اور قبضہ دونوں بنیادی شرطیں ہیں، دونوں سے مل کر ملکیت تامہ ہوگی۔

سوال ۶ ـــــ پی فنڈ میں آپ کی تنخواہ سے جو رقم مجرا ہوتی ہے وہ آپ کی ملک ہے مگر قبضہ نہیں ہے، قبضہ سرکار کا ہے لہٰذا اس کے بعد ہی قبضہ ہوگا اور زکوٰۃ ہوگی، پوری مدت کی زکوٰۃ۔

۲ ـــــ سرکار نے جس رقم کے ملانے کا وعدہ کیا ہے وہ نہ آپ کی اب تک ملک ہے نہ قبضہ، جب ہوگا تب زکوٰۃ شروع ہوگی، اور حولان حول کے بعد ہوگی۔

۳ ـــــ اور سود کی جو رقم ملے گی وہ آپ کی بونس ہے اسے غریبوں کو تقسیم کر دیجئے ہرگز نہ رکھئے زکوٰۃ کا سوال ہی نہیں، کیوں کہ مال حرام کالعدم ہے۔

دوسری شرط نمو ہے

یہاں مال صرف تین ہیں۔ ثمن ـــــــ چوپائے ـــــــ سامان تجارت ـــــــ
مال کی تین قسمیں ہیں :

۱ ـــــ تو سونا چاندی شرعاً ثمن ہیں، لین دین کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہی ہے اس لیے ان پر زکوٰۃ واجب ہے، شرطیکہ قبضے میں ہو، مال مفقود یا مال ضمار نہ ہو۔

۲ ـــــ جانور اگر نر مادہ دونوں ہوں، چرائی پر گزر بسر کرتے ہوں تو ان میں نمو ہوگا، ان پر ایک خاص نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے، تفصیل کے لیے فقہ دیکھیے۔

۳ ـــــ مال تجارت چاہے کوئی سامان ہو، مٹی سے ہیرے تک ان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، اور پورا سال گزرنے کے بعد ہوگی تاکہ بھاؤ کے اتار چڑھاؤ سے ان کی مالیت کا نمو ممکن ہو سکے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

سوال ـــــ انسان کی بنیادی ضرورتیں شرعاً ۹ ہیں اگر وہ پوری ہو جائیں تو مسلمان غنی ہے ورنہ فقیر اور قابل امداد ہے۔

اول ـــــ نفقہ یعنی کھانے پینے کے لیے غلہ، دال، نمک، گوشت، ترکاری وغیرہ سال بھر مہیا کر سکے۔

دوم ـــــ سکنیٰ، اپنی حیثیت اور ضرورت کے مکان پر یا مالکانہ حقوق حاصل ہوں خواہ مکان ہو یا کوٹھی یا چھپر ہے سامانِ زندگی یا کرایہ کا مکان ہو۔

سوم ـــــ سواری، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، موٹر، سائیکل حسب حیثیت حسب ماحول مع ضروریات و توابع۔

چہارم ـــــ نوکر، چاکر یا لونڈی، اگر خوش حال گھرانہ ہو یا ڈرائیور وغیرہ جو موٹر چلا سکے۔

پنجم ـــــ آلات معاش۔ مثلاً کسان کے لیے کھیتی کے سامان، لوہار، بڑھئی، ڈاکٹر، انجینیر وغیرہ کے کاروباری سامان جن کے بغیر معاشی مسائل کا حل نہ ہو سکتا ہو۔

ششم ـــــ اپنے لیے، بچوں کے لیے پہننے، اوڑھنے، بچھانے کے وہ سامان جو ہر موسم کو جھیل سکیں۔

ہفتم ـــــ بچوں کی پڑھائی یا تربیت کے سامان اور صاحب علم ہو تو اچھی لائبریری کی ضرورت

ہشتم ـــــ اس پر کسی کا قرض نہ ہو، اتنا قرض جو اس کی بچت کی رقم کو منہا کر دے یا نصاب نہ پورا ہونے دے۔

نہم ـــــ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے باوجود اگر بچت کی رقم ہے اور وہ رقم پورے سال تجارت میں یا بینک میں یا تجوری میں یا کہیں محفوظ رہ گئی ہے، اور اس کی مقدار، نصاب زکوٰۃ کے برابر ہے تو اس کی رقم پر ۲ ½ فیصدی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ کسی مستحق کو دیدی جائے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

ٹرکٹر: کسان کے لیے آلات زراعت میں ہے وہ اگر ایک لاکھ کا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

الف: ـــــ جو قرض لیا گیا ہے اس سے حاجت اصلیہ پوری کر رہا ہے اگر اس کے پورے کاروبار پر وہ دین جاری ہے تو بچت کی رقم کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ب: ـــــ فیکٹری اور کارخانے کے لیے جو قرض لیا گیا ہے وہ قرض اگر تجارت کی لاگت سے زائد ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں، اگر بچت اس سے فاضل ہے اور نصاب کے برابر ہے تو واجب ہے۔

ج: ـــــ اگر کاروبار کی لاگت ۲ کروڑ ہے اور قرض ایک کروڑ تو حاجت اصلیہ سے فاضل مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جب دس لاکھ کی قسط ادا کر دے گا تو ایک کروڑ دس لاکھ کی زکوٰۃ دے گا پھر بیس لاکھ کی اسی طرح چلتا رہے گا۔

د: ـــــ اگر ایک کروڑ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو کوئی زکوٰۃ نہیں، وہ قرض اور اس کا سود اس کی لاگت کو کھا جائے گا، بچت کا سوال ہی نہیں ہوگا، اس سے غنی نہیں ہو سکا۔

ہ: ـــــ اگر پچاس لاکھ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو قسط اور سود سے اس کا کاروبار مکان اور جائداد کوئی محفوظ نہیں رہے گا، بہرحال خدا اس پر رحم کرے اس مالدار فقیر پر۔

کمپنی اور کارپوریشن پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو مالک نصاب ہیں، اس لیے جس کمپنی کو آپ لوگ ایک کروڑ کی لاگت سے چلا رہے ہیں، اس کے جس حصہ دار کے حصے یا جس انداز کی رقم نصاب کو پہنچ جائے گی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مشترک سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، ذاتی مال پر ہوتی ہے۔

اہم اصول

۱۔۔۔۔۔ زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے جو ذاتی ہو، پس انداز ہو یا ضروریات سے فارغ ہو، اور پورے سال کا ہر موسم جھیل چکی ہو پھر بھی موجود ہو اور آپ کے قبضے میں ہو۔

۲۔۔۔۔۔ ہیرے جواہرت اگر مال تجارت ہیں تو ملکیت پر زکوٰۃ ہے ورنہ کوئی زکوٰۃ نہیں۔

كَمَا قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

اموال تجارت

سال پورا ہوا تو آپ کی دوکان میں جو مال ہے اس کی لاگت پر زکوٰۃ ہوگی پھر جب وہ فروخت ہوگا تو پتہ چلے گا کہ لاگت کیا تھی، نفع کیا ہوا۔ آج تک فروخت نہیں ہوا آپ کی لاگت والا مال ہے اس پر زکوٰۃ ہے۔

۱۔۔۔۔۔ آپ کی لاگت جتنی ہے اس پر زکوٰۃ ہے خواہ تبرک ہو یا پھنکر جیسی حیثیت ہو یا جیسی مالیت۔ مال کی تھوک یا خوردہ قیمت کا نہیں بلکہ جتنے میں وہ مال بار برداری کے بعد آپ کو پڑا ہے اس لاگت سے مالیت نکال کر زکوٰۃ دی جائے گی۔ پھر اس مالیت کو فروختگی میں نفع کی بنیاد بناتے ہیں۔

۲۔۔۔۔۔ جو زمین کا کاروبار کرتے ہیں، سال ختم ہونے پر جتنی زمین ان کے قبضے میں ہے اس کی لاگت والی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ اس کے قبضے میں دی ہے، قوت خرید سے خریدار کو رغبت ہے بائع کو نہیں یہ معاملہ صرف بائع کی ذاتی حیثیت کا ہے جو اس وقت موجود ہے۔

حصص کی زکوٰۃ

۱ــــــ آپ نے کسی کمپنی کے جو حصے خریدے ہیں وہ آپ کی ملکیت ہیں مگر آپ کے قبضے میں نہیں ہیں، لہٰذا اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ حصہ واپس ہوگا یا اس کا بدل یا نفع ملے گا تو جتنا قبضے میں آئے گا، اتنی رقم اگر نصاب کے برابر ہے تو زکوٰۃ دیں گے ورنہ نہیں،

۲ــــــ حصص کی جو بھی قیمت آپ کو مل جائے گی، اس کے تناسب سے زکوٰۃ ہوگی اگر کم ملے گی تو کم پر زیادہ ملی تو زیادہ پر. فرق یہ ہوگا کہ حصص آپ کے اصل پونجی کے اور اس کی کمی بیشی کا نام نفع نقصان ہوگا مگر اس کا اعتبار رقم کی واپسی پر ہوگا، چنانچہ بمبئی کا اسکنڈل اور لندن کے بینک کا اسکنڈل گواہ ہے کہ حصص کا اعتبار اس وقت ہوگا جب وہ حصہ دار کے قبضے میں آجائیں، یہ اصول بہت وسیع ہے

بانڈ

جس رقم کو میں نے دیا ہے اور بینک نے یا سرکار نے مجھے مدتی بانڈ عطا کر دیا ہے یہ بانڈ نوٹ نہیں ہے، نقد نہیں ہیں، بلکہ سرکاری رسید ہیں کہ تمہارا مال ہمارے مال میں اس لیے وہ رقم جو آپ کے قبضے میں نہیں ہے، اس پر آج زکوٰۃ واجب نہیں، اس وقت واجب ہوگی جب بانڈ کیش ہو جائے گا اور ان تمام سالوں کی واجب ہوگی، جتنے سال سرکاری تحویل میں وہ رقم رہی ہے، وجہ وہی ہے کہ ملک تام نہیں، کیونکہ قبضہ نہیں ہے۔ اور چوں کہ آپ کے پاس پکی رسید ہے، اور سرکار کو انکار نہیں، اس لیے وہ ضمار بھی نہیں ہے، اس لیے پوری مدت کی زکوٰۃ ہوگی۔

محور ثانی

نصابِ زکوٰۃ

سوالات کے جوابات

شرعاً چاندی اور سونا دونوں ثمن ہیں اور آپ کے ماننے نہ ماننے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ ثمن خلقی ہی رہیں گے، اس لیے :

الف :۔۔۔۔ اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہے تو ۲۰۰ درہم سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہونچے حساب یہی ملے گا۔

ب :۔۔۔۔ اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے تو ۲۰ مثقال سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہونچے۔

ج :۔۔۔۔ اگر دونوں میں سے کسی کا نصاب مکمل نہیں ہے تو دونوں کو وزن یا قیمت کے لحاظ سے دیکھیں گے۔ اگر کوئی نصاب مکمل ہو جاتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی نہیں تو نہیں ہوگی۔

د :۔۔۔۔ رہا مال تجارت تو اگر کسی تاجر کے پاس اس کی حاجت اصلیہ سے فاضل جو مالیت ہے وہ ۲۰۰ درہم سے زائد ہے تو وہ غنی ہے اس پر شرائط کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر مال تجارت کی قیمت ۲۰۰ درہم سے کم ہے تو وہ مسلمان شرعاً فقیر ہے زکوٰۃ اس کو دیجا سکتی ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ہ :۔۔۔۔ ایسا اس لیے ہے کہ فقیروں کے لیے یہ مفید ہے کہ چاندی کا نصاب مان لیا ہے ورنہ سونے کو محور بنایا جائے گا، تو تاجروں کو تھوڑا موقع اور مل جائے گا، مگر فقیروں کا نقصان ہوگا اور یہ فرق صرف ابتدا کرنے میں ہے کہ کہاں سے شروع کیا ہے ورنہ جب شروع ہوگیا تو ہر مالک نصاب دوسرے کے برابر ہے۔

و :۔۔۔۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا مسئلہ ہر مسلمان سے متعلق ہے خواہ ہمالیہ کی ترائی

کا ہو یا امریکہ کے بازار کا ۱۹۹۲ء کا ہو یا ۲۲۹۲ء کا۔ دوسرے یہ کہ من موہن سنگھ نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس کے سونے کی وہ برتری خاک میں مل جائے گی، جو ہندوستان میں اس کو حاصل ہو گئی ہے، تیسرے یہ کہ اگر ثبوت غنا کے لیے سونا اور ثبوت فقر کے لیے چاندی کو معیار قرار دیں گے تو فقر و غنا کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا ہو جائے گی، اور یہ طے نہیں ہو سکے کہ غنا کب اور فقر کب شروع ہوا اسی لیے شریعت نے دونوں میں سے ہر ایک کو ثمن قرار دے کر ماحول کو پابند کر دیا ہے، اور فقر و غنا کے درمیان کوئی واسطہ نہ رکھ کر کام آسان کر دیا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

مہتمم یا ناظم یا منیجر عطیہ یا زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کی رقوم کو مستحقین زکوٰۃ تک پہونچا دے، مستحقین تو مصرف زکوٰۃ ہیں اور مہتمم دونوں کے درمیان واسطہ ہیں،

الف: ـــــــ مہتمم کی طرف سے کسی مستحق کو جو رقم سپرد کر دی گئی وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی، اور وہ شخص اتنی رقم کا مالک ہو گیا، اب ایسے شخص کو حق ہے کہ اپنے کھانے، کار ہائش کا، ٹیوشن کا نظم و ضبط کا، خود انتظام کرے کیونکہ مال ان کے پاس ہے، وہ انجمن بنا کر اسے چلائیں گے اور جہاں چاہیں گے کرایہ کا مکان لے کر رہیں گے، جس کو چاہیں گے مدرس رکھ کر پڑھائیں گے، پھر مہتمم صاحب کہاں جائیں گے؟ انہیں سوچ لینا چاہئے جیسے الہ آباد بورڈ کے مدرسین مالک مدرسہ ہیں اور کاٹھ کا مہتمم نام کا مہتمم ـــــــ یہ فتنے کا گھر ہے اس دروازے کو نہ کھولیے۔

ب: ـــــــ پھر جن لوگوں نے جائداد، کمرے، سامان بطور اوقاف مدرسے میں دیا ہے کہ ان کا اپ کو یا ان کے ورثاء کو ثواب ملتا رہے گا، یہ صدقہ جاریہ ہیں، اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پھر تو سارا مال تجارتی سامان ہو گا، کرایہ کا مکان، کرایہ کی زمین، کرایہ کی سواری۔

ج: ـــــــ بہت سے علماء کو عطیات کی رقم سے تنخواہ لینے میں تردد ہوتا ہے اور آپ نے زکوٰۃ سے تنخواہ لینے اور طلباء کے ہاتھوں ذلیل کرنے کا راستہ نکال کر اداروں کی دینی حیثیت کو داؤں پر لگا دیا ہے اور اسکولوں کی طرح تجارت گاہ بنا دیا ہے، خدا رحم کیجئے دینی اداروں پر۔

د۔ ـــــــ یہ صورت بہت اچھی ہے کہ طلباء کے خوراک اور وظیفے کی رقم ان کو نقد دیدیجائے اور وہ مطبخ میں جمع کر دیں، وہاں سے سارے انتظام ہوتے رہیں، اس سے تملیک بھی ہوتی رہے گی، انتظام بھی چلتا رہے گا۔

عاملین علیہا

رمضان وغیرہ میں اداروں کے جو مدرسین، ملازمین، نظماء اور اراکین چندہ وصول کرتے ہیں ان میں اکثر اداروں کے مستقل ملازم ہوتے ہیں، ان کی تنخواہ وغیرہ زکوٰۃ سے نہیں دیجا سکتیں۔

الف۔ ـــــــ ہاں پورے سال میں وہ زکوٰۃ ہی سے وصول کرلاتے ہیں تو ایسی وصولی کے تناسب سے ان کی تنخواہ کا کوئی حصہ زکوٰۃ سے لیا جا سکتا ہے۔

ب۔ ـــــــ زکوٰۃ کے مصارف بیان کرنے کا انداز انحصار کا ہے، "إنما الصدقات" اس لیے جب تک مستحق زکوٰۃ ہوں گے دی جائے گی، جتنے مستحق زکوٰۃ ہوں گے اسی مقدار سے دی جائے گی اور "عاملین علیہا" کی اصطلاح بھی مستقل ملازمین کو شامل ہونے نہیں دیتی ـــــــ متکلم کی منشا کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔

ج۔ ـــــــ کمیشن، اہل علم کا کبھی دستور نہیں رہا نہ علماء نے اجازت دی ہے، اگر اس سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، تو جو لوگ ۴۰٪ فیصدی کمیشن لیتے ہیں اور پھر مصارف سفر وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی رقم کہیں باقی رہ گئی ہے تو اس کا بھی کمیشن لے لیتے ہیں، ان کو آپ کیا کہیں گے۔ بعض لوگ فرماتے ہیں کہ ہماری جیب سے کیا گیا؟ مگر انہیں معلوم نہیں کہ جتنی رسید آپ کے سفیر نے کاٹ دی ہیں ان سب رقوم کا آپ کو یہاں سے آخرت تک حساب دینا ہے، پھر خدا سے کیا معذرت فرمائیں گے؟

د۔ ـــــــ جو ادارے کا کلرک ہے وہ بیت المال کا منشی ہے وہ رقم کی وصولی نہیں کرتا مگر اس رقم کے خرچ کا حساب لکھتا ہے، اس لیے "عاملین علیہا" کی مد میں شامل نہیں ہو سکتا (واللہ اعلم)۔

فی سبیل اللہ

قرآن، کتاب الٰہی، فرمان خداوندی اور بندوں کے نام احکام لے کر آیا ہے، قرآن نے عبادات و معاملات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تعبیرات کے لیے اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ آپ ان اصطلاحوں کا معنوی تعین آج کی لغت سے نہیں کر سکتے، اس وقت کے فہم و ادراک سے کر سکتے ہیں۔

الف:۔۔۔ "فی سبیل اللہ" قرآن کا اک اصطلاحی لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ اس سے متکلم کا منشا کیا ہے؟۔ کیوں کہ متکلم کی منشا کا نام تفسیر ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی منشا اگر معلوم ہوگی تو خود قرآن سے ہوگی، یا پیغمبر سے معلوم ہوگی حد سے حد یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی زبانی معلوم ہوگی ۔۔۔ ہاں اگر ان میں سے کسی سے نہ معلوم ہو تو تفسیر کرنا ممکن نہیں، ہم لغت، محاورہ یا اصول کے ذریعہ اس کی تاویل کر سکتے ہیں، تفسیر نہیں کر سکتے ہیں ۔۔۔ یہاں تاویل کی اس لیے گنجائش نہیں کہ تفسیر موجود ہے اور جب خود حضور سے تفسیر موجود ہے تو لغت کیوں کر اس کا معارضہ کرنا خلاف اصول اور جرأت ہے۔

ب:۔۔۔ حافظ ابن حجر نقل کرتے ہیں کہ "فی سبیل اللہ" کا استعمال عباد کے لیے ہوتا ہے یہی بات عام مفسرین کہتے ہیں اور خود حضور نے "غازی سبیل اللہ" کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ فی سبیل اللہ کا ترجمہ اور مطلب جہاد ہے ۔۔۔ نیز بخاری میں حضور کا شعر مروی ہے کہ انگلی زخمی ہوگئی تو فی سبیل اللہ فرمایا:

"ان انت الا اصبع دمیت ٭ وفی سبیل اللہ مالقیت"

ج:۔۔۔ ان ہی وجوہ سے جمہور فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا ہے اور بعض احادیث کے تقاضے سے امام محمد جیسے حضرات نے حج کو بھی فی سبیل اللہ میں صرف اس وجہ سے داخل کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک حضور سے ثابت ہے، اور ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نے حج کو عورتوں کا جہاد فرمایا ہے۔

د:۔۔۔۔۔ رہا اختلاف روپے یا اختلاف مسائل کا ختم کرنا تو یہ کوئی شرعی عذر نہیں ہے، نہ دلیل ہے نہ اس سے ان مسائل کا اختلاف ختم ہو سکتا ہے جو صدر اول سے چلے آرہے ہیں، نہ اس کے لیے لغت اور ان کے لیے توسع سے کام نکالا جا سکتا ہے کیوں کہ اس سے صرف اتنا ہوگا کہ اک پانچویں رائے اور پیدا ہو جاوے گی، کہ علامہ بھوپالی نے لغت کے سہارے زکوٰۃ کو عام کر دیا ہے کہ اک اجتہادی مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ صدر اول میں فقہاء اور علماء نے قرآن و احادیث کے پرمعانی اشارت کی روشنی میں متعین کر رہے ہیں، ان کے دور کی رائے قبول کر لی جائے ۔۔۔۔۔ ہاں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کے دلائل، اقوال اور علت واسباب کا پتہ لگا کر کوئی رائے قائم کیجائے، ورنہ پرانے مسائل کو نئے رجحان سے طے کرنا ایک خطرناک کھیل ہے اور بے سود محنت۔

ہ:۔۔۔۔۔ علامہ کا سائی کا یہ استدلال بہت اچھا ہے کہ حضرت معاذ کو معز اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہیں، اس میں بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ:

"توخذ من اغنيائهم وترد إلى فقرائهم"

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے لحاظ سے انسانوں کی دو صفیں ہیں، ایک اغنیاء کی دوسری فقراء کی، اور زکوٰۃ کا مصرف وہ فقراء ہیں جن کی فہرست قرآن نے دی ہے، البتہ چوں کہ حدیث صحیح کی وجہ سے "عاملین علیہا" کے غناء کے باوجود دیا جائے گا۔ اس لیے اس فہرست میں ان کا اضافہ غالباً اس لیے ہے کہ زکوٰۃ جب تک جمع نہ کی جائے گی، اس فہرست کے مطابق تقسیم نہیں کی جا سکتی اس لیے غناء کے باوجود اجازت دی گئی ہے ورنہ اصل ہے فقر و حاجت وغیرہ، اس وجہ سے علامہ کاسانی نے فی سبیل اللہ میں اگر وسعت بھی رکھی ہے تو فقر کی قید لگا دی ہے اور شخصی طور پر ادا کرنے کی رعایت کی ہے۔

و:۔۔۔۔۔ بہتر ہو کہ جن مسائل کو ائمہ نے نصوص کی روشنی میں جمع کر دیا ہے اور جمہور فقہاء نے اسے قبول کر لیا ہے اس پر لغت اور محاورے کی مدد سے اضافہ نہ کیا جائے ورنہ دین بازیچہ اطفال بن جائے گا۔

سوالات کے جوابات

از: مولانا محمد علاء الدین ندوی فاضل دیوبند، بیپار لطیف، ضلع کھگڑیا

مصارفِ زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کے مصارف سے متعلق آنجناب نے اظہارِ خیال کا حکم فرمایا ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ کیا میں اور کیا میری رائے اور کیا میرا مبلغِ علم۔ لیکن پھر بھی ہر کس و ناکس کو کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے کا میرے خیال میں کچھ نہ کچھ حق ضرور ہوتا ہے، اگرچہ بہت ممکن ہے کہ اس کی وہ رائے اربابِ علم و فکر کی نگاہوں میں کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہ ٹھہرے، لیکن اس سے رائے دہندہ کے حقِ رائے دہی پر غالباً کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اپنی رائے اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت و جسارت کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے اپنی بات یا رائے پر اصرار بہرحال نہیں ہے یہ رائے ہے اور صرف رائے۔

آیتِ کریمہ "انما الصدقات للفقراء" الآیۃ" میں لفظ فی سبیل اللہ، میرے خیال میں کسی مخصوص متعین اور محدود معنی پر دلالت نہیں کرتا، اگرچہ متقدمین و متاخرین مفسرین میں سے تقریباً سبھوں نے اس سے مراد مجاہدین یا مجاہدین کے لیے سامان جہاد خریدنا سمجھا اور یہی مراد بھی لیا ہے، قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں قیامت تک کے لیے ہیں اور دونوں عہدِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامت تک کے سرچشمۂ ہدایت ہیں، ہر دور، ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں پیش آمدہ ضرورتوں اور مسائل کے حل کے لیے ہمیں بنیادی طور پر ان کی جانب ہی رجوع کرنا ہوگا، پھر حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ

کے اقوال و تفقہ سے استفادہ کرنا لازمی ہوگا۔

آج کا دور پُرفتن جیسا کچھ ہے وہ کسی صاحب علم و بصیرت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، جتنے فتنے ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا کیے جارہے ہیں، عالمی و ملکی پیمانے پر مسلمانوں کو مذہب سے دور رکھنے اور انھیں اس سے برگشتہ کرنے کی جس قدر سازشیں رچی جارہی ہیں غالباً اس کی نظیر و مثال گذشتہ تاریخ میں نہ مل سکے، ان حالات میں یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی فرد واحد اپنے بل بوتے اور اسباب و وسائل کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھے اور ان کا قلع قمع کرکے رکھ دے، البتہ یہ ممکن ہے کہ ملّت اسلامیہ کے ارباب علم و فکر، دانشور اور دلِ دردمند رکھنے والے کمربستہ ہوں، میدان عمل میں اتر پڑیں اور ایسے ادارے یا اکیڈمیاں قائم کریں جہاں سے قلمی اور تبلیغی جہاد اچھے پیمانہ پر علمی و فکری انداز سے شروع کیا جائے اور ملّت کو ان مفاسد سے خبردار کرنے کے علاوہ اپنا تحفظ اور دین پر کاربند رہنے کی مؤثر طور پر تلقین کی جائے۔

لیکن اس کام کی ابتدا کرنے سے پہلے جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ سرمایہ کی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کام جس نوعیت کا ہے اور اسے جس پیمانہ پر انجام دیا جانا چاہیے اس کے لیے ضرورت کثیر سرمایہ کی ہوگی، اور وہ کہاں سے آئے گا؟ کسی فردِ واحد سے اس کی توقع نہیں کہ وہ تنہا اس بارگراں کا متحمل ہو سکے گا۔ ملت کا حال اور عالم یہ ہے کہ اس کے انتہائی محدود و مختصر افراد کی تعداد صدقات غیر واجبہ (نافلہ) کی جانب میلان رکھتی ہے۔ ہاں زکوٰۃ ادا کرتی ہے، لیکن مصارف زکوٰۃ میں اگر قدما، و متاخرین کی رائیں اختیار کی جائیں تو ایسے کاموں کے لیے اس رقم میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر آخر کون سی راہ اختیار کی جائے کہ عالمی پیمانے پر کی جانے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سدباب ہو سکے اور ملت کو درپیش فکری ارتداد اور عملی گمراہی سے بچانے کی منظم طور پر باقاعدہ کوشش کی جاسکے۔

حالات کی سنگینی، ضرورت کی اہمیت و شدت اور ملّت و وقت کی پکار کا تقاضا ہے کہ امام قفال ؒ کے اس قول پر غور کیا جائے، جسے انھوں نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام موصوف نے اس قول کی نسبت بعض فقہا، کی جانب بھی کی ہے، اگرچہ ان کے ناموں کی صراحت نہیں کی ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

" واعلم ان ظاهر اللفظ فی قوله تعالیٰ "وفی سبیل الله" لایوجب

القصر على كل الغزاة فلهذا المعنى نقل القفال فى تفسيره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات إلى جميع وجوه الخير من تكفين الموتى وبناء الحصون وعمارة المساجد لأن قوله فى سبيل الله عام فى الكل "

ان کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم وغیرہ کی تحریروں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آیت کریمہ "انما الصدقات" میں انما حصر کے لیے تو ہے لیکن یہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے، اس کے علاوہ فی سبیل اللہ بھی عام ہے، اسے محدود و منحصر کس دلیل کی بنیاد پر کیا جائے۔

بہرحال میری رائے ہے کہ آج کا دور اس بات کا متقاضی ہے کہ اس طرح کے کاموں میں زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں اور اگر کام بہتر طور پر اس رقم کے بغیر بھی چل سکتا ہو اور زکوٰۃ کی رقمیں لگانے سے بچا جاسکتا ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے بچا جائے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

سوالنامہ کا جواب

از: ـــــــــــــــــــ مولانا عبد القیوم صاحب پالنپوری

ملک تام سے متعلق سوالات کے جوابات

(۱) جس مال تجارت کی قیمت دے دی گئی ہے، لیکن مال پر ابھی مشتری نے قبضہ نہیں کیا ہے، اس میں پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ بائع پر ـــــ جو اس کا مالک ہوگیا ہے اور قبضہ بھی کرلیا ہے ـــــ واجب ہے، لانہا مملوکۃ ملکاً ویداً۔

اور وہ خریدا ہوا مال تجارت جس پر مشتری نے ابھی تک قبضہ نہیں کیا ہے صحیح قول کے مطابق مشتری پر قبضہ سے قبل اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور قبضہ کے بعد گزرے ہوئے سال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے۔

" وذکر فی المحیط ...... ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصابا، لان الملك ناقص ـــــ والصحیح أنہ یکون نصابا لانہ عوض عن مال کانت یدہ ثابتۃ علیہ وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعا اھ۔ فعلی ھذا قولھم لاتجب الزکاۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ تتجب زکاتہ فیما مضی کالدین القیوی " (۱)

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۲۵

(۲) کرایہ کی مد میں دی ہوئی پیشگی رقم کا شرعاً مالک مکان مالک ہو جاتا ہے، لہٰذا اس نے جو کرایہ کی پیشگی رقم وصول کی ہے اس کی زکوٰۃ اس مالکِ مکان پر واجب ہے۔

اس لیے کہ اس کا قبضہ بھی ہو چکا ہے اور وہ مالک مکان اس پیشگی وصول کردہ رقم کا مالک ہو گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے ظاہر ہوتا ہے:

"رجل له الف درهم لامال له غيرها استأجر بها دارًا عشر سنين لكل سنة مأة فدفع الألف ولم يسكنها حتى مضت السنون و الدار في يد الآخر مزكّى الآخر في السنة الأولىٰ عن تسع مأة وفي الثانية عن ثمان مأة إلا زكاة السنة الاولىٰ ثم يسقط لكل سنة زكاة مأة اخرىٰ مما وجب عليه بالسنين الماضية لانه ملك الألف بالتعجيل كلها فاذا لم يسلم الدار اليه سنةً انقضت الاجارة في العشر، لانه إستهلك المعقود عليه قبل التسليم فزال عن ملكه مأة وصار مصروفًا إلى الدين وكذالك .... ولا زكاة على المستأجر في السنة الأولىٰ والثانية لنقصان نصابه في الأولىٰ ولعدم تمام الحول في الثانية الخ" (۱)

ڈپوزٹ کی رقم رہن ہے اور شئی مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہوتی ہے نہ مرتہن پر، لہٰذا ڈپوزٹ کی رقم زکوٰۃ نہ موجر ــــــ مالک مکان یا دکان ــــــ پر واجب ہے اور نہ کرایہ دار پر واجب ہے:

"ولا في مرهون بعد قبضه اى لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد وإذا استرده الراهن لا يزكّى عن السنين الماضية وهو معنى قول الشارح "بعد قبضه" ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن و ظاهره ولو كان الرهن ازيد من الدين" (۲)

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۱۹ - وكذا في العالمگيرية ۱/۱۸۱-۱۸۲

(۲) شامی ۲/۹

(۳) اداروں اور مدارس وغیرہ میں جمع ہونے والی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔
صدقات واجبہ میں عدم وجوب ظاہر ہے اس لیے کہ اگر خود معطین کے پاس وہ رقم رہتی تو ان پر زکوٰۃ اس رقم کی واجب نہ ہوتی اور عطیات کی رقم معطی کی ملک سے نکل جاتی ہے اور مدرسہ اور ادارہ کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے۔

(۴) اگر وہ مال خالص حرام ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے مالک معلوم ہیں تب تو واجب الرد ہے اور اگر معلوم نہیں تو کل واجب التصدق ہے۔

"وفی رد المحتار: فی القنیة لو کان الخبیث نصابًا لایلزمه الزکاة لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه اھ ومثله فی البزازیه" (۱)

لان المغصوب ان علمت اصحابه او ورثتهم وجب رده علیهم والا وجب التصدق به" (۲)

اگر یہ حرام مال حلال مال میں مخلوط ہو (خواہ باہم تمیز مشکل ہو یا نہ ہو) تو دیکھا جائے گا کہ اگر مال حرام کی مقدار اس میں سے نکالی جاوے تو بقدر نصاب بچتا ہے یا نہیں، اگر بچتا ہے تو اس مقدار باقی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر نہیں بچتا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

" قالوا لو ان سلطانًا غصب مالًا وخلطه صار ملکًا له حتی وجبت علیه الزکاة وورث عنه علی قول ابی حنیفة رح لان خلط دراهمه بدراهم غیره عند استهلاک .... اھ- هکذا ذکروا وهو مشکل لانه وان کان ملکه عند ابی حنیفة بالخلط فهو مشغول بالدین والشرط الفراغ عنه فینبغی ان لاتجب الزکاة فیه علی قوله ایضًا ولذا شرط فی المبتغی بالمعجمه ان یبرأه اصحاب الاموال لانه قبل الابراء مشغول بالدین وهو قید حسن یجب حفظه" (۳)

---

(۱) ۲/۳۴ (۲) شامی ۲/۳۴ (۳) البحر الرائق ۲/۲۲۱، امداد الفتاویٰ حاشیہ

(۵) امام صاحب رح کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں۔ قوی ۔ متوسط ۔ ضعیف ۔
دین قوی وہ دین ہے جو کسی مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو
دین قوی میں زکوٰۃ دائن ہی کے ذمہ ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی، مگر ادائے گی لازم اس وقت
ہوگی جب کہ بقدر چالیس درہم کے وصول ہو جائے ۔

" وفی الدر المختار: نتجب زکاتها اذا تم نصاباً وحال الحول لکن لا فوراً
بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض وبدل مال
تجارة الخ " (۱)

مدیون پر کسی حال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ اس مال کو تجارت میں لگا کر فائدہ اٹھا رہا ہو۔

" وسببه ملك نصاب حولی تام فارغ عن دین له مطالب من
جهة العباد " (۲)

جس دین قوی کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو، قبل وصول دائن پر اس کی زکوٰۃ
واجب نہ ہوگی اور وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کے بعد (اگر دوسرا مال زکوٰۃ موجود نہیں ہے) اس پر
زکوٰۃ واجب ہوگی، اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

" ولو كان الدين على مقر ملئ او على معسر او مفلس ای محکوم بافلاسه
او على جاحد عليه بنية وعن محمد لا زكاة وهو الصحيح (الدر المختار)
وفی رد المحتار: والحاصل فيه اختلاف التصحيح - (۳)- وفيه ايضاً
وقدمنا اول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتی إلی هذا وقال
بل فی زماننا يقر المديون بالدين وبملاءته لا يقدر الدائن على تخليصه
منه فهو بمنزلة العدم " (۴)

دین متوسط جو مال تجارت اور سونے چاندی کے علاوہ مال کا معاوضہ ہو، اور دین ضعیف جو مال کا

---

(۱) الدر المختار علی الشامی ۲/۳۷۔۳۸ (۲) شامی ۲/۵-۶
(۳) رد المحتار ۲/۱۲ (۴) رد المحتار ۲/۸۵

معاوضہ نہ ہو، جیسے دین مہریا بالکل معاوضہ نہ ہو جیسے حصۂ میراث و وصیت، دین متوسط کا حکم امام صاحب رح سے اصح الروایتین کے مطابق اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔

" وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده اى بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر الخ "(۱) قال فى البدائع ان رواية ابن سماعة انه لازكاة فيه (اى فى الدين المتوسط) حتى يقبض المأتين ويحول الحول من وقت القبض هى الاصح من الروايتين عن ابى حنيفة اهـ ومثله فى غاية البيان وعليه نحكمه حكم الدين الضعيف الخ "(۲)

(۲) پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر قبل وصول زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور وصولیابی کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔(۳)

حاجت اصلیہ کے تعین کے متعلق سوال واضح نہیں ہے۔

چوتھی شرط کے متعلق سوال کا جواب

(۱) حکومت سے حاصل کردہ قرضِ طویل الاجل کی صورت میں وجوب زکوٰۃ کے لیے پورے قرض کو اموالِ زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا، صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع نہیں کی جاوے گی۔

" وفى الزيلعى ايضا لايتحقق الغنى بالمال المستقرض مالم يقبض "(۴)

---

(۱) الدرالمختار (۲) رد المحتار مع الدرالمختار ۴۹/۲

(۳) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دین متوسط اور قوی میں داخل نہیں، اس لیے کہ یہ مال ہی کا بدل نہیں ہے، کیوں کہ اجرت حُر کا جز ہے اور خدمتِ حر مال نہیں، لہٰذا دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کی طرح اس میں بھی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بلکہ وصول ہونے کے بعد سال گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر اس کے پاس زکوٰۃ کا نصاب پہلے سے موجود نہیں ہے۔

(۴) رد المحتار ۱۰/۲، مطبوعہ استنبول

ومنہا ان لایکون علیہ دین مطالب بہ من جہۃ العباد عندنا فان کان فانہ یمنع وجوب الزکاۃ بقدرہ حالا کان او مؤجلا۔ (۱)

حکومت سے لیے ہوئے قرضوں کے بارے میں عبارت زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ (ای المؤجل) غیر مانع[1] سے دھوکہ نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ قرض میں شرعاً تاجیل صحیح نہیں ہے لہٰذا شرعاً وہ مؤجل نہیں ہیں۔ کما فی رد المحتار: (۲)

قال فی الہدایہ فان تأجیلہ لایصح .... ویؤیدہ مافی النہر عن القنیۃ التاجیل فی القرض باطل۔

کمپنی پر زکوٰۃ

تجارت مشترکہ اور کمپنی وغیرہ میں احناف رح کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے ہر حصہ دار کے اپنے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

"لاتجب الزکاۃ عندنا فی نصاب مشترک من سائمۃ ومال تجارۃ" (۳)

المراد ان یکون بلوغہ النصاب بسبب الاشتراک وضم احد المالین الی الآخر بحیث لا یبلغ مال کل منہما بانفرادہ نصاباً[4] فان بلغ نصیب احدہما نصاباً زکاہ دون الآخر۔ (۵)

جواہرات کی زکوٰۃ

جو لوگ ہیرے جواہرات کی تجارت کرتے ہیں ان پر ان جواہرات وغیرہ کی زکوٰۃ یقیناً واجب ہے لیکن جو لوگ سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے ہیرے، جواہرات خریدتے ہیں اور خریدتے وقت تجارت کی نیت نہیں ہوتی ہے ان پر ان جواہرات کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اسی طرح جو عورتیں تزئین وآرائش کے لیے

---

(۱) شامی ۲/۷ (۲) رد المحتار ۲/۲۳۵ (۳) الدر المختار

(۴) رد المحتار (۵) شامی مع الدر ۲/۴۷

استعمال کرتی ہیں ان پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

" اما الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکاۃ فیھا وان کانت حُلیا الا ان تکون تجارۃ کذا فی الجوھرہ " (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تاجر اگر تھوک سے فروخت کرتا ہے تو سامان تجارت کو زکوٰۃ کی ادائے گی کے دن جس تھوک بھاؤ سے بیچا جا رہا ہے اس بھاؤ سے قیمت لگائے اور اگر تاجر پھٹکر سے فروخت کرتا ہے تو پھٹکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار کرے۔ الحاصل عموماً خریدار جس قیمت سے لیتا ہے وہ معتبر ہے۔

جو لوگ زمینوں کی تجارت کرتے ہیں وہ اراضی عشری یا خراجی ہیں تو ان میں عشر یا خراج واجب ہے ان میں تجارت کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

" لما فی البدائع : قال اصحابنا فیمن اشتریٰ ارض عشر للتجارۃ او اشتریٰ ارض خراج للتجارۃ ان فیھا العشر او الخراج ولا تجب الزکاۃ التجارۃ مع احدھما ھو الروایۃ المشھورۃ عنھم " (۲)

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنیوں کے شیئرز کی خرید اگر تجارت کی نیت سے ہی ہوئی ہے تو کمپنیوں کے یہ خاص حصص اموال تجارت ہونے کی وجہ سے ان کی پوری مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وجوب زکوٰۃ کے دن مارکیٹ کا جو بھاؤ ہوگا اس کا اعتبار ہوگا۔

" واللازم فی ...... وفی عرض تجارۃ قیمتہ نصاب من ذھب او ورق " (۳)

وجاز دفع القیمۃ وانھا تعتبر یوم الوجوب وقال یوم الاداء کما فی السوائم " (۴)

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۸۰ (۲) البدائع ۲/۵۷ - رد المحتار ۲/۱۹

(۳) تنویر الابصار - شامی ۲/۳۱ (۴) رد المحتار ۲/۳۲

اور اگر شیئرز کی خرید تجارت کی نیت سے نہیں کی ہے تو وجوب زکوٰۃ کے دن کمپنی کے پاس ان شیئرز کا جو حصہ تجارت میں لگا ہوا ہے اس حصہ اور نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ نفع اس کو پورا مل گیا ہو، خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ تجارت میں شامل ہو گیا ہو، اور جو حصہ عمارات و آلات میں لگا ہوا ہے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

" ولا فی ثیاب البدن .... ونحوها "[1] فی رد المحتار: وکالحوانیت والعقارات[2]۔

وفی الدر: وکذلك آلات المحترفین۔[3]

قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس میں لگایا ہے ان بونڈس کے کیش کرانے کے وقت (یعنی اس رقم کے وصول ہونے کے بعد) اس سرمایہ میں سابقہ تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

" تجب زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول ...... عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض "[4]

محور ثانی نصاب زکوٰۃ

کسی شخص کے پاس صرف سونا ہے تو وجوب زکوٰۃ کے لیے سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا مثلاً کسی کے پاس ۲ تولہ سونا ہے اور مال تجارت، چاندی، نقد روپے میں سے کوئی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر یا اس سے چند گنا زیادہ ہو جاتی ہو۔

" واجمعوا انه لا تعتبر القیمة فی الذهب والفضة عند الانفراد فی حق التکمیل النصاب حتی ...... وکذلك اذا کان له آنیة ذهب وزنها عشرة وقیمتها لصناعتها ما تادرهم لا تجب فیه الزکاة باعتبار القیمة۔[5]

واما اذا کان له الصنفان جمیعا فان لم یکن کل واحد منهما نصابا ....

فانه یضم احدهما الی الآخر فی حق تکمیل النصاب عندنا "[6]

---

(۱) الدر (۲) شامی ۲/۱۰ (۳) الدر ۲/۱۱ (۴) الدر علی الشامی ۲/۳۶-۳۸

(۵) البدائع ۲/۱۹ (۶) ایضا ۲/۱۹

واما اموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدراهم فلا شئ فيها مالم تبلغ قيمتها مأتى درهم او عشرين مثقالا من ذهب فتجب فيها الزكاة ۔ (۱)

لوكان بالتقويم باحدهما يتم النصاب وبالآخر لا، فانه يقوم بما يتم به النصاب نظرًا للفقراء واحتياطا ۔ (۲)

اذا كان مع عروض التجارة ذهب وفضة فانه يضمها الى العروض ويقومه جملة لان معنى التجارة يشمل الكل ۔ (۳)

ہاں اگر کسی کے پاس سونے کے علاوہ مال تجارت چاندی اور نقد روپے میں سے کوئی ہے تو ان کی مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی اس صورت میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا، اسی طرح صرف مال تجارت یا صرف روپے یا دونوں ہیں اور ان کی مالیت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ اور غنا، کے مستحق ہونے کے لیے اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے اور مال تجارت، روپے، چاندی اور ضرورت سے زاید کوئی چیز بھی نہیں ہے تو سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا، مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور اس کے پاس دوسری کوئی چیز ضرورت سے زاید مال تجارت چاندی اور روپے وغیرہ میں سے نہیں تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے حرام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نصاب سے کم کا مالک ہے۔

لیکن اگر سونے کے علاوہ ان مذکورہ اشیاء میں سے کسی چیز کا مالک ہے تو اب چاندی کے نصاب کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اگر چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر پہونچ جاتی ہے ان کی قیمت تو وہ غنی ہے اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حرمت زکوٰۃ کے لیے اگر اس کے پاس صرف سونا ہے تو سونے کا کے نصاب کا اعتبار ہوگا اور اگر سونا نہیں ہے یا ہے لیکن دیگر مذکورہ اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا بھی وہ شخص مالک ہے تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

---

(۱) بدائع ۲/۲۰ (۲) البدائع ۲/۲۱ (۳) بدائع ۲/۲۰

" ولا إلى غني يملك قدر نصاب فارغ عن الحاجة الاصلية من أي مال كان الخ ۔ (۱)

وبهذا ظهر ان المعتبر نصاب النقد من اي مال كان بلغ نصاباً من جنسه اولم يبلغ اھ ۔ (۲)

روى عن محمد روايتان فى النصاب المحرم للزكاة هل المعتبر فيه القيمة اوالوزن ففي المحيط عنه الاول وفى الظهيرية عنه الثاني .... والظاهر اعتبار الوزن فى الموزون الخ ۔" (۳)

مصارف زکوٰۃ

(۱) صورت مسئولہ میں بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ہر طالب علم سے شروع مہینہ میں معاملہ طے کردیا جائے اور ختم ماہ پر اس کو ۲۵۰ روپے کا مالک بنا دیا جائے پھر مدرسہ میں وہ روپے جمع کرادے یا اس سے وصول کرلیے جاویں۔
مہتمم مدرسہ معطیین زکوٰۃ کا وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ طلبہ کا وکیل نہیں ہے۔

(۲) مدرسہ کے سفراء اور چندہ حاصل کرنے والے العاملین علیہا(۴) میں داخل نہیں ہیں، نیز انھیں شرح فی صد متعین کمیشن پر سفیر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اجرت مجہول ہے۔
اسی طرح حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

مصرف فی سبیل اللہ

فقہاء مجتہدین رح کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں مذکور مصارف ہی میں زکوٰۃ صرف کی جائے گی، ان کے علاوہ دوسری جگہوں میں صرف نہیں کی جاوے گی۔ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کر کے

---

(۱) الدرالمختار مع الشامی ۲/۸۸ (۲) ردالمحتار ۲/۸۹ (۳) ایضاً (۴) وأما العاملون عليها فهم الذين نصبهم الامام لجباية الصدقات (بدائع ۲/۴۴)

کرکے دوسری اشیاء کو علت کے اشتراک کی وجہ سے مصارفِ زکوٰۃ میں داخل نہیں کیا جائے گا، اور ان میں توسیع اور تعمیم کرنا صحیح نہیں ہے۔

"واتفقوا علی انہ لایجوز ان تخرج الزکاۃ الی بناء المسجد ....
وان کان من القرب لتعین الزکاۃ بما بینت لہ" (۱)

ولایجوز صرف الزکاۃ إلی غیر من ذکر اللّٰہ تعالیٰ من بناء المسجد
.... واشباہ ذلک من القرب التی لم یذکرھا اللّٰہ تعالیٰ" (۲)

اور الخرشی میں ہے: (۳)

"ولایجوز صرف شئ من الصدقات فی غیر الوجوہ المبینۃ الخ۔
وفی البدائع وعلیٰ ھذا یخرج صرف الزکاۃ إلی وجوہ البر من بناء المسجد
والرباطات .... انہ لایجوز" (۴)

اور جمہور فقہاء ومفسرین کے نزدیک مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف غازی ہیں جو جہاد عسکری میں مشغول ہیں۔

"واما فی سبیل اللّٰہ فقال مالک رح: فی سبیل اللّٰہ مواضع الجہاد
والرباط وبہ قال ابوحنیفۃ رح وقال غیرہ الحجاج والعمار وقال الشافعی
ھو الغازی جاری الصدقۃ۔ (۵)

وفی الدرالمختار: وفی سبیل اللّٰہ وھو منقطع الغزاۃ وقیل الحاج۔ وفی
رد المحتار: ھذا قول محمد رح والاول قول ابی یوسف رح ...... وفی غایۃ
البیان انہ الاظہر وفی الاسبیجابی انہ الصحیح" (۶)

اور فقہاء احناف کے نزدیک عاملین زکوٰۃ اور مولفۃ قلوب کے علاوہ زکوٰۃ کے تمام مصارف میں استحقاق زکوٰۃ کے لیے فقر واحتیاج کی شرط ہے۔

---

(۱) الافصاح ۱/۲۳۱ (۲) المغنی لابن قدامہ ۲/۵۲۷ (۳) الخرشی ۲/۲۱۹
(۴) ۲/۳۹۔ یہ حوالے منقول ہیں الفرقان لکھنؤ، اگست ۱۹۸۸ء سے۔ (۵) بدایۃ المجتہد ۱/۲۷۷
(۶) رد المحتار ۲/۸۳

ادارۃ القرآن کراچی کی چند اہم اور مفید مطبوعات

کیا آپ موت کیلئے تیار ہیں	اللہ کا خطاب (اہل ایمان سے)
بنیادی فقہی احکام	اشرف المکتوبات
اجتماعی ختم قرآن کی شرعی حیثیت	احکام وآداب طہارت، وضو، نماز
جدید تجارتی شکلیں	حج عمرہ اور انکے جدید مسائل
سوال و جواب (آپ کے مسائل اور انکے حل کیلئے ہے)	شیئرز اور کمپنی طریقہ کار واحکام
ضرورت وحاجت کا احکام شرعیہ میں اعتبار	لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا اختیار
وقف املاک کے شرعی احکام	ذکر سید الکونین ﷺ
اہم فقہی فیصلے	طبی اخلاقیات
تعلیم سیرت	مسند ابوداؤد طیالسی ۲ جلد
بائبل قرآن سائنس	فضائل اعمال اعلیٰ
طشت جواہر	نکاح مشروط
جواہر حکیم الامت	نبیوں کی سچی کہانیاں
جدید فقہی مباحث ۱۷ جلد	JESUS .... (پیغمبر اسلام حضرت عیسیٰ) The Authority of Sunnah (حجیت حدیث) ISLAM AN INTRODUCTION (تعارف اسلام)
جو تم مسکراؤ تو سب مسکرائیں	The Life and Message.. (خطبات مدراس) SHAMAA-IL TIRMIDHI (شمائل ترمذی) BIBLE QURAN & SCIENCE (بائبل قرآن اور سائنس)
دل کی دنیا	"Life Example of P.U.H" (اسوۂ رسول اکرم ﷺ) "The Islamic way in the Death" (احکام میت) COMPENDIUM OF ISLAMIC LAW (مجموعہ قوانین اسلامی)

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

مجموعہ

قوانین اسلامی

(مسلم پرسنل لا سے متعلق احکام شریعت کا دفعہ وار مرتب مجموعہ)

ناشر
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ

ادارۃ القرآن کراچی کی چند اہم مفید عربی، اردو مطبوعات

المصنف للحافظ عبد الرزاق الصنعانی ۱۲ جلد مع فہارس ۔ قیمت =/۳۹۸۰	**إعلاء السنن** ظفر احمد العثمانی التھانوی ۲۲ اجزاء ۱۸ مجلد مع فہارس ۔ قیمت =/۳۸۰۰	**شرح الطیبی** علیٰ مشکوٰۃ المصابیح ۱۲ جلد مع فہارس ۔ قیمت =/۳۸۸۰
احکام القرآن مولانا ظفر احمد العثمانی التھانوی وغیرہ ۵ جلد مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا ادریس کاندھلوی قیمت =/۱۱۸۰	**مجموعۃ رسائل الکشمیری** محمد انور شاہ الکشمیری ۳ جلد ۔ قیمت =/۱۰۸۰	**الفتاوی التاتارخانیۃ** ۵ جلد ۔ قیمت =/۱۲۸۰
جدید فقہی مباحث مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ۵ جلد ۔ قیمت =/۸۱۰	**الکوکب الدری** علی جامع الترمذی ۴ جلد ۔ قیمت =/۱۱۸۰	**مسند ابو داؤد طیالسی** مترجم تالیف ابو داؤد سلیمان بن داؤد ابن الجارود طیالسی ۲ جلد ۔ قیمت =/۳۲۳
اسوۂ رسول اکرم ﷺ ڈاکٹر عبد الحی ۔ اردو =/۱۵۰ ۔ انگریزی =/۱۲۰	**درود شریف کے فضائل و آداب** قیمت =/۹۰	**دورِ نبوی کا نظامِ حکومت** حضرت سید رضی الدین ۔ قیمت =/۱۵۰
تحفۂ سفر چھوٹا سائز قیمت =/۲۰ قیمت بڑا سائز =/۵۳	**نبیوں کی سچی کہانیاں** حضرت سید رضی الدین ۔ قیمت =/۱۲۰	**معلم الحجاج جدید** مولانا سعید احمد جدید ایڈیشن ۲ رنگ قیمت =/۱۵۰
درسِ ترمذی مولانا محمد تقی عثمانی کی تقریر جامع ترمذی ۳ جلد ۔ قیمت =/۵۸۸	**تحفہ افواجِ اسلام** کرنل قاری فیوض الرحمن ۲ جلد قیمت =/۳۸۸	**اسلامی عدالت** مولانا مجاہد الاسلام قاسمی قیمت =/۱۵۰

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ

ادارۃ القرآن کراچی کی چند جدید اردو کتب

شیئرز اور کمپنی

تعارف، طریقۂ کار اور شرعی احکام

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

وقف املاک کے شرعی احکام

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

جدید تجارتی شکلیں

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

ضرورت و حاجت

کا احکام شرعیہ میں اعتبار

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا اختیار

ولایتِ نکاح کا تعارف، اسکی حدود اور شرعی احکام

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حج و عمرہ

کے جدید مسائل اور انکا حل

ترتیب

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

اشرف المکتوبات

بنام حضرت تھانویؒ

و دیگر اکابرین مع جوابات

از ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ

آپ کے مسائل اور انکے حل کیلئے

سوال و جواب

مولانا قاری عبدالباسط

مقیم جدہ۔ سعودی عرب

طشت جواہر

(علوم و معارف کا خزینہ)

جناب نثار احمد خان فتحی

جدید فقہی مباحث

ا تا ۷ اکمل سیٹ

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

جدید اسلامی معیشت و تجارت و دیگر اہم موضوعات پر انتہائی قیمتی مباحث

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک

تحریر

☆ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
☆ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ
☆ مولانا عبدالدائم جلالی مرحوم
☆ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم
☆ مولانا امین احسن اصلاحی
☆ مولانا عتیق احمد قاسمی

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ فقہ اکیڈمی کے فقہ فیصلے

ناشران قرآن مجید و اسلامی، عربی، اردو، انگریزی کتب مرکز مطبوعات پاکستان، بیروت و بلاد عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اعلیٰ معیار کی عربی، اردو، انگریزی، فارسی کمپیوٹر کمپوزنگ ☆ پیشگی ادائیگی کی صورت میں بذریعہ پارسل پاکستان میں دستیاب کتب کی اندرون و بیرون ملک ترسیل کا انتظام ہے۔

ادارۃ القرآن کراچی کی چند اہم اور مفید مطبوعات

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل	دور نبوی کا نظام حکومت
احکام میت	درود شریف کے فضائل
اسلامی عدالت	رہنمائے سعادت
اسوۂ رسول اکرم ﷺ	متاع نور (سوانح مولانا نور احمدؒ)
تلخیص حجۃ اللہ البالغہ	معلم الحجاج طبع اعلیٰ
تحفہ افواج اسلام دو جلد	پردہ شرعی
مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا	تحفہ سفر
صحبت کے اثرات	طریقہ حج وعمرہ
قسطوں پر خرید وفروخت	حکایات صحابہؓ
برطانوی قوانین فروغ جرائم کے ذمہ دار ہیں	زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک
مجموعہ قوانین اسلامی	زکوٰۃ کے جدید مسائل ۲ جلد
عشر وخراج کے جدید مسائل ۲ ج	چالیس بڑے مسلمان
☆ مطبوعات پاکستان عربی، اردو، انگریزی کتب کی وسیع پیمانے پر ایکسپورٹ۔ ☆ بذریعہ رجسٹرڈ پارسل اندرون ملک وبیرون ملک ترسیل ☆ ہر قسم کی اسلامی کتب کی طباعت کا انتظام۔ ☆ تفصیلی فہرست کتب مفت حاصل کریں۔	ناشران قرآن مجید واسلامی، عربی، اُردو، انگریزی کتب مرکز مطبوعات پاکستان، بیروت وبلاد عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی قانون، تاریخ اسلام، اصلاحی، تصوف، لغت، ادب عربی، اعلی معیار کی عربی، اردو، انگریزی، فارسی کمپیوٹر کمپوزنگ

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث کی مستند کتابوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل وخصائل کو جمع کرکے انسانی زندگی کے ہر پہلو، ہر شعبہ اور ہر حال کے متعلق ہدایات پیش کی گئی ہیں جن سے اتباعِ سنت اور اتباعِ رسول کا صحیح مفہوم متعین ہوجاتا ہے

مؤلف

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہٗ

خلیفۂ مجاز

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ

مقدمہ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تاثرات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ

دیباچہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

ناشر

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ

ادارة القرآن کراچی کی چند جدید و مفید عربی مطبوعات

فقہ المشکلات (عربی)	جامع احادیث الاحکام (متن اعلاء السنن ۴ جلد)
الفقہ الحنفی وادلتہ ۳ جلد	اعلاء السنن ۱۸ جلد مع فہارس
شرح الزیادات للامام محمد ۶ ج	الاشباہ والنظائر ابن ملقن ۲ جلد
جمع الفوائد من جامع الاصول ۴ ج	الاشباہ والنظائر ابن نجیم ۳ جلد
مجموعہ رسائل لکھنوی، ۶ جلد	شرح طیبی ۱۲ جلد
انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد ۲ ج	مصنف عبدالرزاق ۱۲ جلد
اعلام الاعلام بمفہوم الدین والاسلام	الفتاویٰ تاتارخانیہ ۵ جلد
کتاب الرد علی سیر الاوزاعی	ہدایہ حاشیہ عبدالحئی لکھنوی ۴ جلد
شرح مقامات الحریری للشریشی	مجموعہ رسائل کشمیری ۴ جلد
شرح شرح المنار فی اصول الفقہ	الکوکب الدری ۴ جلد
فتح الغفار معجم رد المحتار	احکام القرآن تھانوی ۵ جلد
مجموعۃ الخطب اللکنویۃ	جدید فقہی مباحث ۱ تا ۱۷ (اردو)
معجم لغۃ الفقہاء	JESUS .... (پیغمبر اسلام حضرت عیسیٰ) The Authority of Sunnah (حجیت حدیث) ISLAM AN INTRODUCTION (تعارف اسلام)
مکانۃ الامام ابوحنیفہ بین المحدثین	The Life and Message. (خطبات مدراس) SHAMAA-IL TIRMIDHI (شمائل ترمذی) BIBLE QURAN & SCIENCE (بائبل قرآن اور سائنس)
المدخل الی دراسۃ علم الکلام	"Life Example of P.U.H" (اسوۂ رسول اکرم ﷺ) "The Islamic way in the Death" (احکام میت)

ادارة القرآن والعلوم الاسلامیہ